معروف و منکر

دعوت الی الخیر کی مختصر تشریح اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر مفصل بحث

مولانا سیّد جلال الدین عمری

مباحث

فہرست مضامین





طبع جدید

قرآن مجید نے 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کو امت مسلمہ کا نصب العین اور مقصد وجود قرار دیا ہے۔ پیش نظر کتاب اسی کی شرح و تفصیل ہے۔ یہ مئی ۱۹۶۷ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اسے اپنے موضوع پر ایک مستند تحریر کی حیثیت سے دیکھا گیا اور اس کے متعدد ایڈیشن ہندوستان اور پاکستان سے نکلے۔ اس کے ترجمہ کی طرف بھی توجہ کی گئی۔ اب تک عربی، ترکی (عربی سے) انگریزی، ہندی، بنگلہ اور تمل میں اس کا ترجمہ ہوچکا ہے۔ کویت کی تنظیم **'الاتحاد الاسلامی العالمی للمنظمات الطلابیة** (IIFSO) کے ذریعے بڑے پیمانہ پر اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ کہیں کہیں یہ تربیتی نصاب میں بھی داخل ہے۔ بعض حضرات نے اس سے اپنی تحریروں میں کبھی حوالہ کے ساتھ اور کبھی بغیر حوالہ کے فائدہ اٹھایا ہے۔

وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔ اس کتاب کی تالیف جنوری ۱۹۶۶ء میں ہوئی۔ اس پر سینتالیس (۴۷) سال گزر چکے۔ اس طویل عرصہ میں اس پر نظر ثانی کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اپنی دیگر مصروفیات ہی کے دوران میں اب اللہ تعالیٰ نے اس کا موقع عنایت فرمایا۔ میں نے پوری کتاب پر نظر ڈالی ہے۔ دوایک مقامات پر کسی قدر نئے مواد کا اضافہ کیا ہے اور زبان و بیان کے پہلو سے بھی اسے بہتر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

کتاب کی تالیف کے وقت اس کے مآخذ کے قدیم نسخے ہی عموماً پیش نظر تھے،

بعد میں ان میں سے بیش تر کے جدید ایڈیشن زیادہ اہتمام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے جو ایڈیشن دستیاب ہوسکے، حوالے ان کے مطابق کر دیے گئے ہیں۔ یہ خدمت عزیزم سراج احمد فلاحی نے انجام دی ہے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے۔ برادرم ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی کا شکر گزار ہوں کہ کتاب کے نئے ایڈیشن میں ان کا تعاون حاصل رہا ہے۔ انہوں نے توجہ سے اس کی پروف ریڈنگ کی، جہاں ضرورت محسوس کی حوالے چیک کیے۔ توقع ہے، یہ کوششیں اس کی قدر و قیمت اور افادیت میں اضافہ کا باعث ہوں گی۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے اور مصنف کے لیے ذخیرۂ آخرت بنادے۔

جلال الدین

یکم دسمبر ۲۰۱۳ء



دیباچہ

امر بالمعروف و نہی عن المنکر، قرآن و حدیث کی ایک اصطلاح ہے۔ یہ کتاب بظاہر اسی اصطلاح کی تشریح و تفسیر ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس میں اسلام کا پورا نظامِ عقائد و اعمال زیرِ بحث آ گیا ہے اور اس کی ایک جامع تصویر مرتب ہوگئی ہے۔ اس سے توقع ہے کہ اس امر کی بہ خوبی وضاحت ہوگی کہ اسلام کی دعوت کیا ہے اور اس دعوت کو دنیا میں پھیلانا اور غالب و سربلند کرنا اس کے ماننے والوں کے لیے کس قدر ضروری ہے، اور پھر اس دعوت کے نتیجے میں کس قسم کی ریاست وجود میں آتی ہے اور اس کا ہر فرد کس طرح معاشرے کی برائیوں کے مٹانے اور بھلائیوں کے پھیلانے میں لگ جاتا ہے؟

اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں اور ان پر ایمان لانے والوں سے جو کام لینا چاہتا ہے اس کے لیے قرآن و حدیث میں بہت سی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔ جیسے دعوت الی اللہ، انذار و تبشیر، شہادت علی الناس، اصلاح و نصیحت، تذکیر و تبلیغ، جہاد فی سبیل اللہ، اظہارِ دین، اقامتِ دین، اعلاء کلمۃ اللہ، تواصی بالحق، تعاون علی البر وغیرہ۔ ان ہی میں ایک اصطلاح امر بالمعروف و نہی عن المنکر بھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان اصطلاحات کے درمیان کسی قدر فرق و اختلاف ہے۔ کسی میں اس کام کا کوئی خاص پہلو نمایاں کیا گیا ہے اور کسی میں دوسرا پہلو پیش ہوا ہے، کسی میں محدودیت ہے اور کسی کا مفہوم وسیع ہے،

لیکن اس کے باوجود ان میں ایک ہی حقیقت بیان ہوئی ہے اور ایک ہی مقصد ظاہر کیا گیا ہے۔ اس لیے اگر آپ 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کو سمجھ لیں تو اس کارِ عظیم کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں، جس کے لیے قرآن نے موقع و محل کی مناسبت سے یہ مختلف تعبیریں اختیار کی ہیں۔

جس شخص نے بھی قرآن و حدیث کا تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی اہمیت سے انکار نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے اسے مسلمانوں کا امتیازی وصف اور ان کی ملی توانائی کا ذریعہ قرار دیا ہے اور اس سے غفلت اور کوتاہی کو ان کی ہلاکت کا سبب بتایا ہے۔ جس کام کو شریعت نے اتنی اہمیت دی ہے اس کے بارے میں بعض اہم سوالات پیدا ہوتے ہیں، کیا وہ فرض ہے یا نہیں؟ فرض ہے تو ہر صاحبِ ایمان پر فرض ہے یا مسلمانوں کے کسی خاص طبقہ اور جماعت پر؟ اس کا معنی و مفہوم کیا ہے؟ اس کا تعلق صرف مسلمانوں سے ہے یا غیر مسلموں سے بھی ہے؟ یہ کوئی وسیع کام ہے یا اس کی نوعیت محدود ہے؟ اس کے حدود و شرائط کیا ہیں اور یہ کن صفات کا تقاضا کرتا ہے؟ یہ کتاب ان تمام سوالات کا تفصیلی جواب ہے۔

'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کا ذکر قرآن کی بہت سی آیتوں اور بہ کثرت احادیث میں ہے۔ ان میں سے بعض آیات و احادیث 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہیں۔ مثلاً ایک ہی آیت سے 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کا وجوب بھی ثابت ہوتا ہے، اس کی نوعیت بھی ظاہر ہوتی ہے، اس کی وسعت و جامعیت کا تصور بھی ملتا ہے اور اس کے حدود شرائط بھی معلوم ہوتے ہیں۔ اس طرح کی آیات و احادیث کو ہر بحث کے ذیل میں نقل کیا جاتا تو مواد کی تکرار ہوتی اور کتاب کی ضخامت بڑھ جاتی، اس لئے جس آیت یا حدیث کا جس بحث سے خاص تعلق ہے وہیں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ بقیہ مباحث میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ لیکن اگر بحث کا دار و مدار

ہی کسی ایسی آیت یا حدیث پر ہو جس کا پہلے ذکر آچکا ہے تو بجائے اس کے کہ اس کا محض حوالہ دیا جائے بعینہٖ اسے دوبارہ نقل کر دیا گیا ہے، تاکہ بحث کے وقت اس کے الفاظ سامنے رہیں۔

کتاب کے مباحث باہم اس قدر مربوط ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے بالکل الگ کرنا مشکل ہے، چناں چہ مسئلہ کے ایک پہلو سے بحث کرتے ہوئے کہیں کہیں اس کے دوسرے پہلو بھی زیر بحث آگئے ہیں، اس لئے کسی بھی بحث کو پوری طرح سمجھنے اور اس سے متعلق کل مواد کو جاننے اور پرکھنے کے لئے صرف اس بحث کو دیکھنا کافی نہیں ہے، بلکہ پوری کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

قرآن نے ایک جگہ 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کے ساتھ 'دعوت الی الخیر' کا بھی ذکر کیا ہے۔ کتاب میں پہلے اسی کی مختصر سی تشریح ہے۔ اس تشریح سے 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

اس کتاب میں دین کے کسی پہلو پر عقلی رنگ میں بحث نہیں کی گئی ہے، بلکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی دی ہوئی ہدایات کو ان ہی کے الفاظ میں پیش کر دیا گیا ہے۔ کیوں کہ اس کے مخاطب اصلاً وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں اور جن کے نزدیک کسی چیز کے قابلِ قبول اور واجب الاتباع ہونے کے لئے اتنی بات کافی ہے کہ وہ اللہ کی کتاب یا اس کے رسول ﷺ کی سنت میں موجود ہے۔

کتاب وسنت کی تعبیر میں ان کے ماننے والوں کے درمیان اختلاف ہوسکتا ہے۔ یہ اپنے حدود میں جائز ہی نہیں، بلکہ پسندیدہ بھی ہے، لیکن بعض اوقات یہی اختلاف ایک انسان کے اندازِ فکر کو دوسرے انسان کے اندازِ فکر سے قطعاً جدا کر دیتا ہے اور کتاب وسنت پر ایمان کے دعویٰ کے باوجود، دونوں ایک دوسرے سے بالکل مخالف سمت میں سوچنے لگتے ہیں۔ جہاں اس طرح کی دو متضاد تعبیریں ہمارے سامنے ہوں،

ہم کسی ایسی تعبیر کو قبول نہیں کر سکتے جو قرآن و حدیث کے الفاظ اور ان کے مفہوم سے دور ہو اور جسے علوم قرآن و حدیث کے ماہرین اور محققین نے رد کر دیا ہو۔ کیوں کہ قرآن و حدیث کی وہی تعبیر صحیح ہو سکتی ہے جو ان کے الفاظ سے براہِ راست نکلتی ہو، یا جسے کم از کم ان کے اسلوب اور اندازِ بیان سے استنباط کیا گیا ہو اور جس کی تائید قابل اعتماد اور اونچی سطح کے اصحابِ علم کر رہے ہوں۔

میں نے اس کتاب میں یہی دوسرا طریقہ اختیار کیا ہے، جس کی وجہ سے کتاب، اللہ کا شکر ہے، اپنے موضوع پر ایک مستند چیز بن گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس میں ایک نہیں متعدد خامیوں کا امکان ہے۔ مجھے بڑی خوشی ہوگی اگر میں ان خامیوں سے آگاہ ہو سکوں۔ اللہ نے چاہا تو مجھے ان کے اعتراف اور ان کی اصلاح میں کبھی تامل نہ ہوگا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس حقیر کاوش کو قبول فرمائے اور اس سے اس کے بندوں کو بیش از بیش فائدہ پہنچے۔

جلال الدین
۲۴ر فروری ۱۹۶۶ء

دعوَت إلَى الخـــير

دعوت الیٰ الخیر

دعوت الیٰ الخیر کا حکم

سورہ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو حکم دیا ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ O (آل عمران:۱۰۴)

تم میں ایک جماعت ضروری ایسی ہونی چاہیے جو خیر کی طرف بلائے، معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے۔ ایسے ہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

پس منظر

اس آیت سے پہلے یہود کا تذکرہ ہے کہ وہ خود بھی خدا کے دین کو چھوڑ چکے ہیں اور دوسروں کو بھی اس سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ ہدایت سے محروم ہوگئے اور خدا کی محبت کے مستحق نہیں رہے۔ اس کے بعد مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ''پوری طرح خدا کا تقویٰ اختیار کریں، زندگی کے آخری لمحات تک اسلام پر قائم رہیں، باطل کے مقابلے کے لئے متحد و متفق ہوجائیں، سب مل کر خدا کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لیں اور گروہ بندی اور افتراق سے بچیں۔'' ان صفات کا تعلق ان کی داخلی زندگی سے تھا۔ اس کے بعد انھیں خارج کا پروگرام دیا گیا کہ وہ دنیا کو خیر کی طرف بلائیں،

معروف کا حکم دیں اور منکر سے منع کریں۔ یہی بات مفسرین نے کہی ہے۔ ہم یہاں دو مفسرین کے الفاظ نقل کرتے ہیں۔

امام رازی فرماتے ہیں:

إعلم أنه تعالیٰ في الآيات المتقدمة عاب أهل الكتاب على شيئين، أحدهما: أنه عابهم على الكفر ... ثم بعد ذٰلک عابهم على سعيهم في إلقاء الغير في الكفر ... فلما انتقل منه إلى مخاطبة المؤمنين أمرهم أولاً بالتقویٰ والإيمان... ثم أمرهم بالسعي في إلقاء الغير في الإيمان والطاعة[1]

اللہ تعالیٰ نے سابقہ آیات میں اہل کتاب کی دو باتوں پر مذمت کی ہے۔ ان میں سے ایک یہ کہ اس نے ان کے کفر کی مذمت کی ...اس کے بعد اس بات پر ان کی مذمت کی کہ وہ دوسروں کو کفر میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، پھر جب مسلمانوں سے خطاب کیا تو پہلے انھیں تقویٰ اور ایمان کا حکم دیا... اس کے بعد انھیں ہدایت کی کہ وہ دوسروں کو ایمان و اطاعت کے دائرے میں لانے کی کوشش کریں۔

علامہ سیّد محمود آلوسی فرماتے ہیں:

أمرهم سبحانه بتكميل الغير إثر أمرهم بتكميل النفس ليكونوا هادين مهديين على ضد أعدائهم. فإن ماقصّ اللّٰه تعالیٰ من حالهم في ما سبق يدل على أنهم ضالون مضلون[2]

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنی ذات کی تکمیل کا حکم دینے کے بعد (اس آیت میں) دوسروں کی تکمیل کا حکم دیا ہے۔ تاکہ وہ اپنے دشمنوں (یہود) کے برعکس ہدایت یافتہ ہونے کے ساتھ دوسروں کی ہدایت کرنے والے بھی ہوجائیں۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے سابقہ آیات میں ان کا جو حال بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی گم راہ ہیں اور دوسروں کو بھی گم راہ کررہے ہیں۔

---

[1] مفاتیح الغیب (التفسیر الکبیر) المجلد الرابع، الجزء ۸، ص/ ۱۴۵

[2] روح المعانی، المجلد الثانی، الجزء ۴، ص/ ۲۳۷

اللہ تعالیٰ امت مسلمہ سے جو کام لینا چاہتا ہے اس کے لیے اس آیت میں دو اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں:

(۱) دعوت الی الخیر ـــــ اور

(۲) امر بالمعروف و نہی المنکر

معنیٰ و مفہوم

پہلے 'دعوت الیٰ الخیر' کو لیجیے۔ خیر سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ دین ہے جو محمد ﷺ کے ذریعہ امت مسلمہ کو ملا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو نظامِ زندگی عطا کیا ہے، جو عقائد و نظریات دیے ہیں، جو قوانینِ سیاست بتائے ہیں، جو ضابطۂ اخلاق دیا ہے اور جن اصولِ عبادت کی تعلیم دی ہے، وہی 'خیر' ہے، اور دنیا کو اس 'خیر' کی طرف بلانا امت مسلمہ کی ذمہ داری ہے۔ اس امت کے لیے خیر و شر کا پیمانہ اللہ کا دین ہے۔ جو کچھ اللہ کے دین میں ہے وہ خیر ہے اور جو اللہ کے دین سے خارج ہے وہ 'شر' ہے۔ اللہ کے دین کے سوا نہ تو کسی تصورِ حیات سے اسے دلچسپی ہوسکتی ہے اور نہ وہ دنیا کو اس کی دعوت دے سکتی ہے۔ دنیا کے جتنے فلسفے، جتنے نظامِ حیات اور جتنے قوانینِ زندگی ہیں، وہ سب کے سب اس کی نگاہ میں شر کی مختلف شکلیں ہیں۔ ان میں خیر کے پہلو ہیں بھی تو شر ان پر غالب ہے۔ وہ ان کو مٹانے اور ان کی جگہ اللہ کے دین کو قائم کرنے کے لیے وجود میں آئی ہے۔

'دعوت الی الخیر' کا مطلب دین کے کسی جزو کی طرف دعوت دینا نہیں ہے، بلکہ کل دین کی طرف دعوت دینا ہے۔ امت مسلمہ جب تک پورے دین کی دعوت لے کر نہ اٹھے وہ 'دعوت الی الخیر' کے فرض سے سبک دوش نہیں ہوسکتی۔ اگر وہ صرف اصلاحِ اخلاق کی مہم چلاتی ہے، یا اس کے سامنے محض سیاسی انقلاب ہے، یا وہ عبادات کی تلقین

تک اپنی مساعی کو محدود رکھتی ہے، یا اس کا مطلوب صرف معاملاتی زندگی کو درست کرنا ہے تو اس سے دعوتِ خیر کا حق کبھی ادا نہ ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں سے ہر کام دین کا کام ہے اور اس میں خیر کا جز و یقیناً موجود ہے، لیکن امت مسلمہ 'جزئی خیر' کی دعوت پر مامور نہیں ہے، بلکہ اسے 'خیر کل' کی دعوت کا حکم دیا گیا ہے جیسا کہ قرآن مجید کے متعدد ارشادات سے واضح ہوتا ہے۔ مثلاً سورۂ انبیاء کی حسب ذیل آیت کو دیکھیے، قرآن نے حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے ذکر کے بعد کہا ہے:

وَ جَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْهِمْ فِعْلَ الْخَیْرٰتِ وَ اِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِیْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَاعٰبِدِیْنَ ○ (الانبیاء: ۷۳)

ہم نے ان کو امام بنایا۔ وہ ہمارے حکم کے مطابق لوگوں کی ہدایت کرتے تھے اور ہم نے ان کو وحی کی 'خیرات' (بھلائیوں) کے کرنے کی، اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کی، اور وہ ہمارے عبادت گزار تھے۔

یہاں 'خیرات' کا لفظ ان اعمال کے لیے استعمال ہوا ہے، جن کے کرنے کا اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو حکم دیا تھا۔ ظاہر ہے پیغمبروں کو جن اعمال خیر کی وحی کی جاتی تھی ان کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ اس میں عبادات، اخلاقیات اور معاملات سب ہی شامل تھے، اسی کا نام دین اور شریعت ہے۔ اس سے بالکل واضح ہے کہ 'خیرات' کا لفظ کل شریعت کی جگہ بولا گیا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے پیغمبروں کو ملتی تھی اور جس کے تحت وہ زندگی گزارتے تھے۔ چناں چہ علامہ بغوی نے اس آیت کی تشریح اس طرح کی ہے:

(وَجَعَلْنٰهُمْ أَئِمَّةً یَهْدُوْنَ بِأَمْرِنَا) یُقتدي بهم في الخیرات (یَهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا) یدعون الناس إلى

"ہم نے انھیں امام بنایا۔ وہ ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے۔" یعنی 'امورِ خیر' میں ان کی پیروی کی جاتی تھی۔ "وہ ہمارے حکم سے ہدایت

دیننا (وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ) یعني العمل بالشرائع[1]

کرتے تھے۔" کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگوں کو ہمارے دین کی دعوت دیتے تھے "اور ہم نے ان کی طرف 'اعمالِ خیر' کی وحی کی"، یعنی شریعتوں پر عمل کا حکم دیا۔

مفسر خازن نے بھی 'فعل الخیرات' کی تشریح 'العمل بالشرائع' کے جملے ہی سے کی ہے[2] اس کا مطلب یہ ہے کہ 'خیر' اللہ تعالیٰ کی شریعت کا دوسرا نام ہے۔ پیغمبروں کو اسی خیر پر عمل کا حکم دیا جاتا تھا، ان کی زندگی اسی کا نمونہ ہوتی تھی اور وہ دوسروں کو اسی کی دعوت دیتے تھے۔ اسی چیز نے انھیں عبدیت کے مقامِ بلند تک پہنچایا اور وہ اللہ کے نزدیک عابد قرار پائے۔

خیر کا مفہوم سمجھنے کے لیے ایک اور آیت لیجیے، جو سورۂ مائدہ میں ہے۔ یہ آیت اختلافِ شرائع کا ذکر کرتی ہے۔ اللہ کا دین اپنی حقیقت اور روح کے اعتبار سے ہمیشہ ایک ہی رہا، اس میں کبھی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ لیکن مختلف ادوار میں احکامِ شریعت مختلف رہے ہیں۔ چناں چہ بنی اسرائیل کو جو شریعت دی گئی تھی، محمد ﷺ کی بعثت کے بعد وہ بدل گئی اور آپ کو ایک نئی شریعت دی گئی، لیکن یہ اختلافِ شریعت اصل دین میں اختلاف کے ہم معنی ہرگز نہیں ہے۔ اس لیے خدا پرستی کا تقاضا یہ ہے کہ جس دور میں جو احکام شریعت نازل ہوں ان کے سامنے سر جھکانے کے لئے انسان تیار ہوجائے۔ جو شخص نئی شریعت کے آنے کے بعد بھی پچھلی شریعت کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے وہ اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہے۔

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجاً ط ...فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ط (المآئدۃ: ۴۸)

ہم نے تم میں سے ہر گروہ کے لیے ایک شریعت اور ایک راہ متعین کی ہے... تو اب تم 'خیرات' (بھلائیوں) میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو۔

---

[1] معالم التنزیل المطبوع علی ہامش الخازن: ۴/ ۳۰۲

[2] لباب التاویل فی معانی التنزیل: ۴/ ۳۰۲

یہاں 'خیرات' میں آگے بڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس شریعت پر عمل کیا جائے جو محمد ﷺ پر نازل ہوئی ہے۔ کیوں کہ اب نجات اسی شریعت کی اتباع میں ہے۔ چناں چہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:

وهی طاعة الله واتباع شرعه الذی جعله ناسخاً لما قبله و التصديق بكتابه القرآن الذی هو آخر كتاب أنزله[1]

اس سے مراد ہے اللہ کی اطاعت اور اس کی شریعت کا اتباع، جسے اس نے پچھلی شریعتوں کی ناسخ بنایا ہے اور اس کی کتاب قرآن مجید کی تصدیق، جو اس نے سب سے آخر میں نازل کی ہے۔

علامہ سیّد محمود آلوسی فرماتے ہیں:

فسارعوا إلى ما هو خير لكم فی الدارين من العقائد الحقة والأعمال الصالحة المندرجة في القرآن الكريم[2]

جلدی کرو ان صحیح ترین عقائد اور اعمال صالحہ کے اختیار کرنے میں جو قرآن کریم میں درج ہیں، کیوں کہ یہی تمہارے لیے دنیا و آخرت میں بہتر ہے۔

علامہ نظام الدین قمی نیشا پوری لکھتے ہیں:

يعنی بالخيرات هٰهنا ما هو الحق من الاعتقادات والمُحقق من التكاليف[3]

یہاں 'خیرات' سے اللہ تعالیٰ کی مراد صحیح ترین عقائد اور وہ ثابت شدہ اعمال ہیں، جن کے کرنے کا انسانوں کو حکم دیا گیا ہے۔

ان تشریحات سے واضح ہے کہ 'خیرات میں سبقت' کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کی بندگی، اس کے رسول ﷺ کی اطاعت اور احکامِ شریعت کے اتباع میں آگے بڑھنا۔ 'خیر' کے ایک لفظ میں وہ پورا نظامِ عقائد و اعمال سمٹ آیا ہے جو قرآن کی شکل میں نازل ہوا ہے۔ اسی 'خیر' کی طرف دنیا کو دعوت دینے کا امت مسلمہ کو حکم دیا گیا ہے۔

---

[1] تفسیر القرآن العظیم: ۴/ ۱۵۵

[2] روح المعانی، المجلد الثالث، الجزء ۶، ص/ ۳۲۲

[3] غرائب القرآن ورغائب الفرقان المطبوع علیٰ ہامش ابن جریر: ۶/ ۱۳۵

اب آپ براہِ راست اس آیت کو لیجیے جس میں 'دعوت خیر' کا حکم موجود ہے اور دیکھیے کہ اس کی تشریح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے، صحابہ وتابعین نے اور قرآنی علوم کے محققین نے کیا کی ہے؟

سنت کا بیان

ابوجعفر باقرؒ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے یہ آیت پڑھی:

وَلْتَكُنْ مِّنكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ — تم میں ایک گروہ ایسا ضرور ہونا چاہیے جو خیر کی طرف دعوت دے۔

اور فرمایا:

اَلْخَيْرُ اِتِّبَاعُ الْقُرْاٰنِ وَ سُنَّتِيْ[1] — قرآن اور میری سنت کی اتباع کا نام خیر ہے

'دعوتِ خیر' کا مطلب یہ ہے کہ قرآن وسنت کی طرف دعوت دی جائے۔ قرآن وسنت کی دعوت کے سوا کوئی دوسری دعوت لے کر امت مسلمہ اٹھتی ہے تو وہ نہ دعوتِ خیر ہوگی اور نہ اس کا کام دعوتِ خیر کا کام ہوگا۔

سلف کی تشریحات

ابوحیان اندلسی نے 'خیر' کے بارے میں بعض تابعین کے اقوال نقل کیے ہیں:

الخير هو الإسلام، قاله مقاتل، أو العمل بطاعة الله قاله أبو سليمان الدمشقي أو الجهاد والإسلام[2] — خیر سے مراد اسلام ہے۔ یہ مقاتل کا قول ہے۔ یا اس سے مراد اللہ کی اطاعت ہے۔ یہ ابوسلیمان دمشقی نے کہا ہے۔ یا اس سے مراد جہاد اور اسلام ہے۔

علامہ بغوی نے 'خیر' کی تشریح اسلام سے کی ہے۔[3] اور یہی تشریح 'جلالین' میں موجود ہے۔ لیکن یہ نہ فراموش کرنا چاہیے کہ اسلام سے مراد کوئی ایک جزء یا کسی خاص

---

[1] فتح القدیر، الشوکانی: ۱/۳۶۶ [2] البحر المحیط: ۳/۱۶

[3] معالم التنزیل المطبوع علیٰ ہامش الخازن: ۱/۵۱۴

معاملے میں 'اللہ تعالیٰ کی اطاعت' نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد اس کا نازل کردہ پورا دین اور زندگی کے تمام معاملات میں اس کی اطاعت ہے، اور اسی مکمل دین کی دعوت کا امت مسلمہ کو حکم دیا گیا ہے۔ چناں چہ علامہ صاوی جلالین کی شرح میں فرماتے ہیں:

إنما قصره عليه لأنه رأس الأمور[۱]
مفسر نے خیر کو اسلام کے لفظ سے محدود کیا ہے، کیوں کہ اسلام تمام معاملات کی اساس ہے۔

ہمارے قدیم ترین مفسر امام ابن جریر طبری نے اسے اور واضح کیا ہے:

(وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ) أيها المؤمنون (أُمَّةٌ) يقول جماعة (يَدْعُوْنَ) الناس (إِلَى الْخَيْرِ) يعني إلى الْإسلام وشرائعه التي شرعها الله لعباده[۲]
اے اہل ایمان! تم میں ایک ایسی امت یعنی جماعت ضرور ہونی چاہیے جو لوگوں کو خیر کی طرف دعوت دے۔ 'خیر' کا مطلب ہے اسلام اور اس کی شریعت، جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے جاری کیا ہے۔

علامہ ابو حیان اندلسی فرماتے ہیں:

الدعاء إلى الخير وهو عام في التكاليف من الأفعال والتروك[۳]
'دعوت الی الخیر' عام ہے۔ اس میں وہ تمام اعمال شامل ہیں، جن کے کرنے کا شریعت نے حکم دیا ہے یا جن سے اس نے منع کیا ہے

قاضی بیضاوی لکھتے ہیں:

الدعاء إلى الخير يعمّ الدعاء إلى ما فيه صلاح ديني و دنيوي[۴]
'دعوت الی الخیر' عام ہے۔ اس کا مطلب ہے ان تمام چیزوں کی طرف دعوت دینا جن میں دین و دنیا کی صلاح ہے۔

یہی تفسیر شیخ ابو السعود اور علامہ سید محمود آلوسی نے کی ہے۔ یہ صلاحِ دین و

---

۱ حاشیہ الصاوی علیٰ تفسیر الجلالین: ۱/۱۵۰

۲ جامع البیان فی تفسیر القرآن: ۴/۲۴

۳ البحر المحیط: ۳/۲۰

۴ انوار التنزیل و اسرار التاویل. ۱/۱۷۴

دنیا، جس کی طرف امت مسلمہ کو دعوت دینا ہے، اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت میں موجود ہے۔ جو عقائد و اعمال ان دو ذرائع سے ثابت ہیں، وہی اصلاح کے ضامن ہیں، باقی ہر مسلک و خیال اور ہر نظریہ و عمل فساد اور ضلالت ہے۔ یہی مطلب ان مفسرین کا بھی ہے۔ شیخ اسماعیل حقی نے صلاحِ دین و دنیا کو 'تکلیف شرعی' کا نام دیا ہے اور 'تکلیف شرعی' کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ سے ثابت ہوتی ہے:

(وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ) جماعة داعية إلى الخير أى إلى مافيه صلاح دينى و دنيوى فالدعاء إلى الخير عام فى التكاليف من الأفعال و التروك[1]

(تم میں ایک ایسی امت ضرور ہونی چاہئے جو خیر کی طرف دعوت دے) یعنی ایسی جماعت جو خیر کی داعی ہو۔ خیر کا مطلب ہے وہ چیز جس میں دین و دنیا کی بہتری پائی جائے، اس لیے 'دعوت الی الخیر' میں وہ تمام امور شامل ہیں، جن کے کرنے یا نہ کرنے کا اللہ نے بندوں کو حکم دیا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن سے یہی ثابت ہے اور ہر مفسر نے یہی کہا ہے کہ 'دعوت خیر' دعوت اسلام کے ہم معنی لفظ ہے۔ ظاہر ہے امت مسلمہ کو 'دعوتِ خیر' پر مامور کرنے کا مطلب یہ کسی طرح نہیں ہوسکتا کہ وہ دنیا کے سامنے اسلام کی بس تعریف کرتی رہے، یا اس کی حقانیت پر کوئی کتاب لکھوا دے۔ اس دعوت کا حق اس وقت تک ادا نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اس کے لیے وقف نہ ہوجائے اور اپنی تمام قوتیں دنیا میں اسے قائم کرنے کے لیے صرف نہ کردے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کی ساری جدوجہد اسی مقصد کے لیے ہو، وہ اپنا سرمایہ حیات اسی میں لگا دے، اس کی صلح و جنگ اسی راہ میں ہو اور وہ اسی لیے جیے اور مرے۔

---

[1] روح البیان:۱/ ۳۵۲

ဆ

امر بالمعروف
و
نهی عن المنکر

وجوب اور اہمیت

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کارِ نبوت کے لیے قرآنی اصطلاح ہے

'معروف' کا حکم دینا اور 'منکر' سے روکنا پیغمبرانہ کام ہے۔ قرآن نے پیغمبروں اور ان کے سچے جانشینوں کے کام کو جن اصطلاحات میں بیان کیا ہے، ان میں ایک اصطلاح 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' بھی ہے۔ چناں چہ رسولِ اکرمؐ کے بارے میں ارشاد ہوا:

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ (الاعراف: ۱۵۷)	وہ ان (اہلِ کتاب) کو معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے روکتا ہے۔

حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی نصیحت کی

حضرت لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت فرماتے ہیں کہ معروف کا حکم دو اور منکر سے روکو اور اس راہ میں جو مصیبت آئے اسے برداشت کرو۔ یہ کام بے پناہ صبر اور ہمت چاہتا ہے اور اس پر اربابِ عزیمت ہی جم سکتے ہیں:

يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۚ (لقمان: ۱۷)	اے میرے بیٹے! نماز قائم کر 'معروف' کا حکم دے اور 'منکر' سے منع کر اور اس راہ میں جو تکلیف پہنچے اس پر صبر کر۔ یقیناً یہ بڑی عزیمت کا کام ہے۔

حضرت لقمان گو خدا کے پیغمبر نہیں تھے، لیکن صالح اور خدا ترس انسان ضرور تھے۔ قرآن نے ان کی نصیحت اس لیے نہیں نقل کی ہے کہ اس سے ان کے اخلاق اور سیرت پر روشنی پڑتی ہے، بلکہ اس لیے نقل کی ہے کہ اس کی اتباع کی جائے۔ جصاص فرماتے ہیں:

إنما حکی اللّٰه تعالیٰ لنا ذٰلک عن عبده لنقتدی به ونتنهی إلیه[1]

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کی یہ نصیحت ہمیں اس لیے سنائی ہے کہ ہم اس کی اتباع کریں اور اس تک پہنچیں۔

اہلِ کتاب کا حق پرست گروہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض انجام دے رہا تھا

نزولِ قرآن کے وقت اہل کتاب کے اندر زبردست فساد اور بگاڑ پیدا ہوچکا تھا اور وہ اللہ کے دین کو چھوڑ چکے تھے، لیکن اس کے باوجود ان میں ایک گروہ راہِ راست پر قائم تھا اور 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کا فرض انجام دے رہا تھا۔ قرآن نے اس کی تعریف کی ہے۔ یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ راہِ راست پر قائم رہنے کے لیے 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' ایک لازمی شرط ہے۔ اس کے بغیر راہِ راست پر قائم رہنے کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ چناں چہ ارشاد ہے:

لَیْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ یَّتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّیْلِ وَ ھُمْ یَسْجُدُوْنَ ○ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ ؕ وَ اُولٰٓئِکَ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ○ (آل عمران: ۱۱۳-۱۱۴)

اہلِ کتاب سب کے سب ایک سے نہیں ہیں۔ ان میں ایک جماعت راہ راست پر قائم ہے۔ یہ لوگ رات کے اوقات میں اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرتے اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں، اللہ پر اور آخرت کے دن پر یقین رکھتے ہیں، معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں جلدی کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا شمار صالحین میں ہے۔

---

[1] احکام القرآن: ۲/ ۵۹۲

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو اہل علم نے پیغمبروں کا کام کہا ہے

اس سے معلوم ہوا کہ کارِ نبوت کے لیے 'امر بالمعروف ونہی المنکر' کی تعبیر ٹھیک قرآنی تعبیر ہے۔ یہ کوئی محدود تعبیر نہیں ہے، جو انبیاء اور ان کے جانشینوں کے کام کے کسی ایک حصے کو ظاہر کرتی ہو، بلکہ یہ اس سعی وجہد کو پوری طرح نمایاں کرتی ہے جو انبیاءؑ اور ان کے جانشین اللہ کے دین کی راہ میں کرتے تھے۔ ان کی تمام تعلیمات امر و نہی پر مشتمل تھیں۔ وہ یا تو معروف کا حکم دیتے تھے یا منکر سے روکتے تھے۔ اس تعبیر کے ذریعے بہ آسانی سمجھا جاسکتا ہے کہ وہ کیا کام ہے جو ہر نبی اور اس کی امت کے صلحاء نے اپنے دور میں انجام دیا اور جس کے کرنے پر آج امت مسلمہ مامور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تعبیر بہ ظاہر چند الفاظ کا مجموعہ ہے، لیکن ان ہی چند الفاظ میں انبیاء کا مقصدِ بعثت بیان کر دیا گیا ہے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں اہلِ علم نے یہی بات کہی ہے۔

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

الأمر بالمعروف والنهى عن المنكر الذى انزل الله به كتبه و ارسل به رسله، من الدين[1]

امر بالمعروف ونہی عن المنکر، جس کی ہدایت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابیں نازل کیں اور اپنے رسول بھیجے، جزء دین ہے۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں:

إن الأمر بالمعروف والنهى عن المنكر كان واجبًا فى الأمم المتقدمة، وهو فائدة الرسالة وخلافة النبوة[2]

معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا پچھلی امتوں پر واجب تھا۔ یہی رسالت کا فائدہ ہے اور یہی نبوت کی جانشینی ہے۔

علاّمہ سیف الدین آمدی فرماتے ہیں:

---

[1] الحسبۃ فی الاسلام، ص:۵۷

[2] الجامع لاحکام القرآن، المجلد الثانی، الجزء ۴، ص۳۱

مامن أمة إلّا وقد أمرت بالمعروف كاتباع أنبيائهم و شراعهم، ونهت عن المنكر كنهيهم عن الإلحاد و تكذيب أنبيائهم[1]

جتنی بھی امتیں گزری ہیں ان میں سے ہر امت نے معروف کا حکم دیا ہے۔ مثال کے طور پر ان کا اپنے نبیوں اور ان کی شریعتوں کی اتباع کا حکم دینا۔ اسی طرح انھوں نے منکر سے منع کیا ہے، مثلاً ان کا الحاد اور تکذیب انبیاء سے منع کرنا۔

امام رازی ایک سوال قائم کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

الأمر بالمعروف والنهى عن المنكر والايمان بالله... إن هذه الصفات الثلثة كانت حاصلة فى سائر الأمم[2]

امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور خدا پر ایمان یہ تینوں صفتیں تمام امتوں میں موجود تھیں۔

علامہ رشید رضا مصری لکھتے ہیں:

قد جرت سنة الأنبياء و السلف الصالحين على الدعوة إلى الخير و الأمر بالمعروف و النهي عن المنكر و إن كان محفوفاً بالمكاره و المخاوف[3]

انبیاء و مرسلین اور سلف صالحین کی یہ سنت رہی ہے کہ انھوں نے 'خیر' کی دعوت دی، معروف کا حکم دیا اور منکر سے منع کیا۔ اگرچہ یہ کام مشقتوں اور تکالیف سے گھرا ہوا ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر امتِ مسلمہ کا فرض منصبی ہے

اہلِ علم کی ان تصریحات سے واضح ہے کہ 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر، ہر دور میں اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں اور ان کی امتوں کا کام رہا ہے۔ اسی کام کے لیے امت مسلمہ وجود میں آئی ہے۔ اس کا مقام یہ نہیں ہے کہ وہ بس اپنی حد تک صلاح و تقویٰ کی زندگی گزارتی رہے، بلکہ اسے دنیا کی ہدایت اور راہ نمائی کی ذمہ داری بھی انجام دینی ہے۔ وہ

---

[1] الاحکام فی اصول الاحکام: ۱/ ۳۰۸

[2] مفاتیح الغیب: المجلد الرابع، الجزء ۸، ص ۱۵۷

[3] تفسیر القرآن الحکیم (المنار): ۴/ ۳۲

عابد و زاہد بھی ہے اور ہادی و رہ نما بھی۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت اور مخلوق کی ہدایت اس کے کام کے دو جزء ہیں۔ آج اگر وہ ان میں سے کسی بھی جزء کو چھوڑ بیٹھے تو کل قیامت کے روز اس سے سخت باز پرس ہوگی اور وہ ناکام و نامراد قرار پائے گی۔ قرآن کی آیتِ ذیل میں اس کا امتیاز خاص بیان ہوا ہے:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ط (آل عمران:۱۱۰)

تم بہترین امت ہو جسے لوگوں (کی ہدایت) کے لیے نکالا گیا ہے، تم معروف کا حکم دیتے اور منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اس آیت میں امت مسلمہ کو 'خیر امت' کہا گیا ہے اور اس کی دو صفات بیان ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ معروف کا حکم دیتی اور منکر سے روکتی ہے اور دوسری یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتی ہے۔ اللہ پر ایمان یہ ہے کہ انسان اس کو اپنا معبود اور حاکم مانے اور اس کے احکام کو بے چوں و چرا تسلیم کرے۔ ایمان یقینِ قلب اور کامل اتباع کا دوسرا نام ہے۔ چناں چہ مفسر خازن نے اس موقعے پر ایمان باللہ کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:

(وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ) أي وتصدقون باللّٰه و تخلصون لـه التوحيـد والعبادة[1]

"تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو" یعنی تم اس کے وجود کی تصدیق کرتے ہو، اس کو سچے دل سے ایک مانتے ہو اور اسی کی بندگی کرتے ہو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس امت کو 'خیر امت' کا لقب اس لیے ملا ہے کہ ایک طرف تو وہ شر سے بھری ہوئی دنیا کے لیے خیر ثابت ہوگی اور سیدھی راہ دکھائے گی اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اور فرماں برداری کرے گی۔ یہ دو طرفہ کام اس امت کو اتنے اونچے مقام تک پہنچا دیتا ہے کہ کوئی بھی امت اس عظمت کو پا نہیں سکتی۔ اس کام کی وجہ سے اس کے اندر پیغمبرانہ شان پیدا ہوجاتی ہے اور جس امت میں یہ شان پیدا ہوجائے، خدا کی اس زمین پر اس سے بہتر کوئی دوسری قوم ہے نہ اور ہوسکتی

---

[1] لباب التاویل فی معانی التنزیل:۱/۳۳۹

ہے۔ علامہ صاوی اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں:

هذه الأمة لها شبه بالأنبياء من حيث إنها مهتدية في نفسها هادية لغيرها[1]	اس امت کو انبیاء سے ایک گونہ مشابہت ہے، اس طرح کہ وہ خود بھی راہ یاب ہے اور دوسروں کو بھی راہ دکھاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' اور اللہ پر ایمان اور اس کی اطاعت 'خیر امت' کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ اگر وہ ان خصوصیات کو کھودے تو اس کی عظمت اس سے چھن جائے گی اور اس میں اور دنیا کی دوسری قوموں میں کوئی فرق نہ رہ جائے گا۔ حضرت عمرؓ نے ایک حج کے موقعے پر مذکورہ بالا آیت پڑھی اور فرمایا:

يـأيّها الناس. من سرّه أن يكون من تلك الأمة فليؤد شرط الله منها[2]	اے لوگو! تم میں سے جو شخص اس 'خیر امت' میں شامل ہونا چاہے تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو شرط رکھی ہے وہ پوری کرے۔

مجاہد اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں:

كنتم خير الناس للناس على هذا الشرط أن تأمروا بالمعروف و تنهوا عن المنكر وتؤمنوا بالله[3]	تم انسانوں کے حق میں بہترین انسان ہو، اس شرط کے ساتھ کہ تم معروف کا حکم دیتے ہو، منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں:

(تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ) مدح لهذه الأمة ما أقاموا ذٰلک واتصفوا به فإذا تركوا التغيير وتواطئوا على المنكر زال عنهم اسم المدح ولحقهم اسم	اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ "تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو" اس امت کی تعریف ہے جب تک کہ وہ اس پر قائم رہے اور یہ صفت اس کے اندر پائی جائے، لیکن اگر وہ 'منکر' کو بدلنے کا کام چھوڑ دے اور منکر پر اتفاق کر لے تو اللہ نے اسے جو توصیفی نام دیا ہے وہ اس سے چھن جائے گا

۱۔ حاشیہ الصاوی علی تفسیر الجلالین: ۱/ ۱۵۳
۲۔ جامع البیان فی تفسیر القرآن: ۴/ ۲۷
۳۔ حوالہ سابق، ص ۲۸

الذم و كان ذلك سبباً لهلاكهم[1]

اور اس کے ساتھ مذمت چپک جائے گی اور یہی چیز اس کی ہلاکت کا سبب ہوگی۔

امام رازی نے اسی حقیقت کو فقہی اور قانونی زبان میں اس طرح بیان کیا ہے:

انه ثبت في أصول الفقه أن ذكر الحكم مقرونا بالوصف المناسب له يدل على كون ذلك الحكم معلّلاً بذٰلك الوصف، فها هنا حكم تعالى بثبوت وصف الخيرية لهذه الاُمة، ثم ذكر عقيبه هذا الحكم و هذه الطاعات، أعني الأمر بالمعروف و النهي عن المنكر و الإيمان، فوجب كون تلك الخيرية معلّلة بهذه العبادات[2]

اصولِ فقہ کا یہ ایک مانا ہوا قاعدہ ہے کہ کسی حکم کا اس کے مناسب وصف کے ساتھ ذکر کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ وصف اس حکم کی علت ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لیے 'خیر' کے وصف کا اعلان کیا ہے۔ پھر اس کے ساتھ ہی اس حکم اور ان عبادات کا یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور ایمان کا ذکر فرمایا ہے، اس سے لازم آیا کہ یہی عبادات 'خیر' کے اس وصف کی علت ہیں۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر اہلِ ایمان کی ایسی صفت ہے، جو ان سے کسی بھی حال میں جدا نہیں ہوسکتی۔ مومن کی تصویر جب کبھی سامنے آئے گی تو اس میں یہ خوبی ضرور شامل ہوگی۔اس کے بغیر مومن کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو جس حالت میں دیکھنا چاہتا ہے اس حالت میں وہ اسی وقت موجود ہوں گے جب کہ وہ 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کا فریضہ انجام دے رہے ہوں۔ ایمان کا معیارِ مطلوب یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنے دامن کو معصیت سے بچائے رکھے، بلکہ حقیقی ایمان وہ ہے جو ڈوبتی ہوئی انسانیت کو سہارا دیتا اور کفر و شرک کے خلاف اضطراب اور بے تابی پیدا کرتا ہے، جو ایمان دنیا کو محروم ہدایت دیکھ کر نہ تڑپ اٹھے وہ اپنی روح کھوچکا ہے اور اس میں ایمان کی شان باقی نہیں ہے۔

---

1. الجامع لاحکام القرآن، المجلد الثانی، الجزء ۴، ص ۱۱۱
2. مفاتیح الغیب (التفسیر الکبیر)، المجلد الرابع، الجزء ۸، ص ۱۵۷

قرآن نے امت مسلمہ کو 'خیر امت' اس لیے کہا ہے کہ وہ معروف کا حکم دیتی اور منکر سے روکتی ہے اور اللہ پر ایمان رکھتی ہے۔ اسی طرح اہلِ کتاب کے حق پرست گروہ کو 'امة قائمة' (راہِ راست پر قائم رہنے والی اُمت) کہا گیا ہے، کیوں کہ اس گروہ سے تعلق رکھنے والے اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے ہیں، اس کے عبادت گزار ہیں۔ خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، اور یہ کہ وہ:

يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران:۱۱۴)

معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ 'خیر امت' بننے اور 'راہِ است پر قائم رہنے' کے لیے صرف ذاتی صفات مطلوب نہیں ہیں، بلکہ اس کے لیے دوسروں کی ہدایت و راہ نمائی کے اوصاف بھی ضروری ہیں۔

علامہ ابو السعود نے اس فقرہ کی شرح ان الفاظ میں کی ہے:

(وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ) صفتان أخريان لأمة أجريتا عليهم تحقيقا لمخالفتهم اليهود في الفضائل المتعلقة بتكميل الغير أثر بيان مباينتهم لهم في الخصائص المتعلقة بتكميل النفس، و تعريضاً بمداهنتهم في الاُحتساب بل بتعكيسهم في الأمر باضلال الناس وصدّهم عن سبيل الله فإنه أمر بالمنكر ونهي عن المعروف[1]

"معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں" راہِ راست پر قائم رہنے والے گروہ کی یہ مزید دو صفتیں بیان ہوئی ہیں، تاکہ یہ واضح کرنے کے بعد کہ وہ ان 'خصائص' میں جو 'تکمیل نفس' سے متعلق ہیں عام یہود سے مختلف ہے، یہ بھی روشن کردیا جائے کہ ان 'خصائص' میں بھی 'جو تکمیل غیر' سے متعلق ہیں اس کی روش ان سے جدا ہے۔ اس میں یہود پر تعریض بھی ہے کہ وہ لوگوں کے احتساب میں مداہنت دکھا رہے ہیں، بلکہ الٹے انھیں گم راہ کر رہے اور اللہ کی راہ سے روک رہے ہیں اور یقیناً یہ منکر کا حکم دینا اور معروف سے روکنا ہے۔

---

[1] ارشاد العقل السلیم الیٰ مزایا الکتاب الکریم المعروف بتفسیر ابی السعود علیٰ ہامش التفسیر الکبیر: ۲/۵۰۶

ابو حیان اندلسی فرماتے ہیں:

لما کملو فی انفسھم سعوا فی تکمیل غیرھم بھٰذین الوصفین[1]

جب وہ اپنی ذات میں مکمل ہو چکے تو 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کے اوصاف کے ذریعہ انھوں نے دوسروں کی تکمیل کی کوشش کی۔

حضرت لقمان کی نصیحت میں 'اقامت صلوٰۃ' کے ساتھ 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' ذکر موجود ہے۔ یہ حقیقت میں 'تکمیلِ ذات' و 'تکمیل غیر' کے دو عنوانات ہیں۔

علامہ سید محمود آلوسی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

(یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ) تکمیلا لنفسک ... (وَ اْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ) تکمیلاً لغیرک[2]

"اے میرے بیٹے نماز قائم کرو" اپنی ذات کی تکمیل کے لیے... "اور معروف کا حکم دو اور منکر سے منع کرو" دوسروں کی تکمیل کے لیے۔

امام رازی نے اسی بات کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا ہے:

إذا کملت انت فی نفسک بعبادۃ اللہ فکمّل غیرک، فإن شغل الأنبیاء وورثتھم من العلماء ھو أن یکملوا في أنفسھم ویکملوا غیرھم[3]

خدا کی عبادت کے ذریعے جب تم اپنی ذات کی تکمیل کر چکو تو دوسروں کی بھی تکمیل کرو۔ کیوں کہ انبیاء اور ان کے وارث علماء کا یہ کام رہا ہے کہ وہ اپنی ذات کی بھی تکمیل کرتے ہیں اور دوسروں کی بھی۔

سورۂ توبہ کی ایک آیت اس حقیقت کو اور واضح کرتی ہے جس میں اہلِ ایمان کی صفات بیان کی گئی ہیں:

اَلتَّائِبُوْنَ الْعَابِدُوْنَ الْحَامِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰاكِعُوْنَ السّٰاجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنّٰاھُوْنَ

وہ خدا سے توبہ کرنے والے، اس کی عبادت کرنے والے، اس کی حمد وثنا کرنے والے، اس کی راہ میں زمین میں گھومنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، معروف کا

---

[1] البحر المحیط: ۳/۳۲ [2] روح المعانی، المجلد الحادی عشر، جزء۲۱، ص۸۸

[3] مفاتیح الغیب: المجلد الثالث عشر، الجزء ۲۵، ص۱۳۰

عَنِ الْمُنكَرِ وَالْحَافِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (التوبۃ:۱۱۲)

حکم دینے والے اور منکر سے روکنے والے اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے ہیں اور تم مومنوں کو خوش خبری دے دو۔

اس آیت میں جو صفات بیان ہوئی ہیں، ان میں کچھ تو وہ ہیں، جن کا تعلق اہلِ ایمان کی ذات سے ہے اور کچھ وہ ہیں جو دوسروں کے درمیان ان کے کام کو بتاتی ہیں۔ توبہ، عبادت، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا، اس کی راہ میں سیر و سیاحت اور رکوع و سجدہ ایسی صفات ہیں، جن کے اثرات ان کی ذات تک محدود ہیں اور دوسروں کے لیے وہ جو کچھ کرتے ہیں اسے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔

علّامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

ينفعون خلق الله، ويرشدونهم إلى طاعة الله بأمرهم بالمعروف و نهيم عن المنكر مع العلم مما ينبغي فعله ويجب تركه وهو حفظ حدود الله في تحليله وتحريمه علماً وعملاً، فقاموا بعبادة الحق و نصح الحق، ولهذا قال "وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ" لأن الإيمان يشمل هذا كله، والسعادة كل السعادة لمن اتصف به[1]

وہ مخلوق کو فائدہ پہنچاتے ہیں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ذریعہ انھیں خدا کی بندگی کی راہ دکھاتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ جانتے ہیں کہ کون سا کام کرنا چاہیے اور کون سا کام نہیں کرنا چاہیے۔ اسی کو حدود اللہ کی حفاظت کہتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے حلال و حرام کے جو حدود مقرر کردیے ہیں، علم و عمل دونوں پہلوؤں سے ان کی حفاظت کی جائے۔ پس اس طرح اہلِ ایمان، اللہ کی عبادت کے ساتھ مخلوق کی خواہی کا فرض بھی انجام دیتے ہیں۔ اسی لیے کہا کہ 'مومنوں کو خوش خبری دو' کیوں کہ ایمان ان تمام باتوں کو شامل ہے اور سعادت پوری کی پوری اسی کے لیے ہے جو اس سے متصف ہو۔

علامہ سید محمود آلوسی نے اس حقیقت کو صرف ایک جملہ میں ادا کر دیا ہے:

كانه قيل: الكاملون في انفسهم المكمّلون لغيرهم[2]

گویا آیت میں یہ بات کہی گئی ہے کہ وہ اپنی ذات میں کامل ہوتے ہیں اور دوسروں کی تکمیل کرتے ہیں۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر: ۲/ ۳۹۲ [2] روح المعانی، المجلد السادس، الجزء ۱۱، ص ۳۲

امام رازی اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' نہ صرف یہ کہ عبادت ہے، بلکہ مشکل ترین عبادت ہے:

كل ما سبق من الصفات عبادات يأتي بها الْإنسان لنفسه ولَا تعلق لشي ء منها بالغير. أما النهي عن المنكر فعبادة متعلقة بالغير... النهي عن المنكر أصعب أقسام العبادات[1]

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ذکر سے پہلے جن صفات کا تذکرہ آیا ہے وہ ایسی عبادتیں ہیں، جن کو انسان اپنی ذات کے لیے انجام دیتا ہے۔ ان میں سے کسی صفت کا دوسروں سے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن 'منکر سے روکنا' ایسی عبادت ہے جو دوسروں سے متعلق ہے... 'منکر سے روکنا' سخت ترین عبادت ہے۔

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

ومن عبادته وطاعة أمره الأمر بالمعروف والنهى عن المنكر بحسب الامكان[2]

اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی اطاعت میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اپنے امکان کی حد تک معروف کا حکم دیا جائے اور منکر سے روکا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ امت مسلمہ سے دنیا کی اصلاح کا مشکل ترین کام لینا چاہتا ہے۔ اسی کارِ عظیم کو انجام دینے کا نام امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ یہ اس امت کے دین و ایمان کا تقاضا ہے کہ دنیا کو معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے۔ یہ کام اصلاً پیغمبرانہ کام ہے اور امت مسلمہ کو اس میں پیغمبروں کی نیابت کرنی ہے اگر وہ اس کام کو چھوڑ دے تو اپنے صحیح مقام پر باقی نہیں رہ سکتی۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

قال النبيﷺ: من أمر بالمعروف و نهٰى عن المنكر فهو خليفة الله فى أرضهٖ وخليفة رسوله وخليفة كتابه[3]

نبیﷺ نے فرمایا جو شخص معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے وہ خدا کی زمین میں خدا کا نائب ہے، خدا کے رسولؐ کا نائب ہے اور خدا کی کتاب کا نائب ہے۔

---

[1] التفسیر الکبیر، المجلد الثامن، الجزء ۱۶، ص ۱۶۳ [2] رسالۃ العبودیۃ: ص ۱۳
[3] الجامع لاحکام القرآن لابی عبد اللہ القرطبی، المجلد الثانی، الجزء ۴، ص ۳۱

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا وجوب اور اہمیت احادیث سے ثابت ہے

اب اس بحث کے ذیل میں چند احادیث پیش کی جارہی ہیں، جن پر ایک نظر ڈالنے سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا ذکر، علم دین، تقویٰ اور صلۂ رحمی جیسے اعلیٰ ترین اوصاف کے ساتھ کیا ہے۔ بالفاظِ دیگر انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ فکر وعمل کی انفرادی خوبیوں کے ساتھ دعوت وتبلیغ اور دوسروں کی اصلاح کی جدوجہد بھی کرتا رہے، پھر اس کام کو آپؐ نے دین کے بنیادی ارکان کی صف میں جگہ دی ہے اور اس شخص کو اسلامی سوسائٹی کا اچھا فرد ماننے سے انکار کر دیا ہے، جس میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ذمے داری کا احساس نہ ہو۔ سب سے آخری بات یہ کہ اس کام کا آپؐ نے نہ صرف یہ کہ تاکیدی حکم دیا ہے، بلکہ اس کو چھوڑنے پر عذابِ الٰہی کے نزول کا اندیشہ ظاہر فرمایا ہے۔

درۃ بنت ابی لہبؓ فرماتی ہیں:

قام رجل إلى النبي ﷺ وهو على المنبر فقال : يا رسول الله، أي الناس خير؟ فقال ﷺ: خير الناس أقرأهم و أتقاهم و آمرهم بالمعروف و أنهاهم عن المنكر و أوصلهم للرحم[1]

نبی ﷺ منبر پر وعظ فرما رہے تھے کہ ایک شخص کھڑا ہوکر آپؐ کی طرف بڑھا اور سوال کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ! انسانوں میں سب سے بہتر کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جو اُن میں سب سے زیادہ خدا کی کتاب پڑھے، جو ان میں سب سے زیادہ متقی ہو اور جو ان میں سب سے زیادہ معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے اور جو سب سے زیادہ رشتوں کو ملائے رکھے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

الإسلام أن تعبد الله لاَ تشرك به شيئاً، وتقيم الصلاة، وتؤتي الزكاة،

اسلام یہ ہے کہ تم اللہ کی بندگی کرو، اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو، نماز قائم کرو،

---

[1] مسند احمد: ۷/ ۱۶۲، قال الحافظ المنذری رواہ ابو الشیخ فی کتاب الثواب والبیہقی فی الزہد الکبیر وغیرہ (الترغیب والترہیب: ۳/ ۱۶۲)

وتصوم رمضان، وتحج البيت، والأمر بالمعروف والنهي عن المنكر وتسليمک علی اهلک، فمن انتقص شيئًا منهن فهو سهم من الإسلام يدعه، ومن ترکهن کلهن فقد ولی الإسلام ظهره[۱]

زکوٰۃ دو، رمضان کے روزے رکھو، بیت اللہ کا حج کرو، معروف کا حکم دو اور منکر سے روکو اور اپنے گھر والوں کو سلام کرو۔ ان میں سے کسی بھی چیز کو جو شخص کم کرتا ہے وہ اسلام کا ایک جزء چھوڑ دیتا ہے اور جس نے ان سب چیزوں کو چھوڑ دیا تو اس نے اسلام ہی سے پیٹھ پھیر لی۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں:

ليس منا من لم يرحم صغيرنا، و يوقر کبيرنا و يأمر بالمعروف و ينه عن المنکر[۲]

وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کھائے اور ہمارے بڑوں کی تعظیم نہ کرے، معروف کا حکم نہ دے اور منکر سے منع نہ کرے۔

حضرت حذیفہؓ کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

والـذي نفسي بيـده لتامرنّ بالمعروف ولتنهونّ عن المنکر أو ليوشکنّ اللّـه أن يبعث عليکم عذابًا منـه فتدعون فلا يستجيب لکم[۳]

قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم ضرور معروف کا حکم دو اور منکر سے روکو، ورنہ وہ وقت دور نہیں کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنا عذاب نازل کردے۔ اس وقت تم اس سے دعا کروگے، لیکن تمہاری دعا سنی نہیں جائے گی۔

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں:

قال رسول الله ﷺ: "أوحی الله عز جل إلی جبرئيل عليه السلام أن اقلب مدينة کذا و کذا بأهلها،

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیلؑ کو وحی کی کہ فلاں شہر کو اس کے باشندوں کے ساتھ الٹ دو۔ اس پر حضرت جبرئیلؑ نے کہا:

---

۱ رواہ الحاکم: ۱/ ۲۱۔ والمنذری بمعناہ عن البزار (الترغیب والترہیب: ۳/ ۱۶۴)

۲ رواہ احمد والترمذی واللفظ لہ وابن حبان فی صحیحہ (الترغیب والترہیب: ۳/ ۱۶۴)

۳ ترمذی، ابواب الفتن، باب ماجاء فی الامر بالمعروف والنہی عن المنکر

فقال یارب إن فیهم عبدک فلاناً لم یعصک طرفة عین، قال فقال: قَلِّبْها علیه و علیهم فإن وجهه لم یتمعَّرْ فِيَّ ساعةً قَطُّ[1]

خدایا اس میں تیرا فلاں بندہ بھی تو ہے، جس نے ایک لمحہ کے لیے تیری معصیت نہیں کی۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ اللہ نے حضرت جبرئیلؑ سے کہا: اس شہر کو بشمول اس شخص کے اور سارے لوگوں کے الٹ دو، کیوں کہ (شہر میں نافرمانی ہوتی رہی لیکن) میری خاطر ایک گھڑی کے لیے بھی اس کے چہرے کا رنگ متغیر نہیں ہوا۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے وجوب پر امت کا اتفاق ہے

سلف سے خلف تک آپ کو کوئی بھی صاحبِ علم ایسا نہیں ملے گا، جس نے 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کو اساسِ دین کی حیثیت سے نہ پیش کیا ہو اور اسے امت مسلمہ کا اہم فرض نہ قرار دیا ہو۔

ضحاک فرماتے ہیں:

الأمر بالمعروف والنھی عن المنکر فریضة من فرائض اللّٰه کتبھا اللّٰه علی المؤمنین[2]

امر بالمعروف و نہی عن المنکر اللہ تعالیٰ کے متعین کردہ فرائض میں سے ایک فرض ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے لیے لازم کر دیا ہے۔

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' پر بحث کا آغاز ان الفاظ میں کیا ہے:

الأمر بالمعروف والنھی عن المنکر ھو القطب الأعظم فی الدین، وھو المھمُّ الذي ابتعث اللّٰه له النبیین أجمعین، و لوطوی

امر بالمعروف و نہی عن المنکر دین کا عظیم ترین ستون ہے۔ یہ وہ مہم ہے، جس کے سر کرنے کے لیے اللہ نے تمام انبیاء کو بھیجا ہے۔ اگر اس کی بساط لپیٹ کر رکھ دی جائے، اس کا علم اور اس پر عمل چھوڑ دیا جائے تو کارِ نبوت

---

[1] رواہ البیہقی فی شعب الایمان (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الآداب، باب فی الامر بالمعروف)

[2] شوکانی، فتح القدیر: ۲/ ۳۶۳

بساطه وأهمل علمه وعمله لتعطلت النبوة وأضمحلت الديانة، و عمت الفترة، وفشت الضلالة و شاعت الجهالة، و استشرى الفساد، واتسع الخرق و خربت البلاد، و هلک العباد، و لم يشعروا بالهلاک إلاّ يوم التناد، وقد كان الذي خفنا أن يكون، فإنا للّٰه و إنا إليه راجعون، إذقد اندرس من هذا القطب عمله و علمه، وانمحق بالكلية حقيقته و رسمه، فاستولت على القلوب مداهنة الخلق، وانمحت عنها مراقبة الخالق، واسترسل الناس فی اتباع الهوى والشهوات استرسال البهائم، وعزَّ على بساط الأرض مؤمن صادق لا تأخذه فی اللّٰه لومة لاَئم. فمن سعى فی تلافی هذه الفترة وسد هذه الثلمة، إما متكفلا بعلمها أو متقلّداً لتنفيذها، مجدداً لهذه السنة الداثرة، ناهضاً بأعبائها، و متشمرًا فی إحيائها كان مستأثراً من بين الخلق بإحياء سنة

معطل ہوجائے گا اور دین کم زور پڑ جائے گا (اس سے) دورِ جاہلیت عام ہوگا، گم راہی پھیلے گی، جہالت بڑھے گی، فساد گھس پڑے گا، بگاڑ وسیع ہوگا، بستیاں ویران ہوں گی، انسان ہلاک ہوں گے اور قیامت سے پہلے انھیں اپنی ہلاکت کا احساس تک نہ ہوگا، لیکن افسوس کہ جس کا ہمیں خطرہ تھا وہ اب واقع ہوچکا ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون، کیوں کہ دین کی اس بنیاد کا علم وعمل ختم ہوگیا ہے اور اس کی ظاہری صورت اور حقیقت دونوں بالکلیہ مٹ چکی ہیں، دلوں پر مخلوق سے مداہنت چھا گئی ہے اور ان کے اندر خالق کا کوئی پاس ولحاظ باقی نہیں رہ گیا ہے۔ لوگ خواہشاتِ نفس کی پیروی میں جانوروں کی طرح چھوٹ گئے ہیں، اور صفحۂ زمین پر کسی ایسے مومنِ صادق کا وجود دشوار ہوگیا ہے، جسے اللہ کے معاملے میں کسی ملامت گر کی ملامت کی پروا نہ ہو، لہٰذا جو شخص اس جہالت کی حالت کو دور کرنے اور اس شگاف کو بند کرنے کی کوشش کرے گا، خواہ وہ اس کی تعلیم و اشاعت کی ذمہ داری قبول کرے یا اس کی تنفیذ کا بار اٹھائے، اس طرح اس مٹتی ہوئی سنت کی تجدید کرے، اس کا بوجھ اٹھانے کے لیے کھڑا ہوجائے اور اس کو زندہ کرنے کے لیے کمر کس لے تو ایک ایسی سنت کو زندہ کرنے کی وجہ سے، جسے زمانے نے مٹا دیا ہے، اللہ کی مخلوق کے درمیان اس کا مقام بہت اونچا اور ممتاز ہوگا

سنة أفضى الزمان إلى إماتتها، ومستبداً بقربة تتضاءل درجات القرب دون ذروتها.

اور اسے دربارِ خداوندی میں ایسی قربت نصیب ہوگی کہ قربت کا کوئی بھی درجہ اس کی بلندی کو پا نہیں سکے گا۔

اس کے بعد پہلا باب اس صراحت کے ساتھ شروع کرتے ہیں:

الباب الأول في وجوب الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر و فضيلته و المذمة في إهماله و إضاعته. و يدل على ذٰلك بعد إجماع الأمة عليه، وأشارات العقول السليمة إليه، الآيات و الأخبار والآثار[1]

پہلا باب اس بیان میں کہ 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' واجب ہے اور اسی میں اس کی فضیلت کا اور اسے ترک کرنے اور ضائع کرنے کی مذمت کا ذکر بھی ہوگا۔ ان تمام باتوں پر اجماعِ امت اور عقلِ سلیم کے اشارات کے بعد قرآن کی آیتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور آثار صحابہ دلالت کرتے ہیں۔

ابوبکر جصاص فرماتے ہیں:

أكد الله تعالى فرض الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر في مواضع من كتابه ، وبينه رسول الله ﷺ في أخبار متواترة عنه فيه، وأجمع السلف وفقهاء الأمصار على وجوبه[2]

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے بہت سے مقامات میں 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کے فرض کو تاکید کے ساتھ بیان کیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی متواتر حدیثوں میں پوری تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے۔ اسلاف امت اور مختلف علاقوں کے فقہاء اس کے وجوب پر متفق ہیں۔

علامہ ابن حزم فرماتے ہیں:

اتفقت الأمة كلها على وجوب الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر بلا خلاف من أحد منهم[3]

امت ساری کی ساری اس بات پر متفق ہے کہ 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' واجب ہے اور اس میں کسی ایک کا بھی اختلاف نہیں ہے۔

---

[1] احیاء علوم الدین: ۲/ ۳۳۳
[2] احکام القرآن: ۲/ ۶۰۸
[3] الفصل فی الملل والاہواء والنحل: ۴/ ۱۷۱

امام نوویؒ لکھتے ہیں:

قد تطابق على وجوب الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر الكتاب والسنة وإجماع الأمة. وهو أيضاً من النصيحة التي هي الدين[1]

'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کے واجب ہونے پر کتاب و سنت اور اجماع امت سب ہی متحد ہیں۔ دین کو خیر خواہی کہا گیا ہے اور 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' اسی خیر خواہی کا جزو ہے۔

امام شوکانیؒ فرماتے ہیں:

وجوبه ثابت بالكتاب والسنة، وهو من أعظم واجبات الشريعة، وأصل عظيم من أصولها، وركن مشيد من أركانها وبه يكمل نظامها ويرتفع سنامها[2]

'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کا واجب ہونا کتاب و سنت سے ثابت ہے۔ یہ شریعت کا عظیم ترین فریضہ، اس کی بہت بڑی اصل اور اس کے ارکان میں ایک مضبوط رکن ہے۔ اسی سے شریعت کا نظام مکمل ہوتا ہے اور اس کی چوٹی اونچی ہوتی ہے۔

معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا امت مسلمہ کا فرض منصبی ہے۔ جو حکومت صحیح معنی میں اسلامی حکومت ہوگی وہ پوری طرح نگہ داشت کرے گی کہ امت اس فرض سے فاغل نہ ہونے پائے۔ امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' اور جہاد شریعت کے واضح ترین اور متواتر احکام ہیں۔ اگر امت کا کوئی طبقہ ان کو ترک کر دے تو اسلامی حکومت اس کے خلاف جنگ کرے گی۔

كل طائفة خرجت عن شريعة من شرائع الإسلام الظاهرة المتواترة فإنه يجب قتالها باتفاق أئمة المسلمين. و إن تكلمت لشهادتين فإذا أقروا بالشهادتين وامتنعوا عن

جو گروہ اسلامی حکومت کے کسی بھی واضح اور متواتر حکم سے خروج کر دے تو مسلمانوں کے تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ اس سے جنگ کی جائے گی، اگرچہ وہ توحید و رسالت کا اقرار کرتا ہو۔ مثلاً توحید و رسالت کے اقرار کے ساتھ اگر وہ پانچ وقت کی نماز چھوڑ دے

---

[1] شرح مسلم، المجلد الاول، الجزء ۲، ص ۲۰
[2] فتح القدیر: ۱/۳۳۷

الصلوات الخمس وجب قتالهم حتى يصلوا... و كذٰلک إن امتنعوا عن الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر وجهاد الكفار إلى أن يسلموا أو يؤدوا الجزية عن يدوهم صاغرون[1]

تو اس سے جنگ ضروری ہے تاآنکہ وہ نماز پڑھنے لگے... اسی طرح اگر وہ 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کو اور کفار سے اس حد تک جہاد کرتے رہنے کو ترک کردے کہ وہ یا تو اسلام لائیں یا چھوٹے بن کر اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں، تو اس سے جنگ کی جائے گی۔

ایک آیت کا صحیح مفہوم

یہ بحث نامکمل رہے گی اگر اس سلسلے کی ایک آیت کی تشریح نہ ہو۔ یہ آیت سورۂ مائدہ کے چودھویں رکوع میں ہے اور الفاظ یہ ہیں۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ (المائدۃ:۱۰۵)

اے ایمان والوتم اپنی فکر کرو۔ جو شخص بھی گم راہ ہوگا وہ تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا اگر تم راہِ راست پر ہوئے۔

اس آیت کے الفاظ سے بہ ظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' نہ صرف یہ کہ واجب نہیں ہے، بلکہ سرے سے اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ نجات کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ آدمی اپنی ذات کی فکر کرے اور اپنے نفس کی اصلاح وتربیت میں لگا رہے، لیکن مفسرین نے بالاتفاق اس مفہوم کو غلط قرار دیا ہے، کیوں کہ یہ مفہوم قرآن وحدیث کی بہت سی تصریحات سے ٹکراتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آیت میں ان ایمان والوں کو تسلی دی گئی ہے، جو کفر وشرک کے ماحول میں حق پر ثابت قدم تھے اور مسلسل دعوتِ دین کا کام انجام دے رہے تھے کہ اگر تمہارے عزم وحوصلہ نے شکست نہ مانی اور تم خدا کے دین کے ساتھ چمٹے رہے اور اس سے سرمو انحراف نہیں کیا تو مخالف قوتیں تمہیں قطعاً کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔ اس میں اس بات کا بالکل ذکر نہیں ہے

---

[1] مجموعہ فتاویٰ ابن تیمیہ: ۲۸۱/۴

کہ اہلِ ایمان امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض چھوڑ بھی دیں تو کامیاب و کامراں ہی ہوں گے۔ بعض مفسرین نے اس سلسلے میں ایک نکتہ کی بات کہی ہے۔ وہ یہ کہ قرآن نے یہ کہا ہے کہ اگر تم سیدھی راہ پر ہوئے تو راہِ راست سے بھٹکنے والے تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے اور انسان سیدھی راہ پر اسی وقت ہوتا ہے جب کہ وہ نہ صرف اپنی اصلاح کی فکر کرے، بلکہ دوسروں کی اصلاح کی بھی جدوجہد کرتا رہے۔ اس کوشش کو ترک کرنے کے بعد انسان اپنی ذات کی حد تک کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو راہِ ہدایت سے دور ہو جاتا ہے۔ یہ محض ایک نکتہ لطیف ہی نہیں، بلکہ اس میں قرآن و حدیث کی روح کھنچ کر آ گئی ہے۔ زمخشری اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

ليس المراد ترك الأمر بالمعروف و النهي عن المنكر، فإن من تركهما مع القدرة عليهما فليس بمهتد، و إنما هو بعض الضلال الذين فصلت الآية بينهم و بينه[1]

اس سے مراد امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ترک کرنا نہیں ہے، کیوں کہ جو شخص قدرت کے ہوتے ہوئے ان کو چھوڑ دے وہ ہدایت یاب نہیں ہے، بلکہ وہ ان گم راہ افراد میں سے ہے جن کے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے درمیان آیت نے دوری ڈال دیا ہے۔

علامہ ابو السعود کہتے ہیں:

و لاَ يتوهّمنّ أن فيه رخصة في ترك الأمر بالمعروف والنهى عن المنكر مع استطاعتهما كيف لاَ و من جملة الاهتداء أن ينكر على المنكر حسبما تفى به الطاقة[2]

یہ خیال ہرگز نہ ہو کہ اس میں استطاعت کے باوجود امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ترک کی اجازت ہے۔ یہ خیال غلط کیسے نہیں ہوگا جب کہ ہدایت یاب ہونے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اپنی طاقت کی حد تک منکر پر نکیر کی جائے۔

یہی بات جصاص نے ان الفاظ میں کہی ہے:

۱۔ الکشاف عن حقائق التنزیل: ۱/ ۳۸۶

۲۔ ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم: ۴/ ۱۹۹، ۲۰۰

ومن الاهتداء اتباع أمر الله في انفسنا وفي غيرنا فلا دلالة فيها إذًا على سقوط فرض الأمــر بالمعروف والنهي عن المنكر[1]	ہدایت یاب ہونے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اپنی ذات کے سلسلے میں بھی اور دوسروں کے سلسلے میں بھی خدا کے حکم کی اتباع کی جائے پس آیت میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فرض کے ساقط ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

حضرت ابوبکرؓ اپنے ایک خطبہ میں فرماتے ہیں کہ تم لوگ اس آیت کو رخصت سمجھتے ہو۔ اللہ کی قسم، اس نے اس سے زیادہ سخت آیت قرآن میں نازل نہیں کی[2]

ایک دوسری روایت میں ہے کہ تم لوگ اس آیت کو پڑھتے ہو اور اللہ تعالیٰ نے اسے جس موقع و محل میں استعمال کیا ہے اس کے برعکس موقع و محل میں استعمال کرتے ہو۔ میں نے رسولِ اکرمؐ کوفرماتے سنا ہے:

إن الناس إذا رأوا المنكر بينهم فلم ينكروه يوشك أن يعمّهم الله بعقابه[3]	جب لوگ اپنے درمیان منکر کو دیکھیں اور اس پر نکیر نہ کریں تو بعید نہیں کہ اللہ ان سب پر اپنا عذاب نازل کردے۔

غرض اس آیت سے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے وجوب کی نفی ہرگز نہیں ہوتی، بلکہ وہ اس کی فرضیت کو اور زیادہ محکم کرتی ہے۔قرآن وحدیث میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو دین کے ایک اہم فرض کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور آج تک کسی بھی صاحبِ علم نے اس کی اس حیثیت کا انکار نہیں کیا ہے۔ اگر ہم اپنے اندر اللہ تعالیٰ کے دین کو صحیح حالت میں دیکھنا چاہتے ہیں اور ساتھ ہی اسے دنیا میں غالب و سربلند کرنے کے آرزومند ہیں تو اس کی صورت سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ معروف کا حکم دین اور منکر سے روکیں۔ اللہ تعالیٰ کا ہم سے یہی مطالبہ ہے اور یہی اس کے پیغمبروں کا راستہ ہے۔ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا۔

---

[1] احکام القرآن:۲/ ۵۹۲ [2] جامع البیان فی تفسیر القرآن:۷/ ۶۰

[3] مسند احمد:۱/ ۱۸۔ترمذی، کتاب الفتن، باب ماجاء فی الامر بالمعروف والنھی عن المنکر ورواہ ایضاً ابوداؤد، وابن ماجہ، والنسائی وغیرہم

فرضِ کفایہ یا فرضِ عین

اس بات سے کسی بھی صاحبِ علم کو اختلاف نہیں ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ، فرض ہے۔ ہاں یہ سوال ضرور اختلافی رہا ہے کہ اس فرض کی نوعیت کیا ہے؟ آیا یہ فرضِ عین ہے یا فرضِ کفایہ؟ اس سوال پر غور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہم ان دونوں کے فرق کو سمجھ لیں۔ اس فرق کو علامہ ابن بدران حنبلی نے بہت اچھے انداز میں بیان کیا ہے۔ ہم یہاں اس کا خلاصہ اپنے الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

فرضِ کفایہ اور فرضِ عین کا فرق

فرضِ کفایہ اور فرضِ عین دونوں ہی میں تعبدیت اور مصلحت پائی جاتی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ فرض کفایہ میں شریعت کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ ہر شخص کو اس کی تکلیف دی جائے، بلکہ اس سے شریعت صرف یہ چاہتی ہے کہ اس میں جو مصلحت پائی جاتی ہے وہ حاصل ہوجائے۔ لہٰذا اگر کسی ایک شخص کے ذریعے بھی یہ مصلحت حاصل ہوجاتی ہے تو مقصود پورا ہوجاتا ہے اور دوسروں کو اس کی تکلیف دینے کی ضرورت نہیں رہتی، اس کے برعکس فرض عین میں مقصد یہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو اس کا حکم دیا گیا ہے ان میں سے ہر ایک اسے بجالائے۔"[1]

مولانا عبد العلی انصاری (بحر العلوم) فرماتے ہیں:

---

[1] المدخل الی مذہب الامام احمد بن حنبل، ص ۱۰۳، ۱۰۴

المقصود من الإيجاب قد يكون إتعاب المكلّف بالاشتغال به كما في الأركان الأربعة وقد يكون المقصود شيئًا آخر يجب لأجله ما يحصل المقصود بحصوله فإذا حصل المقصود لا يبقى الواجب واجبًا كالجهاد فإنه إنما وجب لإعلاء كلمة اللّٰه تعالیٰ، فإذا أتى به البعض حصل الإعلاء، وسقط الوجوب[1]

کسی چیز کے واجب قرار دینے سے مقصود کبھی یہ ہوتا ہے کہ مکلّف کو اس کی بجا آوری کی مشقت میں مبتلا رکھا جائے، جیسا کہ ارکان اربعہ (نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ) میں ہے۔ کبھی مقصود کوئی دوسری ہی چیز ہوتی ہے جس کے لیے کوئی ایسا عمل واجب ہوتا ہے، جس کے کرنے سے وہ مقصود حاصل ہوجائے جیسے کہ جہاد ہے۔ یہ واجب ہوا ہے اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے۔ اگر بعض اشخاص جہاد کا فرض انجام دے دیں تو اعلاء کلمۃ اللہ حاصل ہوجائے گا اور وجوب ساقط ہوجائے گا۔

فرض کفایہ سب پر فرض ہے یا بعض پر؟

فرض کفایہ اور فرض عین کے اس فرق پر جہاں علماء کا اتفاق ہے وہاں ان کے درمیان یہ اختلاف ہے کہ فرض کفایہ کی نوعیت کیا یہ ہے کہ وہ سب پر فرض ہوتا ہے اور بعض کے ادا کرنے سے سب سے ساقط ہو جاتا ہے یا وہ صرف بعض ہی افراد پر فرض ہوتا ہے؟ علماء کی اکثریت نے پہلے نقطۂ نظر کو ترجیح دی ہے جب کہ امام رازی، علامہ ابن سبکی اور امام شاطبی جیسے محققین دوسرے نقطۂ نظر کے قائل ہیں۔ دوسرے نقطۂ نظر کے قائلین میں یہ اختلاف ہے کہ آیا وہ بعض، جن پر فرض کفایہ کی ذمے داری عائد ہوتی ہے، متعین ہیں یا غیرِ متعین؟ ابن سبکی نے لکھا ہے کہ مسلک مختار یہ ہے کہ وہ غیر متعین ہیں، کیوں کہ ان کے متعین ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ ویسے ایک خیال یہ بھی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک متعین ہیں۔ البتہ اس فرض کو، خواہ یہ متعین افراد ادا کریں یا

---

[1] فواتح الرحموت بشرح مسلم الثبوت، مطبوع مع المستصفٰی للغزالی: ۱/ ۶۳

کوئی دوسرا فرد، ان کی ذمے داری ساقط ہوجائے گی۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ فرض کفایہ جن بعض افراد پر فرض ہے وہ وہی ہیں جو اسے انجام دیں[1]

امام شاطبی فرماتے ہیں کہ فرض کفایہ ان لوگوں پر فرض ہوتا ہے جو اس کو انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں[2]

امر بالمعروف ونہی عن المنکر جمہور کے نزدیک فرض کفایہ ہے

جمہور اُمت کے نزدیک امر بالمعروف ونہی عن المنکر فرض کفایہ ہے۔ بعض لوگوں نے اسے فرض عین بھی کہا ہے۔

علامہ سید محمود آلوسی کہتے ہیں:

إن العلماء اتفقوا على أن الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر من فروض الكفاية، ولم يخالف ذلک إلا النزر[3]

علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر فرض کفایہ ہے۔ اس سے صرف چند لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جمہور میں وہ لوگ بھی شامل ہیں، جن کی رائے میں فرض کفایہ سب پر فرض ہوتا ہے اور بعض کے ادا کرنے سے سب سے ساقط ہو جاتا ہے اور وہ لوگ بھی شامل ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ فرض کفایہ بعض ہی افراد پر فرض ہوتا ہے۔

جمہور کی اکثریت کا نقطۂ نظر ــــ پہلی دلیل

علماء کی اکثریت نے جو نقطۂ نظر اختیار کیا ہے۔ یہاں ان کے دلائل پیش کیے جارہے ہیں۔ ان کی پہلی دلیل قرآن کی یہ دو آیتیں ہیں:

۱۔ دیکھئے جمع الجوامع مع شرح الجلال المحلی وحاشیہ البنانی: ۱/۱۸۶، ۱۸۷

۲۔ امام شاطبی کا نقطۂ نظر ان ہی کے الفاظ میں آگے چل کر ہم بیان کریں گے۔

۳۔ روح المعانی، المجلد الثانی، الجزء ۴، ص ۲۳۸

۱- وَلْتَكُنْ مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (آل عمران:۱۰۴)

تم میں ایک جماعت ضرور ایسی ہونی چاہیے جو خیر کی طرف بلائے، معروف کا حکم دے اور منکر سے منع کرے۔

۲- كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (آل عمران:۱۱۰)

تم بہترین امت ہو جسے انسانوں کی اصلاح کے لیے وجود میں لایا گیا ہے۔ تم معروف کا حکم دیتے اور منکر سے منع کرتے ہو۔

ابن العربی مالکی کہتے ہیں کہ "یہ دونوں آیتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر فرض کفایہ ہے۔"[۱] کیوں کہ پہلی آیت یہ کہتی ہے کہ امت میں ایک ایسی جماعت کا وجود ضروری ہے جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض انجام دے اور دوسری آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ پوری امت کے کرنے کا کام ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر گو پوری امت پر فرض ہے، لیکن بعض افراد کے ادا کرنے سے وہ کل افرادِ امت سے ساقط ہو جاتا ہے۔

اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ پہلی آیت میں حرف 'من' تبعیض کے لیے ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا انجام دینا امت کے ہر فرد کے لیے ضروری نہیں ہے، بلکہ یہ صرف بعض افراد پر واجب ہے۔ چناں چہ زمخشری اور قاضی بیضاوی کہتے ہیں۔

من للتبعيض، لأن الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر من فروض الكفاية[۲]

'من' تبعیض کے لیے ہے، کیوں کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا شمار فروض کفایہ میں ہوتا ہے۔

---

۱ احکام القرآن:۱/ ۲۹۲

۲ الکشاف عن حقائق التنزیل:۱/ ۳۸۸۔ اس استدلال کے بارے میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ 'من' تبعیض کے لیے ہونے کی یہ عجیب دلیل ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر فرض کفایہ ہے۔ کیوں کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض کفایہ ہونا خود زیر بحث ہے اور وہ اسی وقت ثابت ہوسکتا ہے جب کہ قواعد کی رو سے یہ ثابت کیا جائے کہ 'من' یہاں تبعیض ہی کے لیے ہے۔

اسی آیت کے ذیل میں ابوبکر جصاص لکھتے ہیں:

و حقيقته تقتضي البعض دون البعض، فدل على أنه فرض على الكفاية إذا قام به بعضهم سقط عن الباقين[1]

اس کی حقیقت (امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے) صرف بعض افراد کا تقاضا کرتی ہے، سب لوگوں کا نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ فرض علی الکفایۃ ہے۔ جب اس کام کو بعض افراد انجام دے دیں گے تو بقیہ لوگوں سے ذمے داری ساقط ہوجائے گی۔

اسی بات کو امام غزالیؒ نے زیادہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ لکھا ہے:

فيها (أي الآية) بيان أنه فرض كفاية لا فرض عين، وأنه إذا قام به أمة سقط الفرض عن الآخرين إذ لم يقل: كونوا كلّكم آمرين بالمعروف بل قال: و لتكن منكم أمة، فإذًا مهما قام به واحد أو جماعة سقط الحرج عن الآخرين.[2]

آیت میں اس بات کا اظہار ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر فرض کفایہ ہے، فرض عین نہیں ہے۔ اور یہ کہ اگر ایک جماعت (بھی) اس پر عمل کرے تو دوسرے تمام افراد سے وہ ساقط ہوجائے گا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم سب کے سب معروف کا حکم دینے والے بن جاؤ، بلکہ یہ فرمایا کہ تم میں ضرور ایک جماعت (اس کام کے لیے) ہونی چاہیے۔ پس جب کسی ایک فرد یا کسی ایک جماعت کے ذریعہ یہ فرض انجام پاجائے تو دوسروں سے ذمہ داری ساقط ہوجائے گی۔

دوسری دلیل

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فرض کفایہ ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ یہ کام بڑی اونچی صلاحیت کا تقاضا کرتا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کو شریعت کا وسیع علم ہو، وہ نفسیات شناس اور دور اندیش ہو، موقع و محل کی نزاکت کو سمجھتا ہو اور یہ جانتا ہو کہ کس شخص کے ساتھ کس نوعیت کا رویہ اختیار کیا جائے۔ ظاہر ہے، اس کی صلاحیت

---

[1] احکام القرآن: ۲/ ۳۷ [2] احیاء علوم الدین: ۲/ ۳۳۴

ہر ایک میں نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ فرض عین نہیں ہوسکتا۔ زمخشری کہتے ہیں:

لأنهٗ لاَ يصلح الّا من علم المعروف والمنكر، وكيف يرتب الأمر في إقامته، وكيف يباشر، فإن الجاهل ربما نهى عن المعروف وأمر بمنكر، و ربما عرف الحكم في مذهبه، و جهله في مذهب صاحبه فنهاه عن غير منكر، وقد يغلظ في موضع اللين و يلين في موضع الغلظة، وينكر على من لاَ يزيده إنكاره إلا تمادياً أو علىٰ من الْإنكار عليه عبث[1]

کیوں کہ اس کام کا وہی شخص اہل ہوسکتا ہے جو معروف و منکر کو جانتا ہو اور یہ بھی جانتا ہو کہ کس ڈھنگ سے اس کو قائم کرے اور کیسے اس کو انجام دے، کیوں کہ جاہل شخص بسا اوقات معروف سے روک دے گا اور منکر کا حکم دینے لگے گا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے فقہی مسلک میں تو ایک چیز کے حکم کو جانتا ہو اور جس سے معاملہ ہے اس کے مسلک میں اس کا جو حکم ہے اس سے ناواقف ہو۔ لہٰذا مخاطب کے مسلک کے لحاظ سے منکر کے نہ ہوتے ہوئے بھی وہ اسے منع کردے گا۔ اسی طرح کبھی نرمی کی جگہ سختی اور سختی کی جگہ نرمی کرے گا اور کبھی ایسے شخص پر نکیر کر گزرے گا جس کو نکیر کرنا اسے سرکشی میں اور بڑھا دے گا، یا ایسے شخص پر نکیر کرنے لگے گا جس پر نکیر کرنا بالکل بے سود ہوگا۔

قائلینِ فرض عین کے دلائل

جو لوگ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو فرض عین کہتے ہیں وہ اس دلیل کو نہیں مانتے کہ آیت 'وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ' میں اس کے فرض کفایہ ہونے کا بیان ہے۔ ان کے نزدیک آیت میں 'من' تبعیض کے لیے نہیں آیا، بلکہ وہ ٹھیک اسی طرح بطور مجاز استعمال ہوا ہے، جس طرح وہ قرآن کی ایک دوسری آیت 'يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ' میں استعمال ہوا ہے[2] ظاہر ہے اس کا یہ ترجمہ صحیح نہیں ہوگا کہ خدا تمہارے بعض گناہوں کو معاف کرے گا، بلکہ صحیح ترجمہ یہ ہوگا کہ خدا تمہارے گناہوں کو معاف کردے گا۔ گویا ان کے نقطۂ نظر سے آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تم کو لازماً ایک ایسی امت ہونا چاہیے، جو

---

[1] الکشاف عن حقائق التنزیل: ۱/ ۳۸۹ [2] جصاص، احکام القرآن: ۲/ ۳۷،۳۸

معروف کا حکم دے اور منکر سے منع کرے[1]

رہی یہ بات کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض صرف اہلِ علم ہی انجام دے سکتے ہیں تو یہ صحیح نہیں ہے۔ ہر مسلمان دین کی بنیادی باتوں سے واقف ہوتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ نماز اور روزہ فرض ہے اور زنا اور شراب حرام ہے۔ ہم یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ایک شخص مسلمان بھی ہو اور وہ ان موٹی موٹی باتوں سے ناواقف بھی ہو۔ لہٰذا ان کے سلسلے میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض انجام دینا ہر مسلمان کے امکان میں ہے، اس کے لیے کسی خاص علمی قابلیت کی ضرورت نہیں ہے۔ بلاشبہ عام آدمی علمی مسائل اور تحقیقاتی امور میں نہ رائے زنی کرسکتا ہے اور نہ اسے کرنا چاہیے، لیکن بالکل کھلے ہوئے معروفات و منکرات کے بارے میں جس طرح ایک عالم امر و نہی کا فرض انجام دے سکتا ہے، اسی طرح ایک جاہل کے لیے بھی اس ذمے داری کا ادا کرنا دشوار نہیں ہے۔

ایک ضمنی بحث کے ذیل میں علامہ عبدالقادر عودہ شہید کہتے ہیں:

إن وضع واجب الأمر بالمعروف و النهي عن المنكر على عاتق الجاهل لن يؤدي إلى الاضرار التي يتوقعونها لأن الجاهل بطبيعة الحال لاَ يأمرولاَ ينهى الاّ ماهو ظاهر لاَ خلاف عليه كأداء الصلوٰة و النهي عن السرقة والزنا.[2]

جاہل کی گردن پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے وجوب کی ذمہ داری رکھ دینے سے وہ نقصان نہیں پہنچتا جس کا ان لوگوں کو اندیشہ ہے، کیوں کہ جاہل قدرتی طور پر صرف ان ہی چیزوں کا حکم دے گا یا منع کرے گا جو بالکل ظاہر ہیں اور جن میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جیسے نماز کی ادائیگی کا حکم دینا یا چوری اور زنا سے منع کرنا۔

---

[1] اس استدلال کی خامی بالکل واضح ہے۔ پوری امت پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے واجب ہونے سے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ امت کے ہر فرد پر بھی واجب ہوجائے، جو لوگ اسے فرض کفایہ کہتے ہیں وہ بھی اسی کے قائل ہیں کہ وہ پوری امت پر فرض ہے (بعض لوگوں کو اس سے اختلاف بھی ہے) البتہ وہ اس کے سقوط کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ بعض افراد کے ادا کرنے سے وہ پوری امت سے سابق ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے اس استدلال سے اس دعوے کی تردید نہیں ہوتی۔

[2] التشریع الجنائی الاسلامی: ۱/ ۴۹۵

مفتی شیخ محمد عبدہ کی رائے میں 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' فرض عین ہے۔ وہ آیت 'وَلْتَكُنْ مِّنكُمْ أُمَّةٌ' کی تشریح میں فرماتے ہیں:

''جس مفروضہ پر قرآن کے اس خطاب کو محمول کیا جانا چاہیے، وہ یہ ہے کہ مسلمان ان چیزوں سے ناواقف نہیں ہوگا، جو اس پر واجب ہیں کیوں کہ اس کو (شریعت کے) جاننے اور معروف و منکر کے درمیان فرق کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں (معروف و منکر کا معلوم کرنا کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے کیوں کہ) معروف سے مراد جب وہ مطلقاً بولا جائے تو ایسی چیزیں ہوتی ہیں جن کو انسان کی عقل اور نیک طبائع جانتی ہیں۔ اس کے برعکس منکر ان چیزوں کو کہا جاتا ہے جن کو عقل انسانی اور سلیم طبیعتیں ناپسند کرتی ہیں۔ اس کے جاننے کے لیے حاشیہ ابن عابدین، فتح القدیر اور مبسوط کے پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی رہنمائی کے لیے ــــ سلامتی فطرت کے ساتھ ــــ اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت کافی ہے، جو تواتر اور مسلسل عمل کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے۔ یہ ایسی چیز ہے کہ کسی بھی شخص کو اس سے ناواقف رہنے کی (شرعاً) کوئی گنجائش نہیں ہے، (کیوں کہ) مسلمان تو اسی وقت مسلمان ہوتا ہے جب کہ وہ اس کو جانتا ہو۔ جو لوگ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے عموم کا انکار کرتے ہیں وہ (گویا) اس بات کو جائز سمجھتے ہیں کہ مسلمان اس طرح جاہل رہے کہ نہ تو وہ خیر و شر کے فرق کو جانتا ہو اور نہ معروف و منکر میں تمیز کرسکتا ہو۔ ظاہر ہے، دینی نقطہ نظر سے اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔''[1]

اسی بحث کے ذیل میں ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:

فريضة الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر آكد من فريضة الحج، و لم يشترط فيها الإستطاعة لأنها	امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ، فریضہ حج سے بھی زیادہ موکد ہے، کیوں کہ حج کے لیے استطاعت شرط ہے اور اس کے لیے نہیں

[1] تفسیر القرآن الحکیم (المنار): ۴/ ۳۷

مستطاعة دائماً[ا] ہے۔ اس پر ہر حال میں عمل ہوسکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے کبھی اجتہاد کی بھی ضرورت ہوگی۔ اس کی ذمہ داری اہل علم پر عائد ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک عام آدمی کا دوسروں کو دین کی بنیادی باتیں بتانا بھی امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہی کی تعریف میں آتا ہے۔ یہ کام کبھی علمی انداز میں ہوگا اور کبھی بالکل سادہ طریقہ سے انجام پائے گا۔ اس کے لیے کبھی قرآن و حدیث کے وسیع مطالعہ اور دینی علوم میں گہری بصیرت مطلوب ہوگی اور کبھی دین کی مبادیات اور اس کی اصولی تعلیمات کا علم کافی ہوگا۔ اس کام میں ایسے مسائل بھی سامنے آئیں گے جو اپنے حل کے لیے اونچے درجے کی علمی صلاحیت اور حالاتِ زمانہ سے غیر معمولی واقفیت کا تقاضا کریں گے اور ایسے مسائل پر بھی گفتگو ہوگی کہ تھوڑے سے علم وفہم سے ان کا تصفیہ ہوسکے گا۔ لہٰذا یہ بات صحیح نہیں ہے کہ جو لوگ اعلیٰ پیمانے پر یہ کام نہ کرسکتے ہوں وہ اسے بالکل چھوڑ بیٹھیں اور اپنے حدود کے اندر بھی اسے انجام نہ دیں۔

اکثریت کے نقطۂ نظر پر اعتراض

ہمارے علماء کی اکثریت کا دعویٰ یہ ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر پوری امت پر واجب ہے، لیکن اگر بعض افراد بھی اسے ادا کردیں تو پوری امت سے اس کا وجوب ساقط ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ہر شخص میں اس کی صلاحیت نہیں ہوتی، اس لیے وہ ہر ایک پر واجب نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہ دلیل اپنے دعوے کی آپ تردید ہے۔ کیوں کہ شریعت کا کوئی بھی حکم کسی شخص پر اسی وقت واجب ہوتا ہے جب کہ وہ اس کو ادا کرسکتا ہو۔ اگر کسی میں اس کے ادا کرنے کی استطاعت ہی نہیں ہے تو وہ اس پر واجب بھی نہیں ہے۔ اس اصول کے تحت امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو بھی

ا تفسیر القرآن الحکیم (المنار): ۴/ ۳۵

پوری امت پر واجب نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اسے صرف ان ہی افراد پر واجب ہونا چاہیے جو اس کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جیسا کہ امام شاطبی اور بعض دوسرے اہل علم کا خیال ہے کہ فرض کفایہ پوری جماعت پر فرض نہیں ہے، بلکہ ان لوگوں پر فرض ہے جو اس کو کر سکتے ہیں۔ چناں چہ علامہ شاطبی فرماتے ہیں:

إن الطلب وارد على البعض دون البعض، كيف كان، ولكن على من فيه اهلية القيام بذلك الفعل المطلوب، لا على العموم جميعا	مطالبہ بعض سے ہے۔ یہ نہیں کہ بعض جیسے بھی ہوں، بلکہ ان لوگوں سے ہے جن میں فعل مطلوب کو پورا کرنے کی صلاحیت ہے نہ کہ علی العموم سب سے۔

اس کی ایک دلیل ان کے نزدیک یہی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی آیت ہے، جس میں قرآن نے کہا ہے کہ ”تم میں ایک گروہ لازماً اس کام کے لیے ہونا چاہیے۔“ اس سے معلوم ہوا کہ وہ پوری جماعت پر نہیں، بلکہ صرف ایک گروہ پر واجب ہے۔ اس طرح کی بعض اور آیتیں پیش کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

وفي القرآن من هذا النحو أشياء كثيرة ورد الطلب فيها نصا على البعض لاَ على الجميع[1]	قرآن میں اس قسم کی بہت سی چیزیں ہیں جن میں مطالبہ صراحتاً بعض سے ہے نہ کہ تمام سے۔

امام رازی آیت 'وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ' کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر علماء کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں: پہلی وجہ یہ کہ اس کے لیے علم کی ضرورت ہے، دوسری وجہ ان کے الفاظ میں یہ ہے:

إنا أجمعنا على أن ذلك واجب على سبيل الكفاية بمعنى أنه متى قام به البعض سقط عن الباقين، و إذا كان كذلك كان المعنى:	ہم نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر فرض کفایہ ہے، بایں معنی کہ جب اس پر بعض اشخاص عمل کریں تو باقی لوگوں سے وہ ساقط ہوجائے گا۔ جب یہ

---

[1] الموافقات فی اصول الشریعۃ: ۱/۱۷۶

ليقم بذلک بعضکم فكان في الحقيقة هذا إيجاباً على البعض، لاَ على الكل[1]	بات ہے تو (آیت کا) مطلب یہ ہوا کہ تم میں سے بعض کو لازماً یہ کام انجام دینا چاہیے۔ پس یہ حقیقت میں بعض پر واجب کرنا ہے نہ کہ سب پر۔

اعتراض کا جواب

یہ قریب قریب وہی نقطۂ نظر ہے جو امام شاطبی نے اختیار کیا ہے۔ یعنی یہ کہ فرض کفایہ ان ہی لوگوں پر فرض ہوتا ہے، جو اس کے کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ فرض کفایہ کو پوری امت پر فرض سمجھنے والوں نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ سب ہی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ فرض کفایہ اگر ادا ہونے سے رہ جائے تو امت پوری کی پوری گناہ گار ہوگی۔ سوال یہ ہے کہ اگر فرض کفایہ کا انجام دینا امت کے صرف بعض ہی افراد کے لیے ضروری ہے تو اس کے ادا نہ ہونے سے پوری امت گناہ گار کیوں ہوتی ہے؟[2]

یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ فرض کفایہ کی تکمیل کا مطالبہ قرآن میں صرف بعض افراد سے کیا گیا ہے، بلکہ اس نے اس کا مطالبہ پوری امت سے کیا ہے۔ مثال کے طور پر جہاد فرض کفایہ ہے، لیکن اس کا حکم ان الفاظ میں دیا گیا ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ (تم پر جنگ فرض کی گئی ہے)۔ ظاہر ہے ان الفاظ کا مخاطب امت کا کوئی ایک گروہ نہیں، بلکہ پوری امت ہے۔[3]

بلاشبہ قرآن کی آیت وَلْتَكُنْ مِّنكُمْ أُمَّةٌ الخ میں یہ کہا گیا ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے ایک جماعت کا ہونا ضروری ہے، لیکن اس سے یہ ثابت

---

[1] مفاتیح الغیب (التفسیر الکبیر) المجلد الرابع، الجزء ۸، ص ۱۴۶

[2] بعض حضرات اس کے بھی قائل نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک فرض کفایہ کے ترک سے وہی لوگ گناہ گار ہوں گے جو اس کے کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ (دیکھئے الموافقات: ۱/۱۷۷)

[3] دونوں طرف کے دلائل کے لیے ملاحظہ ہو: مسلم الثبوت اور اس کی شرح فواتح الرحموت، مطبوعہ مصر مع المستصفی للغزالی، جلد ۱، ص ۶۳-۶۶، روح المعانی، المجلد الاول، جزء ۲، ص ۵۰۰

نہیں ہوتا کہ وہ پوری امت پر فرض نہیں ہے۔ کیوں کہ اگر اللہ تعالیٰ اس جماعت کا تعین فرما دیتا تو ہم سمجھتے کہ یہ کام صرف اسی پر فرض ہے، لیکن اس نے کسی جماعت کا تعین نہیں کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پوری امت اس کی مخاطب ہے۔ لیکن چوں کہ اس پر بعض افراد کا عمل کرنا بھی کافی ہے، اس لیے فرمایا کہ تم میں اس کام کے لیے ایک جماعت ہونی چاہیے۔ بیضاوی کہتے ہیں:

خاطب الجميع، و طلب فعل بعضهم ليدل على أنه واجب على الكل حتى لو تركوه رأساً أثموا جميعاً، ولكن يسقط بفعل بعضهم. وهكذا كل ماهو فرض كفاية[1]

خطاب تو کیا ہے سب سے، لیکن مطالبہ کیا ہے ان میں سے بعض کے عمل کا، تاکہ اس بات پر دلالت کرے کہ وہ سب پر واجب ہے۔ اگر وہ اس کو بالکل چھوڑ دیں تو سب کے سب گنہ گار ہوں گے۔ البتہ وہ ان میں سے بعض کے انجام دینے سے ساقط ہوجائے گا۔ یہی حال ہر اس عمل کا ہے جو فرض کفایہ ہے۔

اسی بات کو شیخ اسماعیل حقی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

إن 'من' في قولـه (مِنكُم) للتبعيض وتوجيـه الخطاب إلى الكل مع إسناد الدعوة إلى البعض لتحقيق معنى فرضيتها على الكفاية، وأنها واجبة على الكل، لكن بحيث إن اقامها البعض سقطت عن الباقين، و لو أخلّ بها الكل أثموا جميعاً لاَ بحيث يتحتّم على الكل إقامتها[2]

مِنکُم میں مِن تبعیض کے لیے ہے۔ دعوت کے فریضے کو صرف بعض افراد سے متعلق قرار دینے کے باوجود، خطاب کا رخ سب کی طرف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا فرض کفایہ ہونا متحقق ہوجائے اور یہ واضح ہوجائے کہ دعوت الی الخیر سب پر واجب ہے، لیکن اس طرح کہ اگر اس کو بعض افراد بھی ادا کردیں تو بقیہ لوگوں سے یہ ذمہ داری ساقط ہوجائے گی، ہاں اگر سب ہی اسے چھوڑ بیٹھیں تو سب کے سب گنہ گار ہوں گے، یہ نہیں کہ تمام لوگوں پر دعوت الی الخیر کا انجام دینا فرض ہے۔

---

[1] انوار التنزیل و اسرار التاویل: ۱/ ۱۷۴ [2] روح البیان: ۱/ ۳۵۲

صحیح نقطۂ نظر

ہم نے دونوں طرف کے دلائل اختصار کے ساتھ بیان کردیے ہیں۔ ان دلائل پر اعتراضات بھی ہوئے ہیں اور ان کے جوابات بھی دیے گئے ہیں، لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ نہ تو یہ خامیوں سے بالکل پاک ہیں اور نہ ان سے یہ مسئلہ صحیح نہج پر حل ہوسکا ہے۔ اس کا معقول حل بعض دوسرے اہلِ علم نے پیش کیا ہے۔ ان ہی میں امام شاطبی کی کتاب 'الموافقات فی اصول الشریعۃ' کے شارح اور تعلیقات نگار شیخ عبد اللہ دراز بھی ہیں۔ اس سے قبل امام شاطبی کے نقطۂ نظر کا ذکر آچکا ہے۔ ان کے نزدیک فرض کفایہ صرف ان ہی افراد پر فرض ہوتا ہے جو اس کو انجام دینے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ اس کی تائید میں انھوں نے آیت 'وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ' اور بعض دوسری آیتیں پیش کی ہیں۔ شیخ عبد اللہ دراز اس سے اختلاف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

هذه الآيات لا تدل على أن الطلب متوجه إلى البعض بل للمانع ان يقول المعنى يجب الجميع أن ينهضوهم لذلك، ويعدوهم له، ويعاونوهم بكل الوسائل، ليتحقق هذا المهم من المصلحة، فإن لم يحصل هذا المهم من المصلحة أثم جميع المكلفين المتأهل وغيره[1]

یہ آیتیں اس بات پر دلالت نہیں کرتیں کہ مطالبہ صرف بعض سے ہے۔ اس لیے کہ اس سے اختلاف کرنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ سب پر واجب ہے کہ اس کام کی انجام دہی کے لیے بعض کو کھڑا کریں، اس کے لیے ان کو تیار کریں اور ہر طرح ان کی معاونت کریں، تاکہ مصلحت کی یہ مہم متحقق ہوجائے۔ کیوں کہ مصلحت کی یہ مہم اگر انجام نہ پائی تو اہلیت رکھنے والے اور نہ رکھنے والے سارے کے سارے مخاطبین گنہ گاروں گے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ خود امام شاطبی اپنی بحث کے آخر میں فرماتے ہیں کہ

---

[1] الموافقات فی اصول الشریعۃ: ۱/۱۷۶ (حاشیہ نمبر ۲)

اگر ایک خاص پہلو سے غور کیا جائے تو یہ بحث کوئی حقیقی بحث نہیں رہتی اور وہ پہلو وہی ہے جسے شیخ عبداللہ دراز نے پیش کیا ہے۔ ان کے الفاظ دیکھئے:

قد يصح أن يقال: إنه واجب على الجميع على وجه من التجوز، لأنّ القيام بذلك الفرض قيام بمصلحة عامة، فهم مطلوبون بسدها على الجملة، فبعضهم هو قادر عليها مباشرة وذلك من كان أهلالها، والباقون و إن لم يقدروا عليها، قادرون على إقامة القادرين، فمن كان قادراً على الولاية فهو مطلوب بإقامتها، ومن لاَ يقدر عليها مطلوب بأمر آخر و هو إقامة ذلك القادر و إجباره على القيام بها، فالقادر إذاً مطلوب بإقامة الفرض، وغير القادر مطلوب بتقديم ذلك القادر إذ لَا يتوصل إلى قيام القادر إلَا بالْإقامة من باب ما لاَيتم الواجب إلا به، وبهذا الوجه يرتفع مناط الخلاف، فلايبقى للمخالفة وجه ظاهر[1]

بطور جواز یہ کہنا بھی صحیح ہوگا کہ دعوت خیر کا کام سب پر واجب ہے، کیوں کہ اس فرض کو انجام دینا حقیقت میں دین کی ایک عمومی مصلحت کو پورا کرنا ہے اور اس کے پورا کرنے کا مطالبہ فی الجملہ سب ہی سے ہے اور وہ اس طرح کہ ان میں سے بعض تو بذاتِ خود اسے انجام دینے کی قدرت رکھتے ہیں، اور یہ وہ لوگ ہیں جن میں اس کی اہلیت ہوتی ہے، بقیہ لوگ اگرچہ بذات خود اسے انجام دینے کی قدرت نہیں رکھتے، لیکن قدرت رکھنے والوں کو اس کام کے لیے آمادہ اور تیار کرنے کی طاقت ضرور رکھتے ہیں۔ پس جو شخص اس کو بذاتِ خود انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہے اس سے تو اس پر عمل کا مطالبہ ہے اور جو خود اس پر قادر نہیں ہے اس سے ایک دوسری چیز کا مطالبہ ہے اور وہ ہے قدرت رکھنے والے شخص کو اس کے لیے تیار کرنا اور اس کی انجام دہی پر مجبور کرنا۔ غرض قدرت رکھنے والے سے تو اقامتِ فرض کا مطالبہ ہے اور قدرت نہ رکھنے والے سے قدرت رکھنے والے کو آگے بڑھانے کا مطالبہ۔ جب قدرت رکھنے والا اسی وقت کھڑا ہو کہ اسے کھڑا کیا جائے تو اسے کھڑا کرنا ضروری ہے۔ یہ گویا اس طرح کی چیز ہے کہ واجب کی تکمیل کے لیے جو چیز ضروری ہوتی ہے وہ بھی واجب ہوجاتی ہے۔ اس طریقے سے اختلاف کی بنیاد ختم ہوجاتی ہے اور مخالفت کا کوئی واضح سبب نہیں رہتا۔

---

[1] الموافقات فی اصول الشریعۃ: ۱/۱۷۸-۱۷۹

امام شاطبی کے اس بیان سے جس طرح یہ سوال حل ہو جاتا ہے کہ فرض کفایہ پوری امت پر فرض ہے یا اس کے بعض افراد پر، اسی طرح اس سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فرض کفایہ یا فرض عین ہونے کی بحث بھی ختم ہوجاتی ہے۔ مفتی شیخ محمد عبدہ نے اسی نہج سے اس مسئلہ پر غور کیا ہے۔ ان کے نزدیک امر بالمعروف و نہی عن المنکر فرض عین ہے۔ جو لوگ اس کو فرض کفایہ کہتے ہیں ان کی ایک دلیل (جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں) یہ ہے کہ قرآن نے اس کام کے لیے 'وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ الخ' کہا ہے اور 'من' یہاں تبعیض کے لیے ہے۔ شیخ محمد عبدہ نے ان کے اس دعوے کو مان کر آیت کی اس انداز میں تشریح کی ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر فرض کفایہ ہوتے ہوئے بھی فرض عین کی سی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ فرماتے ہیں: 'من' کو تبعیض کا ماننے کے بعد آیت کا مطلب یہ ہے کہ 'تم میں ایک ایسی ممتاز امت، ہونی چاہیے جو دعوت الخیر اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فرض کو لے کر کھڑی ہو۔ اس حکم کے مخاطب تمام اہلِ ایمان ہیں، کیوں کہ وہی اس بات کے مکلّف ہیں کہ اپنے میں سے ایک ایسی امت کا انتخاب کریں جو اس فرض کو انجام دے۔ گویا دو طرح کے فرائض ہیں: ایک وہ جو تمام مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے اور دوسرا وہ جو اس 'امت' پر عائد ہوتا ہے جسے وہ دعوت کے لیے منتخب کریں۔ یہ حقیقت اسی وقت واضح ہوگی جب کہ ہم لفظ 'امت' کو، جسے قرآن نے یہاں استعمال کیا ہے، ٹھیک سے سمجھ لیں۔ 'امت' کے معنی محض جماعت کے نہیں ہیں، جیسا کہ کہا جاتا ہے، کیوں کہ جماعت کے لفظ میں عموم ہے اور اس کے مقابلے میں 'امت' کا لفظ خاص ہے۔ اس سے مراد ایسے افراد کا مجموعہ ہے جن میں کوئی رابطہ ہو اور جن کے درمیان ایسی وحدت ہو کہ وہ ایک جسم کے اعضاء بن جائیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ دعوت کے اس کام کے لیے امت کی تشکیل کے ذمہ دار تمام مسلمان ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو وجود میں لانے، اس کو اپنے کام میں مدد دینے اور اس کی رفتار کی نگرانی کرنے میں حسبِ استطاعت ہر شخص کے ارادے اور عمل کا شامل ہونا ضروری

ہے۔ اگر اس امت سے کوئی لغزش یا انحراف نظر آئے تو ان سب کی ذمے داری ہے کہ اسے راہِ صواب کی طرف لوٹا دیں۔[1]

اس میں شک نہیں کہ دین کی تبلیغ اور امت کی اصلاح اور خیر خواہی کا کام آسان نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود ہر شخص اسے اپنی قوت و صلاحیت کے مطابق انجام دے سکتا ہے۔ اگر کسی میں یہ صلاحیت ہے کہ پورے عالم انسانی میں معروف کو قائم کردے اور منکر کو مٹادے تو ضرور اسے اس فرض کو اسی وسیع پیمانے پر انجام دینا چاہیے، لیکن جس میں اتنی صلاحیت نہیں ہے وہ اپنے لیے نسبتاً محدود دائرے کا انتخاب کرسکتا ہے۔ اگر کسی بھی پہلو سے اس میں اس کام کی صلاحیت نہیں ہے تو اس کے لیے کم سے کم یہ راہ تو کھلی ہوئی ہے کہ اہل افراد کو اس کام پر آمادہ کرے اور ان کے ساتھ تعاون کرے۔ تاکہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض براہِ راست نہ سہی بالواسطہ ہی انجام پاسکے اور وہ بالکلیہ اس فرض کا تارک نہ قرار پائے۔

جمہور کے مسلک کی توضیح مزید

جو لوگ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو فرض کفایہ کہتے ہیں اور جو اس کے فرض عین ہونے کے قائل ہیں، دونوں کے دلائل تفصیل سے بیان کردیے گئے ہیں۔ پہلا نقطۂ نظر جمہور کا ہے۔ اس کے بعض پہلو ابھی توضیح کے محتاج ہیں:

۱ — امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو اگر ہم فرض عین نہ کہیں اور جمہور کی رائے کے مطابق اسے فرض کفایہ ہی قرار دیں تو اس سے اس کے وجوب کی حیثیت بدل نہیں جائے گی، بلکہ وہی حقیقت ہوگی جو فرض عین کی ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ واجب العین اور واجب علی الکفایہ کی حقیقت ایک دوسرے سے مختلف ہے، لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ علامہ آمدی فرماتے ہیں:

---

[1] رشید رضا، تفسیر القرآن الحکیم (تفسیر المنار): ۴/ ۳۶، ۳۷

لاَ فرق عند أصحابنا بين واجب العين والواجب على الكفاية من جهة الوجوب لشمول حد الواجب لهما، خلافاً لبعض الناس مصيراً منه إلى أن واجب العين لاَ يسقط بفعل الغير، بخلاف واجب الكفاية، وغاية الاختلاف في طريق الإسقاط، وذٰلک لاَ يوجب الاِختلاف في الحقيقة[1]

ہمارے اصحاب کے نزدیک واجب عین اور واجب کفایہ میں وجوب کے پہلو سے کوئی فرق نہیں ہے، کیوں کہ دونوں واجب کی تعریف میں آتے ہیں۔ بعض لوگوں کو اس سے اختلاف ہے، اس بنیاد پر کہ واجب عین دوسرے کے ادا کرنے سے ساقط نہیں ہوتا اور واجب کفایہ ساقط ہو جاتا ہے، لیکن اس سے زیادہ سے زیادہ دونوں کو ساقط کرنے کے طریقوں سے اختلاف ثابت ہوتا ہے۔ اس سے وجوب کی حقیقت میں اختلاف لازم نہیں آتا۔

۲- فرض عین کی ذمہ داری جماعت کے ہر فرد پر عائد ہوتی ہے اور فرض کفایہ کی پوری جماعت پر۔ لہٰذا فرض عین کی ادائیگی کے لیے جس طرح ایک ایک شخص فکرمند ہوتا ہے، اسی طرح فرض کفایہ کی ادائیگی کے لیے پوری جماعت کو فکر مند ہونا چاہیے، کیوں کہ جو جماعت فرض کفایہ کو ترک کردے، خواہ قصداً یا اپنی غفلت اور کوتاہی سے، اس کے تمام افراد گنہ گار ہوں گے۔ ہاں اگر ان میں سے بعض بھی اسے انجام دے دیں تو ذمے داری سب سے ساقط ہوجائے گی اور ان لوگوں کو ثواب ملے گا، جو اسے انجام دیتے ہیں۔ چناں چہ مولانا عبد العلی انصاری نے واجب علی الکفایہ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

الواجب الذى من شأنه أن يثاب الآتون ولاَ يعاقب التاركون، إذا أتى به البعض، وإن لم يات أحد يعاقب الكل[2]

ایسا واجب جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس پر عمل کرنے والے ثواب پائیں گے اور چھوڑنے والوں کو سزا نہیں دی جائے گی (لیکن یہ اس وقت) جب کہ بعض لوگ اس کو انجام دے دیں، اگر کوئی بھی اسے انجام نہ دے تو سب کے سب سزا کے مستحق ہوں گے۔

---

[1] الاحکام فی اصول الاحکام: ۱/ ۱۴۱، ۱۴۲

[2] شرح مسلم الثبوت: ۱/ ۶۲، ۶۳

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی جماعت خدا کی گرفت سے بچنا چاہتی ہے تو اس کا نظام ایسا ہونا چاہیے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض ہر وقت اس میں انجام پاتا رہے اور اس کے اندر ایسے افراد موجود ہوں جو بھلائیوں کا حکم دیں اور برائیوں سے منع کریں۔

۳- فرض کفایہ افضل ہے یا فرض عین؟ جلال المحلی کہتے کہ فقہاء نے اس سوال سے صراحتاً بحث نہیں کی ہے، البتہ ان کی تحریروں سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ فرض عین کو افضل سمجھتے ہیں، کیوں کہ شریعت نے اس کو فرض کفایہ کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دی ہے اور ہر مکلّف سے اس پر عمل کا مطالبہ کیا ہے، لیکن علامہ ابو اسحٰق اسفرائنی، امام الحرمین اور علامہ ابو محمد جوینی کی رائے میں فرض کفایہ کی فرض عین سے زیادہ فضیلت ہے۔ کیوں کہ فرض کفایہ کو جب چند افراد اچھی طرح انجام دیتے ہیں تو اس سے وہ تمام لوگ گناہ سے بچ جاتے ہیں جن پر اس کی ذمہ داری تھی، لیکن فرض عین کے ادا کرنے سے آدمی صرف اس گناہ سے بچتا ہے جو اس کے نہ کرنے سے اسے ہوتا ہے۔ اس میں دوسروں کو گناہ سے بچانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا[1] اس پہلو سے دیکھا جائے تو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی اہمیت، اس کو فرض کفایہ ماننے کے باوجود بہت بڑھ جاتی ہے۔

۴- اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف دنیا کو دعوت دینا اور اس کو قائم و غالب کرنا بھی امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے اور یہ بھی امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہی ہے کہ کسی بے نمازی کو نماز کی نصیحت کی جائے یا کسی شرابی کو شراب سے باز رکھنے کی کوشش کی جائے۔ ان میں سے پہلا کام مستقل ہے اور دوسرا وقتی اور عارضی۔ کیوں کہ پہلے کام کی نوعیت ایسی ہے کہ اس کو ہر شخص اپنی استعداد کی حد تک زندگی بھر انجام دے سکتا ہے، کبھی کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کام ختم ہوگیا اور اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ اس پہلو سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو فرض عین کہنا غلط نہ ہوگا۔ لیکن دوسرا کام اس

---

[1] شرح الجلال المحلّی علی جمع الجوامع، المطبوع مع حاشیہ البنانی: ۱/ ۱۸۵، ۱۸۶

نوعیت کا ہے کہ اس کو انجام دینے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص اس میں لگا رہے، بلکہ ایک فرد یا چند افراد بھی اس کے لیے کافی ہو سکتے ہیں۔ فرض کیجیے، کسی مجلس میں کوئی خلاف شرع بات ہو رہی ہے۔ ظاہر ہے اس سے منع کرنا اہلِ مجلس کا فرض ہے، لیکن یہ کام بیک وقت مجلس کے تمام افراد نہ تو انجام دے سکتے ہیں اور نہ فی الواقع اس کی ضرورت ہے۔ اس صورتِ حال میں ایک شخص بھی اصلاح کی معقول کوشش کرے تو سب کی ذمے داری ساقط ہو جائے گی۔ ہاں اگر پوری مجلس ہی اس سے غفلت برت جائے تو اس کے سب ہی افراد گناہ گار ہوں گے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے کام کی اس نوعیت کو سامنے رکھا جائے تو اسے فرض کفایہ ہی کہنا چاہیے، نہ کہ فرض عین۔

۵- امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو فرض کفایہ کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر امت مسلمہ کا کوئی ایک فرد یا چند افراد زمین کے کسی گوشے میں اس فرض کو انجام دے رہے ہوں تو پوری امت اس سے سبک دوش ہو جائے گی۔ امر بالمعروف و نہی المنکر کا تقاضا ہے کہ ایک طرف ان لوگوں میں دین کا کام کیا جائے جو اس سے ناواقف ہیں اور دوسری طرف مسلمانوں میں اس فرض کو انجام دیا جائے۔ پہلا کام جتنا دشوار ہے، دوسرے کام کی دشواری اس سے کم نہیں ہے۔ کیوں کہ امت مسلمہ کسی چھوٹی سی جماعت کا نام نہیں ہے، بلکہ اس وقت وہ دنیا کی سب سے بڑی ملت ہے اور ایک ارب بیس کروڑ نفوس پر مشتمل ہے۔ وہ کسی خاص خطۂ زمین میں آباد نہیں ہے، بلکہ مختلف علاقوں میں پھیلی ہوئی ہے اور اس کی کوئی ایک زبان نہیں ہے، بلکہ متعدد زبانیں بولتی ہے۔ اس طرح یہ امت ایک دینی وحدت ہونے کے باوجود اپنے اندر بہت سے تمدنی و جغرافیائی اختلافات رکھتی ہے، جن کی وجہ سے فطری طور پر اس کے ایک گروہ کے بہت سے مسائل دوسرے گروہ کے مسائل سے جدا ہیں اور اس کا ایک طبقہ جن حالات سے دوچار ہے دوسرا طبقہ ان سے مختلف حالات میں گھرا ہوا ہے، اس لیے کسی ایک فرد یا جماعت کے امکان میں نہیں ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے وسیع کام کو امت کے اندر

اور باہر پوری طرح انجام دے۔ یہ کام اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ مختلف ملکوں اور مختلف علاقوں میں بہت سی جماعتیں اسے انجام دے رہی ہوں۔ اگر ہم کسی ایسی تنظیم کا تصور بھی کریں جو اپنے غیر معمولی وسائل وذرائع کی بنا پر ساری دنیا میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض انجام دینے کی حیثیت میں ہوتو بھی وہ ہر خطہ اور ہر علاقے میں ایسے کارکنوں کی محتاج ہوگی جو وہاں کے حالات کی رعایت سے یہ کام کرسکیں۔ قرآن نے اس کام کا جوطریقہ بتایا ہے وہ یہ ہے:

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَارَجَعُوْا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ (التوبة: ١٢٢)

تو ایسا کیوں نہیں ہوا کہ ان کے ہر گروہ سے ایک جماعت نکلتی، تا کہ دین میں سوجھ بوجھ حاصل کرے اور جب وہ اپنی قوم کے لوگوں کی طرف لوٹے تو ان کو خدا کے عذاب سے ڈراتے شاید کہ وہ (اس سے) بچیں۔

قاضی بیضاوی نے اس آیت کی جو تشریح کی ہے اس کے ضروری حصے ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

فهلاّ نفر من كل جماعة كثيرة كقبيلة وأهل بلدة جماعة قليلة ...ليجعلوا غاية سعيهم ومعظم غرضهم من الفقاهة، إرشاد القوم وإنذارهم[1]

پس کیوں نہیں نکلی ہر بڑی جماعت ــ جیسے ہر قبیلہ یا اہل شہر۔ میں سے ایک چھوٹی جماعت ... تا کہ دین کی سوجھ بوجھ حاصل کرنے سے، وہ اپنی کوشش کی غایت اور اپنی سب سے بڑی غرض یہ رکھے کہ قوم کو سیدھی راہ دکھائے گی اور خدا کے عذاب سے ڈرائے گی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا مختلف ملکوں اور مختلف خطوں ہی میں انجام پانا کافی نہیں ہے، بلکہ ہر شہر، ہر بستی اور ہر چھوٹی بڑی آبادی میں اس کے نظام کا موجود ہونا ضروری ہے۔ علامہ بغوی اسی آیت کے ذیل میں کہتے ہیں:

---

[1] انوار التنزیل و اسرار التاویل: ۱/ ۴۲۵

''فقہ، احکام دین کی معرفت کا نام ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں: فرض عین اور فرض کفایہ۔ پہلی قسم میں طہارت، نماز اور روزے کے احکام شامل ہیں کہ ان کا جاننا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اسی طرح ہر وہ عبادت جس کو شریعت نے کسی پر واجب کیا ہو، اس کے لیے اس کے احکام کا جاننا بھی فرض عین ہے۔ جیسے زکوٰۃ اور حج کہ یہ جن پر واجب ہو جائیں ان کے لیے ان کے احکام کا جاننا ضروری ہے۔ فرض کفایہ یہ ہے کہ آدمی اس حد تک علم حاصل کرے کہ وہ اجتہاد کرنے اور فتویٰ دینے کی حیثیت میں ہو جائے۔ جب کسی شہر کے لوگ تمام کے تمام اس حد تک تعلیم حاصل کرنے سے رہ جائیں تو سب ہی گنہ گار ہوں گے، لیکن اگر ہر شہر میں سے ایک شخص بھی اتنی تعلیم حاصل کرلے تو دوسروں سے بوجھ اتر جائے گا اور شہر کے سب لوگوں کی ذمے داری ہوگی کہ پیش آنے والے معاملات میں اس کی تقلید کریں۔''[1]

گویا دین کا وسیع علم رکھنے والے افراد کا ہر بستی میں ہونا لازمی ہے، تاکہ لوگ ان سے راہ نمائی حاصل کریں اور ایسے تمام مسائل میں ان کی طرف رجوع کریں جن میں شریعت کا نقطۂ نظر وہ نہ جانتے ہوں۔ اگر کسی آبادی میں ایسا ایک فرد بھی نہیں ہے تو پوری آبادی گنہ گار ہوگی اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی گرفت ہوگی۔

۶- امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

الأمر بالمعروف والنھی عن المنکر لاَ یجب علی کل أحد بعینه، بل ھو علی الکفایة، کما دل علیه القرآن. و لما کان الجھاد من تمام ذلک کان الجھاد أیضاً من فروض الکفایة[2]

امر بالمعروف و نہی عن المنکر فرض عین نہیں اس لیے ہر ایک پر واجب نہیں ہے، بلکہ فرض کفایہ ہے، جیسا کہ قرآن دلالت کرتا ہے چوں کہ جہاد اسی کا ایک جزء ہے اور اس سے اس کی تکمیل ہوتی ہے اس لیے وہ بھی فرض کفایہ ہے۔

---

۱ معالم التنزیل علیٰ ہامش الخازن: ۱۳۸/۳

۲ الحسبۃ فی الاسلام، ص: ۶۱

جہاد کے بارے میں فقہا نے لکھا ہے کہ اگر کسی شہر پر دشمن کا حملہ ہوجائے تو اس شہر کے تمام لوگوں پر جو دشمن کا مقابلہ کرسکتے ہوں جہاد فرض ہوجائے گا۔ اگر شہر کے لوگ دشمن کے مقابلے کی طاقت نہ رکھتے ہوں یا طاقت کے باوجود غفلت اور کوتاہی کر رہے ہوں تو ان کے قریب کے لوگوں پر دشمن کا مقابلہ فرض ہوگا۔ اگر ان سے بھی مقابلہ نہ ہوسکے تو پھر ان کے قریب کے لوگوں پر یہ فرض عائد ہوگا۔اس طرح بہ تدریج مشرق و مغرب کے تمام اہلِ اسلام پر جہاد فرض ہوتا چلا جائے گا[۱]

ٹھیک اسی طرح قیاس کہتا ہے کہ جہاں معروف قائم نہ ہو اور منکر کا ارتکاب ہو رہا ہو، وہاں کے لوگوں کی ذمے داری ہے کہ معروف کو قائم کرنے اور منکر سے باز رکھنے کی کوشش کریں۔ لیکن اگر اس ذمے داری کو وہ محسوس نہ کر رہے ہوں یا محسوس کرنے کے باوجود غفلت برت رہے ہوں تو قرب و جوار کے لوگوں کی ذمے داری ہوگی کہ وہاں پہنچیں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض انجام دیں۔ فرض کیجیے، کوئی مسلم آبادی منکرات میں مبتلا ہے یا اس کے عقائد بگڑے ہوئے ہیں اور ان کی اصلاح کرنے والا کوئی ایک فرد بھی اس آبادی میں نہیں ہے تو قریب کے رہنے والوں پر شرعاً ان کی اصلاح کی ذمے داری عائد ہوگی۔ اور اگر وہ بھی اس فرض کو انجام نہ دیں تو جہاد کی طرح بہ تدریج وہ پوری امت پر عائد ہوتی چلی جائے گی۔

۷- جمہور کے نزدیک امر بالمعروف و نہی عن المنکر اگرچہ فرض کفایہ ہے، لیکن بعض اوقات وہ فرض عین بھی ہو جاتا ہے۔ اس طرح کی چند صورتیں ذیل میں پیش کی جارہی ہیں:

(ا) جس شخص کو اسلامی حکومت اس کام پر مامور کردے اس کے لیے وہ فرض عین ہے۔ نظام الدین نیشا پوری کہتے ہیں:

إن نصب لذلک رجل تعین علیه　　اگر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے

[۱] فتح القدیر والعنایۃ علی الہدایۃ: ۴/۲۸۰، ۲۸۱

بحكم الولاية، وهو الْمُحْتَسِب[1]

کسی کو متعین کر دیا جائے تو ریاست کے حکم سے وہ اس پر لازم ہوجائے گا۔ اس شخص کو محتسب کہا جاتا ہے۔

(۲) اگر کسی جگہ معروف کو مٹایا جارہا ہے یا منکر کا ارتکاب ہو رہا ہے اور اس کا علم صرف ایک ہی شخص کو ہے تو اس پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر فرض عین ہے۔ ملّا علی قاری کہتے ہیں:

إن الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر فرض كفاية إن علم به أكثر من واحد وإلا فهو فرض عين على من رآه[2]

امر بالمعروف و نہی عن المنکر یقیناً فرض کفایہ ہے بشرطے کہ اس کو ایک سے زیادہ افراد جانتے ہوں، ورنہ وہ فرض عین ہے، اس شخص کے لیے جو اس معاملے سے واقف ہو۔

(۳) امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے سلسلے میں اگر دلائل سے بحث کی ضرورت پڑے تو جس شخص میں یہ صلاحیت ہوگی اس کے لیے وہ فرض عین ہے۔ ابن العربی مالکی فرماتے ہیں:

الأمر بالمعروف و النهى عن المنكر فرض كفاية ... وقد يكون فرض عين إذا عرف المرء من نفسه صلاحية النظر والاستقلال بالجدال أو عرف ذلك منه[3]

امر بالمعروف و نہی عن المنکر فرض کفایہ ہے... کبھی وہ فرض عین بھی ہو جاتا ہے جب کہ آدمی اپنے اندر فکر و نظر کی صلاحیت پاتا اور بحث و مناظرے کی ذمے داری اٹھانے کی طاقت محسوس کرتا ہو، یا اس کے اندر یہ چیز دیکھی گئی ہو۔

۴- امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی اگر کسی میں طاقت ہے اور دوسرا کوئی

---

[1] غرائب القرآن و رغائب الفرقان علیٰ ہامش ابن جریر: ۴/ ۳۰

[2] المبین المعین لفہم الاربعین: ص۱۸۹

[3] احکام القرآن: ۱/ ۲۹۲

شخص اسے انجام نہیں دے رہا ہو تو اس کے لیے وہ فرض عین ہے۔ امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

و هو فرض على الكفاية، ويصير فرض عين على القادر الذى لم يقم به غيره [٣]

وہ فرض کفایہ ہے، اور فرض عین ہو جاتا ہے اس قدرت رکھنے والے شخص پر جس کے علاوہ کوئی دوسرا شخص اسے نہ انجام دے رہا ہو۔

اسی بات کو امام غزالیؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

إن الأمر بالمعروف و النهى عن المنكر واجب و ان فرضه لاَ يسقط مع القدرة الاّ بقيام قائم به [١]

امر المعروف و نہی عن المنکر واجب ہے اور قدرت کے ہوتے ہوئے اس کی فرضیت ساقط نہیں ہوتی الاّ یہ کہ کوئی انجام دینے والا اسے انجام دے دے۔

ان تفصیلات سے واضح ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو فرض کفایہ ماننے کا نتیجہ بلاشبہ یہ تو ہوگا کہ کچھ لوگ اس میں مصروف ہوں گے اور کچھ مصروف نہیں ہوں گے، لیکن اس کا نتیجہ یہ نہیں نکلے گا کہ حالات اس کا تقاضا کر رہے ہوں اور وہ انجام پانے سے رہ جائے۔ جب بھی کسی معاملہ میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا تقاضا ہو وہ لازماً پورا ہوگا۔ اس میں غفلت اور کوتاہی کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔

---

٣ الحسبۃ فی الاسلام: ص ٣٤

١ احیاء علوم الدین: ٢/٣٣٩



معنیٰ و مفہوم

امر بالمعروف و نہی عن المنکر اخلاقی اصطلاح نہیں ہے

'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' اس انقلابی کام کا عنوان ہے جو اللہ تعالیٰ امت مسلمہ سے لینا چاہتا ہے۔ اس لیے ہمیں یہ جاننا ضروری ہے کہ معروف و منکر ہے کیا؟ اور معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا کسے کہتے ہیں؟ اس کے بغیر ہم کبھی بھی اس کا حق ادا نہیں کرسکتے۔ ہماری عام بول چال میں 'معروف' ان اخلاقی خوبیوں کو کہتے ہیں جن کا اچھا ہونا ہر ایک کے نزدیک تسلیم شدہ ہے۔ اسی طرح 'منکر' کی اصطلاح ان اخلاقی خرابیوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے، جن کو عقل سلیم برا مانتی ہے، اس لیے 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ اچھے کاموں کی نصیحت اور برے کاموں کی مذمت کی جائے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآن کا بتایا ہوا مفہوم نہیں ہے۔ اسے ہمارے استعمال نے، بلکہ زیادہ صحیح معنی میں ہمارے تنگ ذہن نے پیدا کیا ہے۔ قرآن کے نزدیک نہ تو معروف و منکر کا دائرہ محض اخلاقیات تک محدود ہے اور نہ اس نے 'امر و نہی' کے الفاظ وعظ و تبلیغ کے لیے استعمال کیے ہیں۔ قرآن کی زبان میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر، کے معنی بہت وسیع ہیں۔ اس میں دین کو اپنی صحیح حالت میں باقی رکھنے اور اسے قائم و غالب کرنے کی تمام کوششیں شامل ہیں۔ جس شخص کے ذہن میں معروف و منکر کا محدود تصور ہوگا وہ اخلاق کی تذکیر و تلقین کے بعد مطمئن ہو جائے گا کہ 'امر

بالمعروف و نہی عن المنکر' کا حق ادا ہوگیا اور امت مسلمہ اپنے فرض سے سبک دوش ہوگئی۔ اقامتِ دین کا بھاری بوجھ اٹھانے کی نہ تو اسے فکر ہوگی اور نہ وہ اسے اپنی ذمہ داری سمجھے گا، بلکہ ہوسکتا ہے کہ دین کو قائم کرنے کی جدوجہد اس کے نزدیک امتِ مسلمہ کے حدودِ کار سے خارج ہو۔ آپ اس سے کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے دین کو قائم کرنے کا حکم دیا ہے اور وہ جواب دے گا کہ اخلاق کی تبلیغ کے بعد ہمارا فرض ادا ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ اس نے 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کی اصطلاح نہیں سمجھی اور اس کے معنی غلط بیان کیے ہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دین کا صحیح تصور اس کے ذہن میں نہیں ہے اور وہ اس کام کی نوعیت سے ناواقف ہے، جس کے کرنے پر امت مسلمہ اللہ عزوجل کی طرف سے مامور ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا صحیح مفہوم

'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' خالص قرآنی اصطلاح ہے۔ اس پر چند نکات کے تحت غور ہونا چاہیے۔ امید ہے اس سے اس کا صحیح مفہوم واضح ہوگا۔

نکتۂ اوّل: قرآن مجید نے 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کی اصطلاح پیغمبروں کے کام کے لیے استعمال کی ہے اور یہ واقعہ ہے کہ پیغمبر محض اخلاق کا درس دینے نہیں آتے ہیں، بلکہ اخلاق کی تعلیم ان کے وسیع کام کا صرف ایک حصہ ہوتی ہے۔ وہ انسانوں کو اللہ واحد کی عبادت اور بندگی کی دعوت دیتے ہیں اور اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے سر جھکائے اور زندگی کے ہر معاملہ میں اس کے احکام کا پابند ہو۔ ان کا مطالبہ زندگی کے کسی ایک پہلو میں اصلاح کا نہیں ہوتا، بلکہ وہ ہمہ جہت اصلاح چاہتے ہیں۔ ان کی ساری تگ و دو اس لیے ہوتی ہے کہ انسان پوری طرح اللہ تعالیٰ کا غلام بن جائے اور اپنے عقائد و

نظریات میں، بندگی کے آداب میں، اخلاق و معاملات میں، تہذیب و معاشرت میں، طرزِ حکومت و سیاست میں، غرض ہر عمل میں اس کے احکام کا تابع ہو جائے۔ ان کی اسی سعی و جہد کو 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کہا گیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ معروف میں وہ تمام امور شامل ہیں جن کے اختیار کرنے کا پیغمبر حکم دیتے ہیں اور 'منکر' سے مراد وہ ساری چیزیں ہیں جن سے وہ منع کرتے ہیں، اور ان کے امر و نہی کا تعلق زندگی کے کسی ایک گوشہ سے نہیں، بلکہ تمام گوشوں سے ہوتا ہے۔

نکتۂ دوم: پیغمبروں کا جو مقصدِ حیات ہے، ٹھیک وہی امت مسلمہ کا بھی مقصدِ وجود ہے۔ اس لیے اس کی بھی ذمہ داری یہ ہے کہ دنیا کو معروف کا حکم دے اور منکر سے منع کرے۔ اسی کام کی وجہ سے اسے 'خیر امت' کہا گیا ہے۔ اگر امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کا مطلب محض اخلاق کی وعظ و تلقین ہے تو دنیا کے مختلف گروہ اور مختلف جماعتیں ہمیشہ یہ کام انجام دیتی رہی ہیں۔ موجودہ دور ہی کو لیجیے، گو کہ اس میں بداخلاقی اپنی آخری حد تک پھیلی ہوئی ہے اور بہت سی اخلاقی قدریں بدل چکی ہیں، لیکن اس کے باوجود ہر جگہ اخلاق کی درس و تدریس ہوتی ہے، اخلاق کے موضوع پر تحریریں مرتب ہو رہی ہیں اور بہت سی انجمنیں اور ادارے اخلاق کی تبلیغ و اشاعت پر اپنی قوتیں صرف کرتے ہیں۔ اگر امت مسلمہ بھی اسی تگ و دو میں لگ جائے تو وہ اخلاق کی اصلاح کرنے والے گروہوں میں سے ایک گروہ ہوگی، صرف اس ایک عمل کی وجہ سے دنیا کی امتوں میں اس کے 'خیر امت' ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے محض مصلح اخلاق نہیں بننا ہے، بلکہ زندگی کے ہر میدان میں اصلاح کا فرض انجام دینا ہے، تب ہی اس کا کام پیغمبروں کا کام ہوگا اور اس کی حیثیت ایک ممتاز گروہ کی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے 'خیر امت' کا مقام اس لیے نہیں عطا کیا ہے کہ وہ دین کے کسی ایک حصے کی تبلیغ کرتی ہے، بلکہ یہ مقام اسے اس لیے ملا ہے کہ وہ دنیا میں اللہ کے پورے دین کو قائم و غالب کرنے کے لیے وجود میں آئی ہے۔

علامہ ابو حیان اندلسی فرماتے ہیں کہ جن لوگوں کو قرآن نے خیر امت کا لقب دیا ہے انھیں اس لیے دیا ہے کہ:

وهي سبقهم إلى الإيمان برسول الله وبدارهم إلى نصرته، ونقلهم عنه علم الشريعة، وافتتاحهم البلاد[1]

انھوں نے رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے میں سبقت کی، آپؐ کی مدد کے لیے سب سے پہلے آگے بڑھے، آپؐ سے شریعت کا علم دوسروں تک منتقل کیا اور (اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے) ملکوں کو فتح کیا۔

نکتۂ سوم: قرآن نے سورۂ آل عمران میں امت مسلمہ کو 'دعوت الی الخیر' اور 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کا ایک ساتھ حکم دیا ہے۔ یہ دو الگ الگ حکم نہیں ہیں، بلکہ دوسرا حکم پہلے حکم کی تشریح ہے۔ 'دعوت الی الخیر' کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کو اللہ تعالیٰ کے پورے دین اور اس کی پوری شریعت کی طرف دعوت دی جائے۔ مفسرین نے کہا ہے کہ اسی بات کو مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، کی اصطلاح میں بیان کیا گیا ہے۔ ہم یہاں امام رازی اور نظام الدین نیشا پوری کے الفاظ نقل کرتے ہیں۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں:

الدعوة إلى الخير جنس تحته نوعان: احدهما الترغيب في فعل ما ينبغي وهو الأمر بالمعروف، والثاني الترغيب في ترك ما لا ينبغي وهو النهي عن المنكر[2]

'دعوت الی الخیر' ایک جنس (وسیع حکم) ہے اس کی دو نوعیں ہیں: ایک یہ کہ ان کاموں کے کرنے کی ترغیب دی جائے جو مطلوب ہیں۔ اسی کا نام 'امر بالمعروف' ہے۔ دوسری یہ کہ ان چیزوں کے چھوڑنے کی ترغیب دی جائے جو نامطلوب ہیں۔ اسی کو 'نہی عن المنکر' کہا جاتا ہے۔

نظام الدین قمی نیشا پوری لکھتے ہیں:

---

[1] البحر المحیط: ۳/۳۰

[2] التفسیر الکبیر، المجلد الرابع، الجزء ۸، ص ۱۴۶

ولاَ جرم اتبعہ النوعین زیادة فی البیان[1]

قطعی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے 'دعوت الی الخیر' کے بعد دونوں قسموں (امر بالمعروف و نہی عن المنکر) کا ذکر مزید وضاحت کے لیے کیا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ 'دعوت الی الخیر' اور 'امر بالمعروف و نہی المنکر' دونوں حکموں کا منشا یہ ہے کہ دنیا کو اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف بلایا جائے اور اسے بہ تمام و کمال غالب و سربلند کرنے کی کوشش کی جائے۔

اہلِ علم کی تصریحات

یہ خیال کہ معروف و منکر کا دائرہ اخلاق تک محدود ہے، بے دلیل ہے۔ اس کی کوئی علمی اساس نہیں ہے۔ تیرہ صدیوں میں کسی بھی قابل ذکر صاحب علم نے یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ یہ اخلاقی اصطلاحات ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ معروف و منکر کے الفاظ بہت وسیع معنی رکھتے ہیں۔ ان میں عقائد و عبادات اور اخلاق و معاملات سب ہی شامل ہیں۔ انھیں کسی ایک شعبۂ زندگی کے ساتھ مخصوص کرنا ان کی وسعت کو ختم کرنا ہے۔ یہاں بعض اہلِ علم کی تصریحات پیش کی جا رہی ہیں، جن سے اس خیال کی جڑ کٹ جاتی ہے کہ معروف اخلاقی خوبیوں کا اور منکر اخلاقی خرابیوں کا نام ہے۔

قاضی شوکانی:

أخرج ابن ابی حاتم عن أبی العالیة قال: کل آیة ذکرھا اللّٰہ فی القرآن فی الأمر بالمعروف فھو الأسلام والنھی عن المنکر فھو عبادة الأوثان انتھیٰ، وھو تخصیص بغیر

ابن ابی حاتم کی روایت ہے کہ ابو العالیہ نے کہا کہ ”ہر وہ آیت جس میں قرآن نے 'امر بالمعروف' کا ذکر کیا ہے، اس میں معروف سے مراد اسلام ہے اور نہی عن المنکر کا مطلب ہے بتوں کی عبادت سے منع کرنا“ لیکن 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کی اس تخصیص کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ عربی زبان میں اور

---

[1] غرائب القرآن و رغائب الفرقان علیٰ ہامش ابن جریر: ۴/ ۳۰

مخصص فليس في لغة العرب ولاَ في عرف الشرع مايدل على ذلك[1]

شریعت کے استعمال میں اس تخصیص پر دلالت کرنے والی کوئی دلیل نہیں ہے۔ (اس لیے اسے عام ہونا چاہیے)۔

ابو حیان اندلسی:

فسر بعضهم المعروف بالتوحيد والمنكر بالكفر ولاشك أن التوحيد رأس المعروف و الكفر رأس المنكر، ولكن الظاهر العموم في كل معروف مأمور بــه في الشرع، وفي كل منهي نهى عنه في الشرع[2]

بعض لوگوں نے معروف کی تفسیر توحید سے اور منکر کی تفسیر کفر سے کی ہے۔ بلاشبہ توحید سب سے بڑا معروف اور کفر سب سے بڑا منکر ہے، لیکن واضح بات یہ ہے کہ ان لفظوں میں عموم ہے۔ معروف سے ہر وہ چیز مراد ہے، جس کا شریعت نے حکم دیا ہے اور منکر میں وہ تمام باتیں شامل ہیں، جن سے شریعت نے منع کیا ہے۔

امام رازیؒ:

رأس المعروف الإيمان بالله، و رأس المنكر الكفر بالله[3]

معروف کی اصل اللہ پر ایمان ہے اور منکر کی اصل اللہ کا انکار ہے۔

ابوبکر جصاص:

المعروف هو أمر الله ... والمنكر هو مانهى الله عنه[4]

معروف سے مراد اللہ کا حکم ہے ... اور جس چیز سے اللہ نے منع کیا ہے وہ منکر ہے۔

حدادی:

المعروف هو السنة، والمنكر هو البدعة[5]

معروف سنت کو اور منکر بدعت کو کہتے ہیں۔

---

[1] فتح القدیر: ۱/۴۶۶ [2] البحر المحیط: ۳/۱۶

[3] التفسیر الکبیر، المجلد الثامن، الجزء ۱۶، ص ۱۶۲

[4] احکام القرآن: ۲۲/۴۴ [5] روح البیان: ۱/۹۵۹

علامہ سید محمود آلوسی:

والمتبادر من المعروف الطاعات و من المنكر المعاصی الّتی أنكرها الشرع[۱]	بہ ظاہر معروف میں تمام اطاعتیں شامل ہیں اور منکر سے وہ سب معصیتیں مراد ہیں، جن سے شریعت نے منع کیا ہے۔

علامہ ابن حجر ہیتمی:

المراد بالأمر بالمروف والنهی عن المنكر الأمر بواجبات الشرع والنهی عن محرماته[۲]	'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' سے مراد ہے ان چیزوں کا حکم دینا جنہیں شریعت نے واجب کیا ہے اور ان چیزوں سے منع کرنا جنہیں شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔

ابن مالک:

(المنكر) هو مالیس فیه رضا اللّٰه من قول أو فعل والمعروف ضده[۳]	جس قول یا فعل میں اللہ کی رضا شامل نہیں ہے وہ منکر ہے اور معروف اس کی ضد ہے۔

ملّا علی قاری:

المنكر ما أنكره الشرع، وكرهه، و لم یرض به[۴]	منکر وہ چیز ہے، جس سے شریعت منع کرے، جو اسے ناپسند ہو اور جس سے وہ خوش نہ ہو۔

علامہ مناوی:

(من رأى منكم منكراً) شیئاً قبحه الشرع فعلاً أو قولاً (فلیغیره)[۵]	'جو شخص تم میں سے منکر کو دیکھے' یعنی ایسی چیز جسے شریعت نے ناپسند کیا ہے، خواہ وہ فعل ہو یا قول 'تو اسے بدل دے۔'

---

۱ روح المعانی، المجلد الثانی، الجزء ۴، ص ۲۴۴
۲ الزواجر عن اقتراف الکبائر: ۲/ ۱۵۵
۳ مبارق الازہار شرح مشارق الانوار: ۱/ ۴۸
۴ المبین المعین لفہم الاربعین: ص ۱۸۸
۵ التیسیر بشرح الجامع الصغیر: ۱/ ۴۱۸

امام ابن تیمیہؒ:

یدخل في المعروف کل واجب وفی المنکر کل قبیح و القبائح هی السیئات وهی المَحظورات کالشرک و الکذب والظلم و الفواحش[1]

معروف میں ہر 'واجب' اور منکر میں ہر قبیح چیز داخل ہے۔ قبیح چیزوں سے مراد برائیاں ہیں، یعنی وہ باتیں جن سے شریعت نے منع کیا ہے۔ مثال کے طور پر شرک، جھوٹ، ظلم اور تمام بے حیائی کے کام۔

حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ نے حدیث کے مشہور مجموعہ 'مشکوٰۃ المصابیح' کی شرح فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں کی ہے۔ اپنی فارسی شرح میں معروف و منکر کے معنی ان الفاظ میں بیان کیے ہیں:

''معروف از معرفت است بمعنی شناختن یعنی آں چہ شناختہ شدہ است در شرع و شرع بداں وارد شدہ است .... و مقابل او منکر است بفتح کاف بمعنی شناختہ نشدہ وشرع وارد نشدہ دروے۔''[2]

('معروف' معرفت سے ہے۔ اس کے معنی ہیں پہچاننا۔ یعنی وہ چیز جو شریعت میں جانی پہچانی ہو اور شریعت سے اس کا ثبوت ہو۔ اس کے بالقابل 'منکر' ہے۔ یعنی وہ چیز جو نہ پہچانی جائے اور اس کے متعلق شریعت کا حکم موجود نہ ہو)۔

بعض روایات کی شرح میں بھی حضرت محدث دہلویؒ نے اس مفہوم کی صراحت کی ہے۔ مشہور حدیث ہے: 'من رای منکم منکرا فلیغیّرہ بیدہ' (مسلم)۔ اس کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''ہر کہ بیند از شما نا مشروع را پس باید کہ تغیر دہد اورا و باز دارد از کردن او بدست خود''[3]

---

[1] العقیدۃ الاصفہانیۃ، ص ۱۲۱

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، اشعۃ اللمعات: ۴/۱۷۳، باب امر بالمعروف

[3] حوالہ سابق، ص ۱۷۴

"تم میں سے جو کوئی کسی غیر شرعی عمل کو دیکھے تو چاہیے کہ اسے بدل دے اور لوگوں کو اس سے باز رکھے اپنے ہاتھ سے (یعنی اگر استطاعت ہو تو طاقت سے روک دے)۔"

مسند احمد اور ترمذی کی ایک روایت میں ہے: "کل معروف صدقة" شیخ محدث دہلویؒ نے اس کا ترجمہ وتشریح ان الفاظ میں کی ہے:

"ہر کار خیر کہ شناختہ شدہ است وجود او در شرع صدقہ است"[1]

"ہر اس کار خیر کا کرنا، جو شریعت میں جانا پہچانا ہے' صدقہ ہے۔"

صحیح مسلم میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بنی آدم کے ہر فرد کو اللہ نے اس طرح پیدا کیا ہے کہ اس کے جسم میں تین سو ساٹھ جوڑ ہیں۔ آدمی کا تکبیر، تحمید، تسبیح اور استغفار کرنا، یا اگر راستہ میں پتھر یا خاردار کوئی چیز ہو تو اسے ہٹا دینا اور معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا (یہ سب اس کے شکر کے طریقے ہیں) اس آخری جملہ کا ترجمہ وتشریح ان الفاظ میں کی ہے:

"یا امر کند بہ مشروع کہ شناختہ می شود وجود او در شرع و نہی کند از مشروع کہ شناختہ نمی شود"[2]

"یا اس نے معروف کا حکم دیا یعنی کسی مشروع کا حکم دیا جس کا وجود شریعت میں جانا پہچانا ہے، منکر سے منع کیا، یعنی کسی ایسے عمل سے منع کیا جو شریعت میں جانا پہچانا نہیں ہے)۔"

اسی ذیل میں فرماتے ہیں کہ "اوپر جن اقوال و افعال کا ذکر ہے وہ ایک طرف اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر دوسری طرف۔ ان دونوں اعمال کی اہمیت ان سب سے زیادہ ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ معروف کا لفظ محض اعلیٰ اخلاقی اقدار کے لیے نہیں بولا جاتا، بلکہ اعلیٰ اخلاق اس کا صرف ایک حصہ ہیں۔ اسی طرح منکر میں بگڑے ہوئے اخلاق

---

[1] اشعۃ اللمعات: ۲/ ۵۵، کتاب الزکوٰۃ، باب فضل الصدقۃ

[2] حوالہ سابق: ص ۵۲

ضرور شامل ہیں، لیکن اس کے معنی محض بداخلاقی کے نہیں ہیں، بلکہ پورا دین معروف ہے اور جو نظریہ حیات اور طریقہ زندگی اس کے خلاف ہے وہ منکر ہے۔ اسے اس طرح بھی کہا جاسکتا ہے کہ اللہ کی ذات و صفات، رسولؐ کی رسالت، سنت و شریعت اور کل اسلامی قانون معروف ہے اور اللہ اور اس کے رسولؐ کا انکار اور دین و شریعت کی مخالفت کا دوسرا نام منکر ہے۔ یہ موضوع بہت نازک اور بے حد اہم ہے، اس لیے اس پر ہم ایک اور رُخ سے مزید تھوڑی سی بحث کرنا چاہتے ہیں۔

اللہ کا قانون معروف ہے اور جو حکم اللہ کے قانون سے ٹکرائے وہ منکر ہے

انسان قانون کا محتاج ہے اور قانون دینے کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ انسان نہ تو شخصی زندگی میں قانون سے بے نیاز ہوسکتا ہے اور نہ جماعتی زندگی میں، لیکن یہ بات اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ خود سے کوئی قانون بنالے اور اس پر عمل شروع کردے۔ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ قانون 'معروف' ہے اور جو قانون اس کے قانون سے ٹکرائے وہ 'منکر' ہے۔ اللہ تعالیٰ کو انسان قانون ساز مان لے تو اس کی زندگی 'معروف' کے تابع ہوجاتی ہے اور صحیح رُخ پر چلنے لگتی ہے اور اگر وہ اللہ تعالیٰ کی اس حیثیت کو ماننے سے انکار کردے تو اس کے سامنے صرف دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ قانون دینے اور فیصلہ کرنے کا اختیار خواہش اور عقل کو سونپ دے اور ان کے احکام کا پابند ہوجائے۔ دوسری یہ کہ اپنے ہی جیسے کسی فرد یا گروہ کی غلامی قبول کرلے۔ یہ دونوں ہی صورتیں اس کے لیے تباہ کن ہیں۔ 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اللہ واحد کا غلام بنایا جائے اور اللہ کے سوا ہر ایک کی غلامی سے نجات دلائی جائے۔ اللہ کا قانون غالب و سربلند ہونے کے لیے آیا ہے۔ جو لوگ اللہ پر ایمان و یقین رکھتے ہیں، ان کا فرض ہے کہ اسے غالب کرنے اور اس کے مخالف قوانین کو مٹانے کی کوشش کریں۔

اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کے دین کو جوں کا توں قبول کیا جائے اور اس میں کسی دوسرے فکر وعمل کی آمیزش نہ ہونے پائے۔ زندگی کے ہر معاملے میں صرف اس کا قانون چلے اور اسی کے احکام کی اتباع کی جائے۔ قانون سازی اللہ کا حق ہے۔ ہم خود سے نہ تو کوئی قانون بنا سکتے ہیں اور نہ اس کے دیے ہوئے قانون میں تحریف کر سکتے ہیں۔ اللہ کے دین سے انحراف اور بغاوت ہی 'منکر' نہیں ہے، بلکہ یہ بھی منکر ہے کہ اس کے دین کو بدل دیا جائے اور اپنی طرف سے کمی بیشی کرکے اس کی اتباع کی جائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سے 'منکر' کی اتباع کا نہیں، بلکہ 'معروف' کی اتباع کا مطالبہ کرتا ہے اور 'اتباعِ معروف' کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے دین کو جیسا کچھ وہ ہے، قبول کیا جائے اور اسے اپنے اندر اور باہر غالب کرنے کی مخلصانہ کوشش کی جائے۔

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

الأمر والنهي من لوازم وجود بني آدم، فمن لم يأمر بالمعروف الذي أمر اللّٰه بـه ورسوله، وينه عن المنكر الـذى نهى اللّٰه عنـه ورسولـه، و يؤمـر بالمعروف الذى امر الله بـه و رسولـه و ينه عن المنكر الذى نهى الله عنه و رسولـه وإلا فلا بـدّ أن يأمر و ينهىٰ، و يؤمر و ينهىٰ إما بما يضاد ذلك و إما بمايشترك فيه الحق الذى انزله

حکم دینا اور منع کرنا انسانی زندگی کے لیے ایک ناگزیر شے ہے۔ اب جو شخص اس معروف کا حکم نہ دے، جس کا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے اسے حکم دیا ہے اور اس منکر سے منع نہ کرے جس سے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے منع کیا ہے، یا خود اسے اس معروف کا حکم نہ دیا جائے جس کا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حکم دیا ہے یا اس منکر سے منع نہ کیا جائے، جس سے کہ اللہ اور اس کے رسول نے منع کیا ہے تو اس کے لازمی معنی یہ ہیں کہ وہ جو کچھ حکم دے گا اور جس چیز سے منع کرے گا اور جس بات کا اسے حکم دیا جائے گا اور جس چیز سے روکا جائے گا وہ یا تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات کا الٹا ہوگا یا پھر اس میں اللہ کے نازل کردہ حق کے ساتھ وہ باطل بھی شامل ہوگا جسے اللہ نے نازل نہیں کیا ہے

الله بالباطل الذي لم ينزله الله، وإذا اتخذ ذلک دينا كان ديناً مبتدعاً[1]

اور جب وہ اس طریقے کو دین کی حیثیت سے اختیار کرلے گا تو وہ ایک خود ساختہ دین ہوگا (خدا کا دیا ہوا دین نہ ہوگا)۔

اہلِ علم کی ان تصریحات سے بالکل عیاں ہے کہ معروف و منکر اخلاقی اصطلاحات نہیں ہیں، بلکہ شرعی اصطلاحات ہیں۔ یہ ان مطالبات کی ایک جامع تعبیر ہیں، جو اللہ کا دین اور اس کی شریعت ہم سے کرتے ہیں۔ اللہ کا دین جن عقائد و افکار کا، جن اصولِ عبادات کا، جن اخلاق و معاملات کا اور جس تمدن و سیاست کا ہمیں حکم دیتا ہے وہ سب کے سب معروفات ہیں اور جن عقائد و نظریات سے، عبادات کے جن طریقوں سے، اخلاق کے جن اصولوں سے اور جن قوانینِ تمدن و سیاست سے منع کرتا ہے وہ سب کے سب منکرات ہیں۔ ان ہی کے امر و نہی کا امتِ مسلمہ کو حکم دیا گیا ہے۔

معروف و منکر کا فیصلہ شریعت سے ہوگا

یہاں ایک غلط فہمی کا دور ہونا ضروری ہے۔ کیوں کہ جب تک یہ غلط فہمی رفع نہ ہو معروف و منکر کا ٹھیک ٹھیک مفہوم واضح نہیں ہوسکتا۔ وہ یہ کہ معروف کے لفظ میں جاننے پہچاننے اور پسند کرنے کا اور منکر کے لفظ میں نہ جاننے اور نہ پسند کرنے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جس چیز سے انسان آشنا اور مانوس ہو، یا جو عمل کسی جماعت کے درمیان متعارف اور پسندیدہ ہو وہ معروف ہے اور جس چیز سے کوئی فرد یا جماعت ناواقف ہو اور جسے وہ ناپسند کرتے ہوں وہ منکر ہے۔ کیوں کہ معروف و منکر کے الفاظ قرآن و حدیث کی زبان میں ایک خاص مفہوم رکھتے ہیں۔ اس کے تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ معروف صرف وہی عقیدہ و عمل ہے جو اللہ تعالیٰ کی شریعت میں جانا پہچانا اور پسندیدہ ہو۔ جو عقیدہ و عمل اس کی شریعت میں جانا پہچانا اور پسندیدہ نہ ہو وہ منکر ہے۔ اگر ہماری عقل کسی فکر کو دریافت کرلے یا کوئی طریقہ لوگوں میں شہرت پا

---

[1] الحسبۃ فی الاسلام: ص۸۷

جائے اور اس کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا جانے لگے تو وہ اسی وقت معروف کہلائے گا جب کہ وہ قرآن و حدیث کے نزدیک بھی معروف ہو۔ اسی طرح ہماری عقل کا کسی چیز کو نہ جاننا اور نہ پسند کرنا یا رواج عام میں اس کا غیر مشہور اور غیر پسندیدہ ہونا اسے منکر نہیں بنا دے گا، تا آں کہ شریعت بھی اسے منکر نہ کہہ دے۔ کوئی بھی عقیدہ و عمل اسی وقت معروف یا منکر قرار پائے گا جب کہ شریعت اسے معروف یا منکر قرار دے۔ ہوسکتا ہے کہ وقت کے دانش مند کسی عمل کو معروف کی حیثیت دے دیں اور وہ شریعت کے نزدیک منکر ہو، یا کوئی عقیدہ و عمل ان کے لیے منکر ہو اور شریعت اسے معروف کا عنوان عطا کردے۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں:

المعروف اسم لکل فعل یعرف بالعقل اوالشرع حسنَهٗ و المنکر ما ینکر بھما[1]

معروف ہر اس عمل کا نام ہے جس کی خوبی عقل سے معلوم کی جائے یا شریعت جسے اچھا کہے اور منکر وہ ہے جسے عقل اور شریعت ناپسند کرتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ معروف و منکر کے معلوم کرنے میں عقل کا مرتبہ شریعت کے برابر ہے، کیوں کہ عقل اس معاملے میں آزاد نہیں ہے، بلکہ شریعت کی تابع ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عقل میں اگر فساد نہیں ہے اور وہ صحیح حالت میں ہے تو اللہ تعالیٰ کی شریعت سے پوری طرح ہم آہنگ ہوتی ہے، کیوں کہ شریعت کا کوئی بھی حکم عقل سے متصادم نہیں ہے۔ اسی وجہ سے امام راغبؒ نے شریعت کے ساتھ عقل کا بھی ذکر کیا ہے۔ ورنہ جہاں عقل کسی چیز کے معروف یا منکر ہونے کا فیصلہ نہ کرسکے وہاں شریعت ہی کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہوگی۔ اس کی صراحت انھوں نے 'منکر' کی تشریح میں کی ہے۔ چناں چہ فرماتے ہیں:

المنکر کل فعل تحکم العقول الصحیحة بقبحه او تتوقف فی

منکر وہ ہے جسے عقلِ صحیح برا کہے، یا جس کے اچھا یا برا ہونے کا عقل فیصلہ نہ کرسکے

---

[1] المفردات فی غریب القرآن، مادہ 'عرف': ص ۳۳۴

استقباحه واستحسانه العقول فتحكم بقبحه الشريعة[1]	اور شریعت اس کی قباحت کا فیصلہ کردے۔

ابن ابی جمرہ کہتے ہیں کہ جس عمل کو شریعت عملِ نیک کہہ دے وہ معروف ہے، خواہ رواج اور دستور اس کے موافق ہو یا مخالف، کیوں کہ قانون دینے کا حق رواج کو نہیں، بلکہ شریعت کو حاصل ہے:

يطلق اسم المعروف على ما عرف بادلة الشرع من اعمال البرّ، سواء جرت به العادة ام لا[2]	معروف کا اطلاق ہر اس نیک عمل پر ہوتا ہے جو دلیل شرعی سے معلوم ہو، خواہ عادت اس کے مطابق ہو یا نہ ہو۔

بعض اوقات اہلِ علم مسلم سوسائٹی کے درمیان کسی چیز کی شہرت و عدم شہرت اور اس کی پسندا اور ناپسند کا اس طرح تذکرہ کرتے ہیں، جس سے بہ ظاہر یہ خیال ہوتا ہے کہ معروف ومنکر کی یقین میں شریعت کے ساتھ شاید مسلم سوسائٹی کے ردّ وقبول کو بھی دخل ہے، لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جو عقیدہ وعمل اہل ایمان کے درمیان متعارف ہو اور جسے وہ اچھا سمجھتے ہوں ہم اسے معروف کہیں گے۔ اسی طرح جس فکر وعمل سے وہ ناواقف ہوں اور جس کو وہ ناگوار محسوس کرتے ہوں اسے ہم منکر قرار دیں گے۔ لیکن اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ ان کی عقل کا فیصلہ ہے، یا یہ کہ یہ ان کے تجربے اور نسلی وقومی روایات کے مطابق ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے ماننے والے، جس چیز کو بھی معروف یا منکر کہتے ہیں، اللہ کے دین کی روشنی میں اور اس کی شریعت کی اتباع میں کہتے ہیں۔ ان کے درمیان وہی فکر وعمل معروف کی حیثیت اختیار کرتا ہے، جسے اللہ کی شریعت معروف کہے اور جس عقیدہ وعمل کو اس کی شریعت منکر قرار دے وہ ان کے نزدیک بھی بے چون وچرا منکرات کی فہرست

---

[1] المفردات فی غریب القرآن: مادہ (نکر)

[2] فتح الباری: ۱۰/۴۳۲

میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہ کبھی اس کی جرأت نہیں کر سکتے کہ جس چیز کو شریعت معروف کہے اسے منکر سمجھ کر چھوڑ بیٹھیں اور جس عمل کو منکرات میں شمار کرے اسے معروف کی حیثیت سے اختیار کرلیں۔

علامہ ابن جریر طبریؒ فرماتے ہیں:

اصل المعروف كل ما كان معروفا، ففعله جميل مستحسن غير مستقبح في اهل الْايمان بالله و انّها سميت طاعة الله معروفا لِانه مما يعرفه اهل الْايمان ولاَ يستنكرون فعله، و اصل المنكر ما انكره الله ورأوه قبيحا فعله ولذلك سميت معصية الله منكرًا لِاَن اهل الْايمان يستنكرون فعلها و يستعظمون ركوبها[1]

معروف کی اصل ہر وہ چیز ہے جو (شریعت کے نزدیک) جانی پہچانی اور مشہور ہو۔ پس اس کا کرنا خدا پر ایمان رکھنے والوں کے درمیان اچھا اور مستحسن ہوتا ہے اور اسے وہ ناپسند نہیں کرتے ہیں۔ اللہ کی اطاعت کو اس لیے معروف کہا جاتا ہے کہ اسے اہلِ ایمان خوب پہچانتے ہیں اور اس پر عمل کو ناپسند نہیں کرتے۔ منکر کی اصل ہر وہ چیز ہے جس کو اللہ تعالیٰ ناپسند کرے اور جس کے ارتکاب کو اہلِ ایمان قبیح سمجھتے ہوں۔ اسی وجہ سے اللہ کی معصیت کو منکر کہا جاتا ہے، کیوں کہ اہلِ ایمان اسے ناپسند کرتے ہیں اور اس کے ارتکاب کو بڑا جرم سمجھتے ہیں۔

امام شوکانیؒ امتِ مسلمہ کے افراد کے بارے میں فرماتے ہیں:

انهم يامرون بماهو معروف في هذه الشريعة وينهون عما هو منكر، فالدليل على كون ذٰلك الشئ معروفا اومنكرا هو الكتاب اوالسنة[2]

جو چیز اس شریعت میں معروف ہے وہ اس کا حکم دیتے ہیں اور جو چیز منکر ہے اس سے منع کرتے ہیں، پس اس چیز کے معروف یا منکر ہونے کی دلیل کتاب یا سنت ہوگی۔

۱۔ جامع البیان فی تفسیر القرآن: ۲۸/۴

۲۔ ارشاد الفحول الی تحقیق الحق من علم الاصول: ص ۴۷

چناں چہ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ مستند علماء امت نے معروف و منکر کی تعریف عقل و حکمت اور فلسفہ و منطق کی اصطلاحات میں یا اپنے دور کے رسم و رواج کی روشنی میں نہیں کی ہے، بلکہ اس کے لیے خالص شرعی اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ ان کے نزدیک معروف و منکر کے الفاظ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور نافرمانی، حلال و حرام، فرض اور نفل اور استحباب اور کراہت کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ شریعت معروف و منکر کا تعین کرے گی، کسی اور ذریعہ سے اس کا تعین نہیں ہوگا۔ کیوں کہ اللہ کی شریعت ہی ہمیں یہ بتاتی ہیں کہ کن اعمال سے وہ خوش ہوتا ہے اور وہ اعمال کون سے ہیں جو اس کی ناخوشی کے موجب ہیں؟ کون سی چیز حلال ہے اور کون سی چیز حرام؟ کس کام کا کرنا ضروری یا پسندیدہ ہے اور کس کام کا کرنا ناجائز اور غیر مطلوب ہے؟

علامہ ابن اثیر نے معروف کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

(المعروف) اسم جامع لكل ما عرف من طاعة الله والتقرب اليه والاحسان الى الناس وكل ما ندب اليه الشرع ونهى عنه من المُحَسّنات والمقبّحات وهو من الصفات الغالبة اى امر معروف بين الناس اذارأوه لا ينكرونه[1]

معروف ایک جامع تعبیر ہے۔ اس میں اللہ کی اطاعت، اس کا تقرب، لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور وہ تمام نیکیاں شامل ہیں، جن کی شریعت نے ترغیب دی ہے اور معروف میں ان برائیوں سے بچنا بھی شامل ہے جن سے اس نے منع کیا ہے۔ یہ صفات غالبہ میں سے ہے۔ یعنی 'معروف' سے مراد وہ کام ہے جو لوگوں کے درمیان معروف یعنی جانا پہچانا ہو اور جب وہ اسے دیکھتے ہوں تو ناپسند نہ کرتے ہوں۔

منکر کی تعریف میں علامہ موصوف فرماتے ہیں:

المنكر... ضد المعروف، و كل ما قبحه الشرع و حرمه و كرهه فهو منكر[2]

'منکر' معروف کی ضد ہے۔ ہر وہ چیز جسے شریعت نے قبیح، حرام اور مکروہ کہا ہے، منکر ہے۔

---

[1] النہایۃ فی غریب الحدیث والاثر، مادہ 'عرف': ۳/ ۲۱۶

[2] النہایۃ فی غریب الحدیث والاثر، مادہ 'نکر': ۵/ ۱۱۵

علّامہ صاوی لکھتے ہیں:

المعروف المراد بـه ماطلبه الشارع اماعلیٰ سبیل الوجوب کالصلوٰت الخمس وبرّ الوالدین و صلة الرحم اوالندب کالنوافل و صدقات التطوع ... المنکر المراد به مانهی عنه الشارع اما علی سبیل الحرمة کالزنا و السرقة اوعلی سبیل الکراهة[۱]

معروف سے مراد ایسے امور ہیں جن کا کرنا شارع (اللہ تعالیٰ) یا تو ہم پر واجب قرار دے، جیسے کہ پانچ وقت کی نمازیں یا والدین کے ساتھ حسنِ سلوک اور صلہ رحمی یا جسے اس نے مندوب ٹھیرایا ہو، مثلاً نفل نمازیں یا نفل صدقات ... منکر سے مراد وہ چیز ہے جسے شارع نے حرام قرار دے کر اس سے منع فرمایا ہو، جیسے زنا اور چوری یا جسے اس نے ناپسندیدہ قرار دیا ہو۔

علّامہ عبد القادر عودہ شہید کہتے ہیں:

الامربالمعروف والنهی عن المنکر یدخل فیه الامر بکل ما اوجبت الشریعة عمله اوجبت للناس فعله من صلاة وصیام وحج وتوحید وغیر ذٰلک، والنهی عن المنکر یدخل فیه النهی عن کل ما خالف الشریعة من افعال وعقائد فید خل فیه النهی عن التثلیث وعن القول بصلب المسیح وقتله وید خل فیه النهی عن الترهب وعن شرب الخمر وعن اکل لحم الخنزیر وغیر ذٰلک مما تخالف فیه الشریعة الاسلامیة الادیان الاخری[۲]

امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں ہر وہ عمل شامل ہے جس کا کرنا شریعت نے واجب یا پسندیدہ قرار دیا ہو، جیسے نماز، روزہ، حج توحید وغیرہ۔ نہی عن المنکر میں ان تمام اعمال و عقائد سے منع کرنا شامل ہے جو شریعت کے مخالف ہوں۔ اس میں تثلیث کے عقیدے سے اور اس عقیدے سے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو صلیب پر چڑھایا گیا یا ان کو قتل کیا گیا، منع کرنا شامل ہے۔ اسی طرح اس میں رہبانیت، شراب نوشی، سور کا گوشت کھانے اور ایسی تمام چیزوں سے منع کرنا بھی داخل ہے جن میں اسلامی شریعت دوسرے مذاہب سے مختلف ہے۔

۱۔ حاشیہ الصاوی علی تفسیر الجلالین: ۱/ ۱۵۲

۲۔ التشریع الجنائی الاسلامی مقارنا بالقانون الوضعی: ۱/ ۴۹۷

ان تفصیلات سے بالکل واضح ہے کہ معروف ومنکر ایسے الفاظ نہیں ہیں کہ انسان جس چیز پر چاہے ان کا اطلاق کرے، بلکہ ان سے اللہ تعالیٰ کی مرضی ونامرضی کا اظہار ہوتا ہے۔ کسی چیز کے معروف یا منکر ہونے کا فیصلہ کرنا انسان کا کام نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شریعت ہی یہ بتا سکتی ہے کہ کون سی چیز معروف ہے اور کون سی چیز منکر؟ جو شخص یہ سمجھتا ہو کہ کسی چیز کو معروف یا منکر قرار دینا خدا کی شریعت کا نہیں، اس کا اپنا حق ہے، وہ اللہ کی بجائے اپنی ذات کو شارع اور قانون ساز سمجھتا ہے۔ یہ اللہ کا انکار ہی نہیں، اس سے بغاوت بھی ہے، جس کے تصور ہی سے انسان کانپ جاتا ہے۔



وسعت اور جامعیت

امر بالمعروف و نہی عن المنکر دعوتی اور تربیتی کام ہے

امر بالمعروف و نہی عن المنکر دراصل دو کاموں کا مجموعہ ہے، دعوت و تبلیغ اور تنظیم و تربیت۔ یہ دونوں کام ایک فطری ترتیب کے ساتھ انجام پاتے ہیں۔ پہلے اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف لوگوں کو بلایا جاتا ہے، اس کے بعد ان افراد کی تنظیم اور تربیت کی جاتی ہے جو اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔ اسی تنظیم اور تربیت پر دعوت کی کام یابی اور ناکامی کا انحصار ہوتا ہے۔ اگر تنظیم مضبوط اور تربیت صحیح ہے تو دعوت کام یاب ہوگی، ورنہ اس کی ناکامی یقینی ہے۔ اس لیے دعوت و تبلیغ اور تنظیم و تربیت کے درمیان بہت ہی گہرا اور قریبی ربط ہے۔ دعوت کے بغیر تنظیم و تربیت وجود میں نہیں آسکتی اور تنظیم و تربیت کے بغیر دعوت کا اپنی آخری منزل تک پہنچنا ناممکن ہے۔

اس میں شک نہیں کہ دعوت و تبلیغ اور تنظیم و تربیت کے مخاطب جدا جدا ہوتے ہیں۔ اللہ کے دین کی دعوت ان لوگوں کو دی جاتی ہے جنھوں نے ابھی اسے قبول نہیں کیا ہے اور جو لوگ اسے قبول کرچکے ہیں ان کی تنظیم و تربیت کی جاتی ہے، لیکن اس کے باوجود یہ دونوں کام ایک ہی مقصد کے تحت انجام پاتے ہیں۔ ایک شخص جو اللہ اور رسول پر ایمان رکھتا ہے اور اس کے دین کو دینِ حق سمجھتا ہے وہ اسی کی طرف دنیا کو دعوت دے گا اور اسی کی اساس پہ لوگوں کو جمع کرے گا۔ اس کے برخلاف جو شخص اللہ اور رسول کا

منکر اور اس کے دین کا مخالف ہے اس کی تبلیغ و تنظیم بھی اس بنیاد پر ہوگی۔ اس لیے گو بہ ظاہر یہ دو کام ہیں، لیکن حقیقت میں ایک ہی کام کے دو رُخ ہیں۔

امتِ مسلمہ کو دعوت و تبلیغ اور تنظیم و تربیت دونوں ہی کام کرنے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اسے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض اپنے دائرے کے باہر بھی انجام دینا ہے اور اندر بھی۔ جو کام وہ اپنے دائرے سے باہر کرے گی اسے ہم دعوت و تبلیغ کہیں گے اور جو عمل وہ اپنے دائرے کے اندر انجام دے گی اسے تنظیم و تربیت کہا جائے گا۔ ہمارے مفسرین فرماتے ہیں کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں ایمان و اسلام کی دعوت، غیر اللہ کی عبادت اور بندگی کی مخالفت، کفر و شرک کی تردید اور اللہ کی راہ میں جہاد بھی شامل ہے اور حدود و تعزیرات کا قیام، انفاق فی سبیل اللہ، اتباعِ سنت اور اجتنابِ بدعت کی تلقین بھی داخل ہے۔ ظاہر ہے، یہ دو طرح کے کام ہیں۔ ان میں سے اول الذکر کا تعلق دعوت سے ہے اور ثانی الذکر کا تنظیم و تربیت سے۔ یہی نہیں کہ مفسرین امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں ان دونوں قسم کے کاموں کو شامل سمجھتے ہیں، بلکہ وہ اس سے متعلق تقریباً ہر آیت کے ذیل میں ان کا ایک ہی ساتھ ذکر کرتے ہیں، خواہ اس آیت کا تعلق اپنے الفاظ کے ظاہر کے لحاظ سے دعوت سے ہو یا تنظیم و تربیت سے۔ گویا قرآن مجید میں جہاں بھی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا حکم ہے وہ اپنے اندر یہ ہدایت لیے ہوئے ہے کہ امت کو اپنی اصلاح بھی کرنی ہے اور دوسروں کے درمیان اللہ تعالیٰ کے دین کو قائم بھی کرنا ہے۔ یہاں ہم کسی قدر وضاحت سے اس پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

امت مسلمہ کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر دوسروں میں انجام دینا ہے

اللہ تعالیٰ امتِ مسلمہ سے جو کام لینا چاہتا ہے، اسے اس نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ   تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لیے نکالا

تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران:۱۱۰)

گیا ہے۔ تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

آیت کا اندازِ بیان صاف بتا رہا ہے کہ اس کے اندر جس امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ذکر ہے اسے امتِ مسلمہ کو اپنے دائرے سے باہر انجام دینا ہے۔ یہ امت بحیثیت امت "لوگوں کے لیے نکالی گئی ہے" اور اس لیے نکالی گئی ہے کہ لوگوں کو معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے۔ وہ خود بخود وجود میں نہیں آئی ہے، بلکہ انسانوں کی اصلاح و ہدایت کے ایک متعین مقصد کے لیے برپا کی گئی ہے اور ایک بڑا کام اسے انجام دینا ہے۔ وہ یہ کہ دنیا کو راہِ ہدایت دکھائے اور دینِ حق کی دعوت دے۔ ہر گروہ اپنا مقصدِ حیات متعین کرنے میں اور ہر جماعت اپنی راہ تلاش کرنے میں آزاد ہے، لیکن 'خیر امت' اس گروہ کا نام ہے جو اپنے اس اختیار سے دست کش ہو چکا ہے اور اللہ کے دیے ہوئے نصب العین کو بے چون و چرا تسلیم کر چکا ہے۔ اس لیے اسے یہ حق ہی نہیں پہنچتا کہ خود سے کوئی راہ متعین کرے اور اس پر دوڑنا شروع کر دے۔ جس دن امتِ مسلمہ اس 'جرم' کا ارتکاب کرے گی وہ 'خیرِ امت' کے مقام پر باقی نہیں رہ سکتی۔ اسے دنیا میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا حکم ملا ہے اور اس حکم کو بجا لانا اس کی زندگی کا مقصد ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ڈیوٹی پر لگائی گئی ہے اور اس کی کام یابی و ناکامی کا فیصلہ کل قیامت کے دن اسی بنیاد پر ہونے والا ہے کہ اس نے اس ڈیوٹی کو انجام دیا یا نہیں؟

شیخ ابوالسعود نے 'اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ' کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:

اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ صفة لِاُمة واللام متعلقة باخرجت ای اظهرت لهم فقیل بخیر امة ای کنتم خیر الناس للناس فهو صریح فی ان الخیریة بمعنی النفع للناس

'اخرجت للناس' کا ٹکڑا 'امت' کی صفت ہے۔ 'للناس' میں لام متعلق ہے اُخرجت سے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگوں کے لیے ظہور میں لائی گئی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ لام کا تعلق لفظ 'خیر امت' سے ہے، اس کا مطلب ہے تم لوگوں کے حق میں بہترین انسان ہو، جو اس امر کی صریح دلیل ہے کہ 'خیر'

و ان فهم ذٰلک من الإخراج لهم ایضا ای اخرجت لِاَجلهم و مصلحتهم[1]

ہونے کے معنی لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے ہیں۔ اگرچہ یہ بات اس وقت بھی سمجھ میں آتی ہے جب پہلی رائے کو اختیار کیا جائے، کیوں کہ یہ امت 'لوگوں کے لیے نکالی گئی ہے' کے بھی یہی معنی ہیں کہ وہ لوگوں کے فائدے اور ان کی مصلحت کی خاطر وجود میں لائی گئی ہے۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں:

قوله اُخرِجَتْ لِلنَّاسِ فیه قولَان الُاول: ان المعنی کنتم خیر الأُمم المخرجة للناس فی جمیع الُاعصار، فقوله اُخرِجَتْ لِلنَّاسِ ای اظهرت للناس حتی تمیّزت و عرف وفصل بینها و بین غیرها، و الثانی: ان قوله للناس من تمام قوله کنتم و التقدیر کنتم للناس خیر امة[2]

'اخرجت للناس' کی تفسیر میں دو قول ہیں: پہلے قول کے مطابق معنی یہ ہیں کہ لوگوں کی اصلاح و ہدایت کے لیے تمام زمانوں میں جتنی امتیں نکالی گئی ہیں ان سب میں تم بہترین امت ہو۔ پس 'اخرجت للناس' کا مطلب یہ ہوا کہ وہ لوگوں کے لیے ظاہر کی گئی، یہاں تک کہ وہ ممتاز ہوگئی اور پہچانی جاچکی اور اس کو دوسری قوموں سے الگ کر کے نمایاں کر دیا گیا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ لفظ 'الناس' 'کنتم' سے شروع ہونے والے جملے ہی کا ایک جزو ہے، جس کے پیش نظر معنی یہ ہوں گے کہ تم لوگوں کے لیے بہترین امت ہو۔

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں:

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ قال خیرالناس للنّاس تأتون بهم فی السلاسل فی اعناقهم حتی

''تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لیے وجود میں لایا گیا ہے۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگوں کے حق میں بہترین انسان ہو کہ انھیں گردنوں میں زنجیریں ڈال کر لاتے ہو، یہاں تک

---

[1] ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم: ۲/ ۴۹۶

[2] مفاتیح الغیب، المجلد الرابع، الجزء ۸، ص ۱۵۶

یدخلوا فی الاسلام[1] کہ وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہوجاتے ہیں۔"

امت مسلمہ کے بارے میں حضرت ابوہریرہؓ کے اس قول 'خیر الناس للناس' (انسانوں کے لیے بہترین انسان) کی تشریح حافظ ابن حجر نے ان الفاظ میں کی ہے:

ای خیر بعض الناس لبعضھم ای انفعھم لھم وانما کان ذلک لکونھم کانوا سببًا فی اسلامھم[2]

یعنی لوگوں میں سے بعض بہتر ہیں بعض کے لیے۔ مطلب یہ کہ وہ ان کو سب سے بڑا نفع پہنچاتے ہیں، کیوں کہ وہ ان کے اسلام کا ذریعہ بنتے ہیں۔

ہم نے اوپر جو عبارتیں نقل کی ہیں ان میں بعض ایسی لفظی بحثیں آ گئی ہیں جو یقیناً عام دلچسپی کی نہیں ہیں، لیکن محض اس لیے ان کو نقل کیا گیا ہے، تاکہ قرآن کے ایک ایسے ارشاد کی خالص علمی و ادبی انداز میں توضیح ہوجائے جس کا تعلق اس امت کے مقصدِ حیات سے ہے۔ قرآن کا فرمانا ہے کہ 'امت مسلمہ لوگوں کے لیے نکالی گئی ہے۔' ان مباحث کی روشنی میں اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ امت انسانوں کے لیے دنیا کی ہر قوم، ہر جماعت اور ہر ملت سے زیادہ نفع پہنچانے والی ہے، کیوں کہ وہ ان کو سیدھی راہ دکھاتی ہے، خدا کے دین کی طرف دعوت دیتی ہے اور دائرۂ اسلام میں لاتی ہے۔ اسی بات کو قرآن نے آگے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ "تم معروف کا حکم دیتے اور منکر سے روکتے

---

[1] بخاری، کتاب التفسیر (سورۂ آل عمران) باب کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ حضرت ابو ہریرہؓ کے اس قول کا مطلب یہ نہیں ہے کہ امت مسلمہ دوسروں کو زبردستی مسلمان بنائے اور ان پر اپنا دین و ایمان مسلط کردے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس 'خیر' کے لیے امت مسلمہ دنیا سے جنگ کرتی ہے اس 'خیر' کا اسے اپنے اخلاق، اپنی سیرت، اپنے کردار اور مخالفین کے ساتھ اپنے سلوک میں مکمل نمونہ ہونا چاہیے۔ وہ 'خیر' کی طرف دعوت دے اور ساتھ ہی دنیا کے لیے اسوۂ خیر بن جائے، یہاں تک کہ جن دلوں میں اس کے خلاف بغض و نفرت کے جذبات ہوسکتے ہیں، وہ بھی خیر کی طرف کھنچ پڑیں۔ امت جب اس حیثیت میں ہوگی تو ان لوگوں کے سینے بھی اسلام کے لیے کھل جائیں گے جن کو اس نے 'خیر' سے بغاوت کی بنا پر گرفتار کیا ہوگا اور وہ اللہ کی رحمت کے مستحق ہوجائیں گے۔

[2] فتح الباری: ۸/۱۵۶

ہو۔" اس سے قطعی طور پر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' فی الواقع دعوتی کام ہے اور امت مسلمہ کو تمام انسانوں کے درمیان یہ کام انجام دینا ہے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے دعوتی پہلو کا وہی شخص انکار کرسکتا ہے جس نے یا تو الفاظ قرآن پر غور نہ کیا ہو یا قصداً اس کے اس رخ کا انکار کرنا چاہتا ہو۔

شہادت علی الناس میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر شامل ہے

اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے ٹھیک وہی بات قرآن نے ایک دوسرے موقعے پر ان الفاظ میں کہی ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرۃ: ۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تم کو 'امت وسط' (یعنی بیچ کی امت) بنایا، تاکہ تم لوگوں کو (دین کے) بتانے والے بن جاؤ اور رسول تم کو (دین کے) بتانے والے ہوں۔

یہاں امت مسلمہ کو 'امت وسط' کہا گیا ہے اور وہاں 'خیر امت' کہا گیا تھا۔ ان دونوں میں معنی و مدعا کا کوئی فرق نہیں ہے۔ کیوں کہ خیر امت وہی ہوگی، جس کا دامنِ فکر و عمل افراط و تفریط سے محفوظ ہو اور جو زندگی کے میدان میں توازن اور اعتدال پر جمی رہے۔ امت کے کام کو یہاں 'شہات علی الناس' سے تعبیر کیا گیا ہے اور وہاں 'اخوجت للناس تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر' کے الفاظ استعمال کیے گئے تھے۔ لیکن 'شہادت علی الناس' کے مفہوم میں یہ بات لازماً شامل ہے کہ لوگوں کو معروف کا حکم دیا جائے اور منکر سے منع کیا جائے۔ دونوں ہی تعبیرات امت کو اس کی دعوتی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کرتی ہیں[1]

امت کی اصلاح و تربیت بھی امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ امت مسلمہ کے بارے میں قرآن کا یہ اعلان

---

(۱) 'شہادت علی الناس' پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب 'تجلیاتِ قرآن'

کہ 'کُنتُمۡ خَیۡرَ اُمَّةٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ' اس کے دعوتی کام کا اعلان ہے، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ امت کی اپنی اندرونی اصلاح اور تربیت وتنظیم کا کام آیت کے مفہوم سے خارج ہے۔ کیوں کہ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ امتِ مسلمہ جس طرح دعوت سے غافل نہیں ہوسکتی اسی طرح اپنی اصلاح اور تنظیم و تربیت سے بھی ایک لمحہ کے لیے صرفِ نظر نہیں کرسکتی۔ جو کام وہ اپنے دائرے سے باہر کرنا چاہتی ہے وہ اس کے لیے اپنے دائرے کے اندر بھی کرنا ضروری ہے۔ وہ دوسروں کے سلسلے میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض انجام دینے سے پہلے اپنے آپ کو معروف کا حکم دے گی اور منکر سے باز رکھے گی۔ اگر وہ اپنے اوپر معروف کو قائم نہ کرے اور اپنے آپ کو منکر سے نہ روکے تو دوسروں کو صحیح معنی میں نہ تو معروف کا حکم دے سکتی ہے اور نہ منکر سے منع کرسکتی ہے۔ اس لیے یہ دونوں ہی قسم کے کام آیت کے مفہوم میں شامل ہیں۔

علامہ صاوی کہتے ہیں:

قوله للناس انما عبرباللام دون من اشارة الى ان هذهِ الُامة نفع و رحمة لنفسها وللخلق عموماً فی الدنیا بالدعاء لجمیع الاَمم وفی الُاخرة بالشهادة للانبیاء[1]

قرآن نے 'لوگوں کے لیے' کہا ہے: 'لوگوں میں سے' نہیں کہا ہے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ امت اپنے لیے بھی اور خدا کی تمام مخلوق کے لیے بھی دنیا و آخرت میں سراپا نفع و رحمت ہوگی۔ وہ اس طرح کہ دنیا میں وہ تمام قوموں کو دینِ حق کی طرف بلائے گی اور آخرت میں انبیاء کے حق میں گواہی دے گی۔

ملا جیون کہتے ہیں:

اخرجت للناس ای للانبیاء للشهادة علیٰ دعوتهم اوللکفار لقتالهم او للمومنین عامة[2]

(یہ امت) لوگوں کے لیے نکالی گئی ہے۔ یعنی انبیا کے لیے، تاکہ ان کی دعوت پر گواہی دے، یا کفار کے لیے تاکہ ان سے جنگ کرے، یا عام مومنین کے لیے۔

---

[1] حاشیة الصاوی علی تفسیر الجلالین: ۱/ ۱۵۳

[2] التفسیرات الاحمدیة: ص ۱۲۴

علامہ صاوی کے یہ الفاظ کہ ''امت اپنے لیے بھی اور خدا کی تمام مخلوق کے لیے بھی دنیا و آخرت میں نفع و رحمت ثابت ہوگی'' ظاہر کر رہے ہیں کہ امت کو دعوتی اور تنظیمی دونوں ہی کام کرنے ہیں۔ اس کے 'خیر امت' ہونے کا تقاضا ہے کہ وہ 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کا فرض اپنے دائرے کے اندر بھی انجام دے اور باہر بھی۔ اسی بات کو ملا جیون نے یوں کہا ہے کہ ''یہ امت کفار سے جنگ کے لیے برپا کی گئی ہے یا عام اہلِ ایمان کے لیے قائم کی گئی ہے۔[1]

قرآن نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا عام حکم دیا ہے

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی وسعت اور جامعیت کو سمجھنے کے لیے ایک دوسری آیت پر غور کیجیے، جس میں امتِ مسلمہ کو حکم ہے کہ:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّـةٌ يَّدْعُـوْنَ اِلَى الْخَـيْرِ وَ يَاْمُـرُوْنَ بِالْمَعْـرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (آل عمران: ۱۰۴)

تم میں ایک گروہ ضرور ایسا ہونا چاہیے جو خیر کی طرف بلائے اور معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے اور یہی لوگ کام یابی پانے والے ہیں۔

پہلی آیت میں 'اخرجت للناس' کے الفاظ بتا رہے تھے کہ یہ امت تمام لوگوں کے لیے نکالی گئی ہے، تاکہ انھیں معروف کا حکم دے اور منکر سے منع کرے۔ اور اس آیت میں دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا بالکل عام حکم دیا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس آیت میں بھی 'اخرجت للناس' کے معنی موجود ہیں۔ کیوں کہ

---

[1] علامہ صاوی اور ملا جیون نے اپنی تشریحات کے ذیل میں امت مسلمہ کے انبیاء کے حق میں گواہی دینے کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن امت مسلمہ اس بات کی شہادت دے گی کہ جس طرح محمد ﷺ نے اس تک خدا کا دین پہنچایا تھا اسی طرح ہر دور میں اللہ کے پیغمبر اپنی اپنی قوموں تک اس کا دین پہنچاتے رہے ہیں۔ اب اگر کوئی قوم اس حقیقت کا انکار کرتی ہے تو جھوٹ کہتی ہے اور اپنے جرم کو چھپانا چاہتی ہے۔

یہاں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ امت کو کسی مخصوص گروہ یا جماعت کے درمیان امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض انجام دینا ہے، بلکہ بات پورے عموم کے ساتھ کہی گئی ہے۔ اس لیے امت کی ذمے داری اسی وقت ساقط ہوگی جب کہ وہ ہر گروہ اور ہر جماعت یعنی تمام انسانوں کو معروف کا حکم دے اور منکر سے منع کرے۔ علامہ سید محمود آلوسی فرماتے ہیں:

حذف المفعول الصریح من الأفعال الثلاثة اما للاعلام بظهوره ای یدعون الناس و لو غیر مکلّفین و یامرونهم و ینهونهم و اما للقصد الی ایجاد نفس الفعل علی حد فلان یعطی ای یفعلون الدعاء و الأمر و النهی و یوقعونها[1]

مفعول صریح تینوں افعال سے حذف کر دیا گیا ہے (یعنی آیت میں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کام کس پر کیا جائے) یہ حذف یا تو یہ ظاہر کرنے کے لیے ہے کہ ان افعال کا مفعول خود بخود واضح ہے، یعنی یہ کہ وہ لوگوں کو دعوت دیتے ہیں، خواہ وہ غیر مکلّف ہی کیوں نہ ہوں اور انھیں معروف کا حکم دیتے اور منکر سے منع کرتے ہیں، یا اس حذف کی غرض یہ ہے کہ اصل مقصد فعل کا وجود میں آنا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے فلاں شخص عطا کرتا رہتا ہے (اس سے یہ بیان کرنا مقصود نہیں ہوتا کہ وہ کسے عطا کرتا ہے) پس اس لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہوا کہ وہ دعوت اور امر و نہی کے فرائض انجام دیتے ہیں اور ان کو وجود میں لاتے ہیں۔

گویا علامہ موصوف کے نزدیک آیت کے عموم کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں: ایک یہ کہ بلا استثنا سبھی کو معروف کا حکم دیا جائے اور منکر سے منع کیا جائے، دوسری وجہ یہ کہ مقصد صرف یہ واضح کرنا ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کام اس امت سے انجام پاتا رہتا ہے۔ یہ بتانا پیشِ نظر سرے سے ہے ہی نہیں کہ کس گروہ اور جماعت کے درمیان یہ انجام پا رہا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس شکل میں آیت کے عموم کی غرض و غایت پوری طرح واضح نہیں ہوتی۔ سیدھی اور صاف بات ہے کہ قرآن نے امر بالمعروف و نہی

---

[1] روح المعانی، المجلد الثانی، الجزء ۴، ص ۲۳۸

المنکر کا بالکل عام حکم دیا ہے اور امت کو اسی عموم کے ساتھ اس پر عمل کرنا ہے۔ ایک طرف بے شمار انسان اللہ تعالیٰ کے دین سے بے بہرہ اور غافل ہیں اور دوسری طرف امت مسلمہ پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض عائد ہوتا ہے۔ یہ فرض امت سے اسی وقت ساقط ہوگا جب کہ وہ پوری قوت کے ساتھ اللہ کے دین کو ان تمام انسانوں تک پہنچانے کی کوشش کرے جو اس سے یا تو بالکل محروم ہیں یا اس کو ماننے کے باوجود اس کے باغی اور منحرف ہیں۔ امت کے اس کام کو ہم کسی بھی گروہ کے ساتھ مخصوص نہیں کرسکتے۔ کیوں کہ اگر امت نے انسانیت کے ایک طبقہ کو اللہ کے عذاب سے بچانے کی کوشش کی اور دوسرے کو اس میں گرفتار ہونے دیا تو یہ قرآن کے منشا کی خلاف ورزی ہوگی اور وہ اپنی ذمے داری سے کبھی سبک دوش نہ ہوسکے گی۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہر اس فرد اور ہر اس قوم تک اس کا دین پہنچے جو اس سے ناواقف ہے۔ جہاں معروف مٹ رہا ہو اسے وہاں زندہ کیا جائے اور جہاں منکر فروغ پا رہا ہو وہاں اسے ختم کیا جائے۔ برائی خواہ کسی فرد میں ہو یا کسی خاندان اور قبیلے میں، کوئی محلّہ منکرات میں مبتلا ہو یا کوئی شہر، بگاڑ ملت میں ہو یا پورے ملک اور وطن میں، اسے لازماً ختم ہونا چاہیے، یہاں تک کہ ہر فرد اور ہر جماعت اللہ کے دین اور اس کی شریعت کی مطیع اور اس کے احکام کی تابع ہوجائے۔

حقیقت یہ ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر قرآن کی بہت ہی جامع اصطلاح ہے۔ معروف ومنکر میں اللہ کا دین اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں اس دین کی ہر چھوٹی بڑی خدمت آجاتی ہے۔ اسی وجہ سے ابن العربی مالکی کہتے ہیں:

الاَمر بالمعروف و النّهی عن المنكر باب عظیم هو ابتداء الدین و الاِسلام وهوايضاً انتهاؤه[1]	امر المعروف و نہی عن المنکر ایک عظیم موضوع ہے۔ دین اور اسلام کی وہ ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی۔

قرآن مجید کی ہدایات اور اہل علم کی تصریحات سے واضح ہے کہ امر بالمعروف

---

[1] احکام القرآن: ۱/ ۲۹۵

ونہی عن المنکر' میں دعوت وتبلیغ اور تنظیم وتربیت دونوں ہی قسم کے کام شامل ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امت مسلمہ کو یہ فرض غیر اسلامی ماحول میں بھی انجام دینا ہے اور اسلامی ماحول میں بھی۔ غیر اسلامی ماحول میں باطل افکار پر تنقید کرنا، کفر وشرک کے مقابلے میں پوری قوت سے اسلام کو پیش کرنا، باطل کو مٹانے اورحق کو کامیاب بنانے کی جدوجہد کرنا اور اس راہ میں جان و مال کی بازی لگا دینا امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ اسلامی معاشرے میں اس کا تقاضا یہ ہے کہ اسے مضبوط بنایا جائے، اس میں بگاڑ نہ پیدا ہونے دیا جائے، اس کی اصلاح کی کوشش کی جائے اور اسے اس قابل بنایا جائے کہ وہ دنیا میں اسلام کی سربلندی کا ذریعہ بن جائے۔



دعوتِ دین

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دین محمد ﷺ پر انتہائی مخالف ماحول میں نازل ہوا۔ اس کا نظام وقت کے نظام سے اور اس کا مزاج وقت کے مزاج سے بالکل مختلف تھا۔ اس کا طریقۂ کارعمل کی ان راہوں سے الگ تھا جن پر دنیا چل رہی تھی۔ لوگ اس سے نامانوس تھے اور اس کے نام سے وحشت محسوس کرتے تھے جو باہمت نفوس اس کو قبول کرتے وہ اپنے حلقوں سے کٹ جاتے اور ماحول ان کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہوتا۔ لیکن آہستہ آہستہ حالات میں تبدیلی رونما ہوئی اور لوگ اللہ کے دین سے مانوس ہونے لگے۔ مختلف گروہوں سے افراد کھنچ کھنچ کر اس کی طرف آنے شروع ہوئے اور اس کی جڑیں مضبوط ہوتی چلی گئیں۔ اس دین کی خاطر حضور اکرم ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ نے بڑی قربانیاں دیں۔ ایسی قربانیاں کہ تاریخ ان کی مثال نہیں پیش کرسکتی۔ وہ بے سروسامان تھے، کم زور تھے اور گنتی میں چند تھے۔ اس کے بالمقابل ان کے دشمن ہر طرف پھیلے ہوئے تھے اور ساز و سامان اور عددی قوت کے لحاظ سے بہت طاقت ور تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپؐ کے صحابہؓ کبھی پست ہمت نہیں ہوئے۔ وہ صبر و ثبات کے ساتھ اپنے مخالفین کا مقابلہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ حریف طاقتوں پر ان کو غلبہ نصیب ہو اور اللہ تعالیٰ کی زمین پر اس کی حکومت قائم ہوگئی۔ آج سے چودہ سو سال قبل انجام پانے والا یہ کارنامہ 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کی جامع اور مستند اور عملی تفسیر

ہے۔ اس کارنامہ کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ تین مختلف کاموں پر مشتمل ہے:

(۱) دعوت و تبلیغ

(۲) جہاد فی سبیل اللہ اور

(۳) اسلامی ریاست کا قیام

ان میں سے ہر کام امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے، کیوں کہ ان سب کا واحد مقصد ہے معروف کا قائم کرنا اور منکر کا مٹانا۔ جو دعوت، جو جہاد اور جو حکومت امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے نہیں ہے نہ وہ دعوت اللہ کے دین کی دعوت ہے، نہ وہ جہاد اللہ کی راہ میں جہاد ہے اور نہ وہ حکومت اللہ کی فرماں روائی اور اس کے قانون کی حکومت ہے۔

یہاں ہم پہلے دعوت و تبلیغ پر گفتگو کریں گے۔ اس کے بعد جہاد فی سبیل اللہ اور اسلامی ریاست سے بحث ہوگی۔

دین و شریعت کی تبلیغ

'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کی اصطلاح میں امر و نہی کے الفاظ سے بعض اوقات یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید یہ دعوتی اور تبلیغی کام نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے اقتدار اور حکومت کی ضرورت ہے۔ لیکن گزشتہ صفحات میں ہم نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا جو معنی و مفہوم بیان کیا ہے اور اس کی وسعت و جامعیت پر جو بحث کی ہے، اس سے خود بخود اس شبہ کی تردید ہوجاتی ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں دین کی دعوت و تبلیغ بھی شامل ہے۔ تاہم یہاں اہلِ علم کی مزید دو تین تصریحات پیش کی جارہی ہیں۔

قرآن نے خیر امت کا امتیازی وصف یہ بیان کیا ہے کہ وہ معروف کا حکم دیتی ہے اور منکر سے روکتی ہے۔ اس کی تشریح میں علامہ ابن جریر طبری فرماتے ہیں:

قوله تامرون بالمعروف فانه یعنی تامرون بالایمان باللّٰہ ورسوله و العمل بشرائعه وتنهون عن المنکر یعنی وتنهون عن الشرک باللّٰہ و تکذیب رسوله و عن العمل بما نهی عنه[1]

'تم معروف کا حکم دیتے ہو' اس سے اللہ تعالیٰ کی مراد یہ ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان اور اس کی شریعت پر عمل کا حکم دیتے ہو۔ 'منکر سے منع کرتے ہو' اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اللہ کے ساتھ شرک، اس کے رسولؐ کی تکذیب اور جن چیزوں سے اس نے منع کیا ہے ان کے ارتکاب سے منع کرتے ہو۔

ملا جیون کہتے ہیں:

تامرون بالمعروف ای بالایمان بمحمد والقرآن او بجمیع الطاعات و تنهون عن المنکر ای عن الکفر وسائر المعاصی[2]

'تم معروف کا حکم دیتے ہو' یعنی محمد ﷺ اور قرآن پر ایمان کا حکم دیتے ہو، یا یہ کہ تم تمام اطاعتوں کا حکم دیتے ہو۔ 'منکر سے منع کرتے ہو' یعنی کفر اور تمام معصیتوں سے منع کرتے ہو۔

اسی طرح قرآن کا یہ حکم کہ دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے امت میں لازماً ایک گروہ ہونا چاہیے، امام شوکانی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

عن الضحاک فی قوله یامرون بالمعروف قال یدعون الی الایمان باللّٰہ ورسوله والنفقات فی سبیل اللّٰہ وما کان من طاعة اللّٰہ و ینهون عن الشرک والکفر[3]

ضحاک فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے جو 'معروف کا حکم دے' اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لانے، اس کی راہ میں خرچ کرنے اور اس کے ہر حکم کی اطاعت کی دعوت دے۔ 'منکر سے منع کرے' یعنی شرک و کفر سے منع کرے۔

ان تصریحات کے بعد کوئی شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ

---

[1] جامع البیان فی تفسیر القرآن: ۲۸/۴
[2] التفسیرات الاحمدیہ، ص ۱۲۴
[3] فتح القدیر: ۱/۳۷۱

علماء امت کے نزدیک امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ لوگوں کو اللہ اور اس کے رسولؐ اور قرآن کی طرف دعوت دی جائے اور شرک، کفر اور انکار رسالت سے منع کیا جائے، بلکہ مشہور تابعی ابو العالیہ نے یہاں تک کہا ہے:

کل ماذکره الله فی القرآن من الأمر بالمعروف و النهی عن المنکر، فالأمر بالمعروف دعاء من الشـرک الی الاسـلام و النهی عن المنکر النهی عن عبادة الأوثان والشیاطین[1]

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا جو بھی ذکر کیا ہے اس میں امر بالمعروف کا مطلب ہے شرک سے اسلام کی طرف دعوت دینا اور نہی عن المنکر سے مراد ہے بتوں اور شیاطین کی عبادت سے روکنا۔

محمد ﷺ کو مکہ میں امر بالمعروف کا حکم دیا گیا

یہ معلوم کرنے کی، کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر دعوتی کام بھی ہے یا محض سیاسی کام؟ سب سے اطمینان بخش شکل یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے کارناموں پر نظر ڈالی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ آپؐ نے امر بالمعروف کا فریضہ صرف اقتدار وحکومت کے بعد ہی انجام دیا تھا یا اس سے پہلے بھی انجام دیا تھا؟ آپؐ کی ذات ہمارے لیے اُسوہ ہے۔ ہمیں اس راہ پر چلنا ہے جس پر آپؐ کے نقشِ پا ثبت ہیں اور وہ کام کرنا ہے جو آپؐ نے کیا تھا۔ اس سوال کا جواب ہمیں سورۂ اعراف میں ملتا ہے، جس میں آپ کو امر بالمعروف کا حکم دیا گیا ہے۔ سورۂ اعراف مکی ہے۔ اس سورہ میں امر بالمعروف کا حکم یہ ظاہر کر رہا ہے کہ 'امر بالمعروف' غیر اسلامی ماحول میں تبلیغ دین کا بھی نام ہے۔ کیوں کہ جب تک آپؐ مکہ میں رہے اللہ کے دین کی تبلیغ ہی فرماتے تھے۔ اس وقت آپؐ حکم راں نہیں تھے کہ ریاست کے ذریعے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض انجام دیتے۔ یہ نہ صرف اس بات کی دلیل ہے کہ امر بالمعروف میں دعوت و تبلیغ بھی شامل

---

[1] جامع البیان فی تفسیر القرآن، ابن جریر: ۱۰/ ۱۰۹

ہے، بلکہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ امر بالمعروف کا آغاز تبلیغ و دعوت ہی سے ہوتا ہے۔ اس کی سیاسی حیثیت اس کے بعد شروع ہوتی ہے۔ اب آپ وہ حکم سنئے جو سورۂ اعراف میں نازل ہوا ہے:

خُذِ الْعَفْوَ وَ اْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ (الاعراف: ۱۹۹)	درگزر کرو، معروف کا حکم دو اور جاہلوں سے اپنا رُخ پھیر لو۔

آیت میں 'عرف' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو معروف کے ہم معنی ہے اور معروف، جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، اللہ کے دین اور اس کی پوری شریعت کو کہا جاتا ہے۔ یہ حکم آپ کو ایک ایسے ماحول میں ملا جس پر شرک کی حکومت تھی اور جو اپنے مزاج اور ساخت کے لحاظ سے سراسر توحید کے مخالف تھا۔ چناں چہ جب آپؐ نے توحید کا اعلان کیا تو سارا ماحول دشمن بن گیا، ہر طرف سے دشنام طرازی، لعن طعن اور مخالفت شروع ہوگئی اور آپؐ کو اس قدر صدموں اور اذیتوں سے دوچار ہونا پڑا کہ اس کے تصور ہی سے روح کانپ جاتی ہے۔ اس پس منظر میں امر بالمعروف کا مطلب واضح طور پر یہ ہے کہ حالات کی سنگینی اور نزاکت کے باوجود اللہ کا دین آپ اس کے بندوں تک مسلسل پہنچاتے رہیں اور اس میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کریں۔ یہاں یہ بات فراموش نہیں ہونی چاہیے کہ یہ دین کے کسی ایک پہلو کی تبلیغ کا حکم نہیں ہے، بلکہ پورے دین کی تبلیغ کا حکم ہے۔ دین کے کسی بھی حصے کو ہم اس حکم سے الگ نہیں کرسکتے۔

امام ابن جریر طبریؒ فرماتے ہیں:

ان اللّٰه امر نبيه صلى اللّٰه عليه وسلم ان يامر الناس بالعرف و هو المعروف فى كلام العرب ... فمن المعروف صلة الرحم من قطع واعطاء من حرم والعفو	اللہ نے اپنے نبی ﷺ سے کہا کہ آپ لوگوں کو عرف کا حکم دیں۔ کلامِ عرب میں 'عرف' معروف کو کہتے ہیں ... اور معروف میں یہ بات بھی شامل ہے کہ جو ہم سے رشتہ توڑے ہم اس سے رشتہ جوڑیں، جو ہمیں محروم کر دے ہم اس کا حق ادا کریں اور جو ہم پر زیادتی

عمن ظلم و کل ما امر اللّٰہ به من الاعمال اوندب الیه فهو من العرف ولم یخصص اللّٰـه من ذٰلک معنی دون معنی فالحق فیه ان یقال قد امر اللّٰہ نبیه صلی اللّٰہ علیه و سلم ان یامر عبـاده بالمعروف کله لاَ ببعض معانیه دون بعض[1]

کرے ہم اس سے درگزر کریں، اور وہ تمام اعمال جن کا اللہ نے حکم دیا ہے یا جن کی اس نے ترغیب دی ہے، معروف میں داخل ہیں۔ اللہ نے اپنے اس ارشاد میں 'معروف' کے کسی خاص اور محدود معنی کی تخصیص نہیں کی ہے۔ اس لیے اس معاملے میں صحیح بات جو کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ نے اپنے نبیؐ کو حکم دیا کہ وہ اس کے بندوں کو تمام معروفات کا حکم دیں، نہ یہ کہ بعض کا حکم دیں اور بعض کا نہ دیں۔

'امر بالمعروف' کی تفسیر خازن اور بغوی نے چند الفاظ میں کی ہے، لیکن اتنی بات وضاحت کے ساتھ کہہ دی ہے کہ یہ حکم اس پورے دین کی تبلیغ پر حاوی ہے جو اللہ کی طرف سے محمد ﷺ کو ملا ہے۔ خازن فرماتے ہیں:

و امر بالعرف یعنی وامر بکل ما امرک اللّٰہ به وهو ما عرفته بالوحی من اللّٰہ عز وجل و کل ما یعرفه الشارع[2]

'عرف' کا حکم دو، یعنی ہر اس چیز کا حکم دو جس کا اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے۔ اس میں وہ تمام باتیں شامل ہیں جو اللہ کی طرف سے نازل کردہ وحی کے ذریعہ آپؐ کو معلوم ہوں۔ ہر وہ چیز جسے شارع جانتا ہو 'عرف' ہے۔

علامہ بغوی کے الفاظ ہیں:

وامر بالعرف ای بالمعروف وهو کل ما یعرفه الشرع[3]

'عرف' یعنی معروف کا حکم دو۔ اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جسے شریعت جانتی ہو۔

علامہ سید محمود آلوسی فرماتے ہیں:

---

1. جامع البیان فی تفسیر القرآن: ۹/ ۹۸
2. لباب التاویل علیٰ معانی التنزیل: ۲/ ۲۷۰
3. معالم التنزیل علیٰ ہامش الخازن: ۲/ ۲۷۰

قال عطاء المراد بالعرف کلمة لاَ اله الاّ اللّٰہ وھو تخصیص من غیر داع[۱]

عطاء کہتے ہیں کہ 'عرف' سے مراد کلمہ لا الٰہ الا اللہ ہے۔ لیکن یہ تخصیص بے وجہ ہے (یعنی اسے عام ہونا چاہیے)

امر بالمعروف میں نہی عن المنکر شامل ہے

اس آیت میں صرف 'امر بالمعروف' کا ذکر ہے، 'نہی عن المنکر' کا ذکر نہیں ہے۔ اسی طرح بعض آیات و احادیث میں صرف 'نہی عن المنکر' کا ذکر ہے، 'امر بالمعروف' کا ذکر نہیں ہے، لیکن یہ الفاظ کی حد تک ہے، ورنہ امر بالمعروف کے حکم میں نہی عن المنکر اور نہی عن المنکر کے حکم میں امر بالمعروف خود بخود شامل ہے۔ ملاّ علی قاریؒ فرماتے ہیں:

الاُمر بالمعروف یعم النھی عن المنکر[۲] امر بالمعروف میں نہی عن المنکر شامل ہے۔

علقمی کہتے ہیں:

الاُمر بالشیء نھی عن ضدہ[۳] کسی چیز کا حکم دینا (حقیقت میں) اس کی ضد سے منع کرنا ہے۔

اسی طرح ایک حدیث میں رسولِ اکرم ﷺ نے 'تغییر منکر' کا تو حکم دیا ہے لیکن اس کی جگہ معروف کو قائم کرنے کا ذکر نہیں فرمایا ہے، اس کی وجہ ملاّ علی قاری نے ان الفاظ میں بیان کی ہے:

لِان النھی عن المنکر شامل له اذ النھی عن الشي امر بضدہ[۴]

کیوں کہ نہی عن المنکر میں امر بالمعروف شامل ہے، اس لیے کہ کسی چیز سے منع کرنا حقیقت میں اس کی مخالف چیز کا حکم دینا ہے۔

محمد ﷺ معروف کا حکم دیتے اور منکر سے منع کرتے تھے

اس بحث سے قطع نظر اسی سورۂ اعراف کی ایک دوسری آیت میں یہ دونوں ہی احکام ایک ساتھ مذکور ہیں۔ اہلِ کتاب کا ذکر ہے:

---

۱ روح المعانی، المجلد الخامس، الجزء ۹، ص ۱۳۷ ۲ مرقاۃ المصابیح: ۸/ ۸۶۰

۳ الاکلیل علیٰ مدارک التنزیل: ۴/ ۱۸۹ ۴ المبین المعین لفہم الاربعین: ۱۸۹

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰاةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۝ (الاعراف:۱۵۷)	جو اس رسول یعنی نبی امیؐ کی اتباع کرتے ہیں، جس کا ذکر وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، جو انھیں 'معروف' کا حکم دیتا ہے اور 'منکر' سے منع کرتا ہے، پاک چیزوں کو ان کے لیے حلال کرتا ہے اور ناپاک چیزیں ان پر حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جس کے نیچے وہ دبے ہوئے ہیں اور ان زنجیروں کو کھولتا ہے جن میں وہ گرفتار ہیں، پس جو لوگ اس پر ایمان لائیں، اس کی حمایت اور نصرت کریں اور اس روشنی کے پیچھے چلیں جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے وہی فلاح پانے والے ہیں۔

اس آیت میں اللہ کے رسول ﷺ کی تین صفات بیان ہوئی ہیں: پہلی صفت یہ کہ آپؐ معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں۔ دوسری صفت یہ کہ آپؐ پاک چیزوں کو حلال اور ناپاک چیزوں کو حرام کرتے ہیں، تیسری صفت یہ کہ آپ غیرضروری بوجھ اتارتے ہیں اور بندشیں کھولتے ہیں۔ بعد کی دونوں صفتیں حقیقت میں پہلی صفت کی شرح وتفسیر ہیں۔ پاک چیزوں کو حلال کرنا 'امر بالمعروف' کے اندر شامل ہے اور ناپاک چیزوں کو حرام کرنا 'نہی عن المنکر' کا ایک حصہ ہے۔ اسی طرح 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کا تقاضا ہے کہ انسان کو خود ساختہ رسوم و اعمال سے نجات دلائی جائے اور اسے اللہ کی بندگی کے سوا ہر بندگی سے آزاد کیا جائے۔

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

هو الذی امر الله علىٰ لسانه بكل معروف و نهی عن كل منكر و احلّ كل طيب وحرّم كل خبيث ... فبه كمل دين الله المتضمن	آپؐ ہی کی ذات ہے جس کی زبان سے اللہ نے ہر معروف کا حکم دیا اور ہر منکر سے منع کیا، ہر پاک چیز کو حلال کیا اور ہر ناپاک چیز کو حرام کیا... آپؐ ہی کے ذریعہ

للامر بکل معروف والنهی عن کل منکر واحلال کل طیب وتحریم کل خبیث ... وتحریم الخبائث یندرج فی معنی النهی عن المنکر کما ان احلال الطیبات یندرج فی الامر بالمعروف لان تحریم الطیبٰت مما نهی اللّٰه عنه و کذٰلک الامر بجمیع المعروف والنهی عن کل منکر مما لا یتم الا للرسول الذی تمم اللّٰه به مکارم الاخلاق و المندرجة فی المعروف[1]

خدا کے اس دین کی تکمیل ہوئی، جس میں ہر معروف کا حکم ہے اور ہر منکر سے ممانعت ہے، ہر پاک چیز کو حلال کیا گیا ہے اور اور ہر ناپاک چیز کو حرام کیا گیا ہے ... ناپاک چیزوں کو حرام کرنا 'نہی عن المنکر' کے مفہوم میں شامل ہے، جیسے کہ پاک چیزوں کو حلال کرنا 'امر بالمعروف' میں آتا ہے، اس لیے پاک چیزوں کو حرام ٹھیرا دینا ان کاموں میں شامل ہے جن سے اللہ نے منع کیا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تمام معروفات کا حکم دینا اور تمام منکرات سے منع کرنا یہ اسی رسول کے لیے ہوسکتا ہے جس کے ذریعے اللہ نے ان تمام اعلیٰ اخلاقیات کی تکمیل کی ہے جو 'معروف' میں شامل ہیں۔

محمد ﷺ نے ہر گروہ کو معروف کا حکم دیا اور منکر سے منع کیا

آیت میں 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کا ذکر اس سیاق میں آیا ہے کہ آپ ﷺ یہود کے درمیان یہ کام انجام دیتے ہیں، لیکن ظاہر ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ ﷺ دوسروں کو معروف کا حکم نہیں دیتے تھے اور منکر سے روکتے نہیں تھے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خواہ یہود و نصاریٰ ہوں یا مشرکین و منافقین، ان میں سے جس گروہ پر بھی آپ ﷺ نے دین حق کی تبلیغ کی اسے معروف کا حکم دیا اور منکر سے منع کیا، بلکہ جیسا کہ اس سے پہلے ذکر آچکا ہے کہ آپ ﷺ اپنے ساتھیوں کی جو تربیت کرتے تھے، انھیں اُمورِ خیر کی جو تعلیم دیتے تھے، اخلاق حسنہ کی جو نصیحت فرماتے تھے اور آدابِ زندگی کی جو تلقین کرتے تھے وہ سب 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' ہی میں شامل ہے۔ یہ کام

---

[1] ابن تیمیہ، الحسبۃ فی الاسلام، ص ۵۸

ابتدائے دعوت سے انتہائے دعوت تک حاوی ہے اور داعی اسے اس وقت تک انجام دیتا ہے جب تک کہ اس کے جسم میں جان باقی ہے اور وہ حرکت و عمل کے قابل ہے۔ اسی وجہ سے مفسرین نے یہاں 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کو یہود کے ساتھ مخصوص نہیں سمجھا ہے، بلکہ اسے بہت ہی مختلف النوع اور وسیع کام کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

(يَامُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ) هٰذه صفة الرسول صلى الله تعالىٰ عليه واله وسلم في الكتب المتقدمة، وهكذا كان حاله عليه الصلوٰة والسلام لاَ يامر الّا بخير و لاَ ينهى الّا عن شر... و من اهم ذٰلك و اعظمه ما بعثه الله به من الاُمر بعبادته وحده لاَ شريك له و النهى عن عبادة من سواه كما ارسل به جميع الرسل قبله[1]

'معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں' آپؐ کی یہ صفت سابقہ آسمانی کتابوں میں بیان ہوئی ہے اور یہی آپؐ کا حال تھا بھی کہ آپؐ جس بات کا بھی حکم دیتے وہ 'خیر' ہوتی اور جس چیز سے بھی منع کرتے وہ 'شر' ہوتی ... اس سلسلے کی اہم ترین چیز وہ ہے جس کو دے کر اللہ نے آپؐ کو مبعوث فرمایا تھا یعنی یہ کہ اللہ واحد کی عبادت کا حکم دیں اور اس کے سوا ہر ایک کی بندگی سے منع کریں، جیسا کہ آپؐ سے پہلے بھی تمام رسول یہی تعلیم لے کر آئے تھے۔

علامہ بغویؒ اس ٹکڑے کی شرح میں فرماتے ہیں:

(يَامُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ) اى بالايمان (وَيَنْهٰـهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ) يعنى عن الشرک، قيل المعروف الشريعة و السنة و المنكر ما لاَ يعرف فى شريعة ولاَ سنة، وقال عطاء يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ بخلع الاُنـداد

'آپؐ معروف کا حکم دیتے ہیں' یعنی ایمان کا حکم دیتے ہیں اور 'منکر سے منع کرتے ہیں' یعنی شرک سے منع کرتے ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ معروف سے مراد شریعت اور سنت ہے اور منکر ہر وہ شے ہے جو شریعت میں معلوم (و مقبول) نہ ہو۔ عطاء تابعی نے 'یامرھم بالمعروف' کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ آپؐ

---

[1] تفسیر ابن کثیر: ۲/ ۲۵۳-۲۵۴

ومکارم الْاخلاق وصلۃ الاَرحام (وَیَنْہٰھُمْ عَنِ الْمُنْکَر) عن عبادۃ الاَوثان و قطع الاَرحام[1]

انھیں اللہ کے جھوٹے شریکوں سے علیحدگی، اعلیٰ اخلاق کی پابندی اور صلہ رحمی کا حکم دیتے ہیں، اور 'انھیں منکر سے منع کرتے ہیں' کے معنی یہ ہیں کہ آپؐ بتوں کو پرستش اور رشتے توڑنے سے منع کرتے ہیں۔

شیخ اسماعیل حقی کہتے ہیں:

(یَامُرُھُمْ بِالْمَعْرُوْفِ) ای بالتوحید وشرائع الاِسلام (وَیَنْھَاھُمْ عَنِ الْمُنْکَرِ) ای عن کل مالاَ یعرف فی شریعۃ ولاَ سنۃ[2]

'آپ انھیں معروف کا حکم دیتے ہیں' یعنی توحید اور اسلامی شریعت کا حکم دیتے ہیں۔ 'اور انھیں منکر سے منع کرتے ہیں۔' یعنی ہر اس چیز سے منع کرتے ہیں جو شریعت اور سنت میں جانی پہچانی (اور پسندیدہ) نہیں ہے۔

ابن جریر طبری فرماتے ہیں:

یامر ھٰذا النبی الْامی اتباعہ بالمعرف وھو الْایمان باللّٰہ و لزوم طاعۃ فیما امرونھی، فذٰلک المعروف الذی یامرھم بہ و ینھٰھم عن المنکر و ھو الشرک باللّٰہ و الاِنتھاء عما نھاھم اللّٰہ عنہ[3]

یہ نبی امی اپنی اتباع کرنے والوں کو معروف کا حکم دیتے ہیں۔ معروف سے مراد ہے اللہ پر ایمان اور اوامر و نواہی میں اس کی لازمی اطاعت۔ یہی وہ معروف ہے، جس کا آپؐ ان کو حکم دیتے ہیں۔ 'انھیں منکر سے منع کرتے ہیں' یعنی اللہ کے ساتھ شرک کرنے سے منع کرتے ہیں اور اس بات کا حکم دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو ممنوع قرار دیا ہے ان سے باز رہیں۔

امام رازی نے اس فقرہ کی بہت ہی جامع و مانع تفسیر کی ہے۔ ان کی تفسیر اس قابل ہے کہ پوری کی پوری یہاں نقل کی جائے:

---

[1] معالم التنزیل علیٰ ہامش الخازن: ۲ / ۲۴۵

[2] روح البیان: ۱ / ۷۸۰

[3] جامع البیان فی تفسیر القرآن: ۹ / ۵۳

مجامع الُامر بالمعروف محصورة فی قولـه علیه الصلوٰة والسلام التعظیم لاَمر اللّٰه والشفقة علی خلق اللّٰه، وذٰلک لِاَن الموجود اما واجب الوجود لذاته واما ممکن الوجود لذاته، اما الواجب لـذاتـه فهو اللّٰه جل جلاله، ولا معروف اشرف من تعظیمه واظهار الخضوع و الخشوع علیٰ باب عزته والُاعتراف بکونه موصوفا بصفات الکمال مبرأ عن النقائص و الآفات منزّهًا عن الُاضداد والاَنداد، و اما الممکن لذاته فان لم یکن حیوانا، فلا سبیل الیٰ ایصال الخیر الیه لِاَن الُانتفاع مشروط بالحیاة، ومع هذا فانه یجب النظر الیٰ کلها بعین التعظیم من حیث انها مخلوقة للّٰه تعالٰی، و من حیث ان کل ذرة من ذرات المخلوقات لما کانت دلیلا قاهرا وبرهانا باهراعلیٰ توحیده وتنزیهه فانه یجب النظر الیهـا بعین الُاحترام، و امـا ان

نبی ﷺ کے الفاظ ’خدا کے احکام کی تعظیم اور اس کی مخلوق پر شفقت‘ امر بالمعروف کے سارے پہلوؤں پر حاوی ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ موجودات کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جو اپنے وجود میں کسی کی محتاج نہیں ہے اور دوسری وہ جو اپنے وجود میں کسی کی محتاج ہے۔ غیر محتاج وجود صرف اللہ تعالیٰ کا ہے اور اس سے بڑا معروف کوئی نہیں ہے کہ اس کی تعظیم اور اس کی بندگی کی جائے اور اس کی جناب میں خشوع وخضوع کا اظہار کیا جائے۔ اور اس بات کا اعتراف کیا جائے کہ اس کے اندر تمام صفاتِ کمال موجود ہیں اور وہ تمام نقائص اور آفات سے پاک اور مخالفوں اور ہم سروں کے وجود سے بلند ہے۔ اب رہی وہ چیز جو اپنی ذات میں دوسرے کی محتاج ہے اگر وہ ذی حیات نہیں ہے تو اسے فائدہ پہنچانے کی بھی کوئی صورت نہیں، اس لیے کہ فائدہ اٹھانے کے لیے حیات شرط ہے لیکن پھر بھی ضروری ہے کہ اس کو بھی اس حیثیت سے عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور یہ کہ مخلوقات کا ہر ذرّہ جب اللہ تعالیٰ کے ایک اور بے عیب ہونے کی مضبوط دلیل اور واضح حجت ہے تو ضروری ہے کہ اسے احترام کی نظر سے دیکھا جائے اور اگر اللہ کی یہ مخلوق ذی حیات ہے تو ضروری ہے کہ انسان اس پر جس قدر شفقت

كان ذٰلك المخلوق من جنس الحيوان فانه يجب اظهار الشفقة عليه، بأقصى ما يقدر الاٰنسان عليه ويد خل فيه برالوالدين و صلـة الاَرحام وبث المعروف، فثبت ان قولـه عليـه الصلوٰة و السلام التعظيم لِاَمرالله و الشفقة علىٰ خلق الله كلمة جامعة لجميع جهات الامر بالمعروف ... قوله (وَ يَنۡهَاهُمۡ عَنِ الۡمُنۡكَرِ) المراد منـه اضداد الاُمور المذكورة، وهى عبادة الاُوثان والقول فى صفات الله بغير علم والكفر بما انزل الله على النبيين و قطع الرحم و عقوق الوالدين[1]

کر سکتا ہے اس قدر شفقت کرے۔ اسی میں ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک، صلۂ رحمی اور نیکیوں کا پھیلانا بھی شامل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی ﷺ کے الفاظ ’اللہ کے حکم کی تعظیم اور اس کی مخلوق پر شفقت‘ ایک ایسا جامع کلمہ ہے، جو امر بالمعروف کے تمام پہلوؤں کو حاوی ہے...’آپ انھیں منکر سے منع کرتے ہیں‘ اللہ کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ اوپر جو باتیں بیان ہوئی ہیں ان کے خلاف جتنی باتیں ہیں ان سب سے منع کیا جائے۔ اس میں بتوں کی پرستش، بغیر جانے بوجھے اللہ کی ذات و صفات کے بارے میں زبان کھولنا، انبیاء کی تعلیمات کا انکار، رشتوں کا قطع کرنا اور ماں باپ کی نافرمانی سبھی کچھ شامل ہے۔

اہلِ علم کی ان تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کے رسول محمد ﷺ نے انسانوں کو دعوت دی کہ وہ اس وسیع کائنات پر غور کریں اور اپنے خالق ومالک کو پہچانیں۔ آپ ﷺ نے انھیں اللہ کے صحیح تصور سے آگاہ کیا، اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دی اور ایک دوسرے سے محبت کرنا سکھایا۔ اس کے ساتھ جن لوگوں نے اللہ کے دین کو قبول کیا آپ ﷺ نے انھیں اللہ کی عبادت اور اس کی شریعت کی اتباع کا حکم دیا اور ان کی سیرت و کردار کی اصلاح کی۔ آپ ﷺ کے اسی دعوتی وتربیتی کام کو قرآن نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے تعبیر کیا ہے۔

---

[1] مفاتیح الغیب (التفسیر الکبیر) المجلد الثامن، الجزء ۱۵، ص ۲۱

امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور انذار

تربیت پر آئندہ گفتگو ہوگی۔ اس بحث سے واضح ہے کہ اللہ کے دین کو اپنی صحیح اور خالص شکل میں پیش کرنا اور دنیا کو اس کی اتباع کی دعوت دینا بھی امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ آپ چاہیں تو اسے دعوتِ توحید بھی کہہ سکتے ہیں، کیوں کہ اس میں ایک طرف شرک اور اس کی بنیاد پر تعمیر ہونے والے پورے نظامِ حیات کا رد و انکار ہے اور دوسری طرف یہ ثابت کیا گیا ہے کہ بندگی کے لائق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اس کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں ہے جس کی عبادت کی جائے اور جسے انسان اپنا معبود اور حاکم سمجھے۔ اگر انسان اللہ کی بندگی سے بغاوت کردے تو دنیا و آخرت میں اسے تباہی سے کوئی چیز بچا نہیں سکتی۔ اس کارِ تبلیغ و دعوت کے لیے قرآن نے انذار، تبشیر، ابلاغ، تذکیر وغیرہ اصطلاحات بھی استعمال کی ہیں۔ ان اصطلاحات میں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں دعوت و تبلیغ کی حد تک کوئی فرق نہیں ہے۔ مثال کے طور پر 'انذار' کو لیجیے۔ یہ اصطلاح قرآن نے پیغمبروں کے دعوتی کام کے سلسلے میں بہ کثرت استعمال کی ہے۔ رسول اکرم ﷺ کو بار بار نذیر اور نذیر مبین کہا گیا ہے۔ آپ ﷺ پر دوسری یا تیسری وحی کا آغاز ان الفاظ سے ہوا:

یٰاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ ○ قُمْ فَاَنْذِرْ ○

اے چادر میں لپٹنے والے! اٹھو اور (لوگوں کو) 'انذار' کرو (یعنی ڈراؤ)۔ (المدثر: ۱، ۲)

ایک جگہ تو کہا گیا:

اِنَّمَا اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّ لِکُلِّ قَوْمٍ ھَادٍ

تم تو صرف انذار کرنے والے (ڈرانے والے) ہو اور ہر قوم میں ایک ہدایت کرنے والا گزرا ہے۔ (الرعد: ۷)

'انذار' کے اصل معنی ہیں انسانوں کو اللہ تعالیٰ سے بغاوت کے تباہ کن انجام سے باخبر کرنا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ 'انذار' کے حکم کا منشا صرف اسی منفی عمل تک محدود ہے، بلکہ یہ منشا بہت وسیع ہے اور اس میں انسانوں کی ہدایت کا وہ پورا کام

شامل ہے، جس کی ذمے داری اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے رسولوں پر عائد ہوتی ہے۔ کسی قوم کے درمیان انذار کا یہ کام انجام پاچکنے کے بعد بھی اگر وہ اللہ کی طرف نہ پلٹے تو اس پر اتمامِ حجت ہوجاتی ہے اور خدا کا عذاب نازل ہو جاتا ہے۔ 'انذار' کے اس مفہوم کو سامنے رکھیے اور پھر امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور 'انذار' کے معنوی ربط کے بارے میں امام ابن تیمیہؒ کے ان الفاظ پر غور کیجیے:

نفس الإنـذار امـر بالمعـروف و نهي عن المنكر[1] — نفس انذار معروف کا حکم دینا اور منکر سے منع کرنا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول اپنی قوموں میں 'انذار' کا جو فرض انجام دیتے ہیں اسے امر بالمعروف ونہی عن المنکر بھی کہا جائے گا۔

یہاں ایک خاص پہلو کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے، وہ یہ کہ قرآن مجید نے 'انذار' کے ساتھ عموماً 'تبشیر' کا لفظ بھی استعمال کیا ہے، جس میں بشارت اور خوش خبری کے معنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے رسول ایک طرف فسادِ عقیدہ وعمل کے نتائج بد سے ڈراتے ہیں اور دوسری طرف صحیح عقیدہ اور حسن عمل پر فوز وفلاح کی بشارت بھی دیتے ہیں۔ یہ دوطرفہ عمل وہ دلائل کے ساتھ انجام دیتے ہیں، جب کہ مخالفین کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی، وہ بے دلیل انہیں شکست دینا چاہتے ہیں:

وَ مَا نُرۡسِلُ الۡمُرۡسَلِیۡنَ اِلَّا مُبَشِّرِیۡنَ وَمُنۡذِرِیۡنَ وَ یُجَادِلُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِالۡبَاطِلِ لِیُدۡحِضُوۡا بِهِ الۡحَقَّ وَاتَّخَذُوۡا آیَاتِیۡ وَمَا اُنۡذِرُوۡا هُزُوًا (الکہف:۵۶)

رسولوں کو تو ہم بس بشارت دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجتے ہیں۔ جن لوگوں نے کفر کی روش اختیار کی وہ باطل کے ذریعے (بے بنیاد) بحث و حجت کرتے ہیں، تاکہ اس طرح حق کو شکست دے دیں۔ انھوں نے میری آیات کو اور جس انجام سے انھیں ڈرایا گیا اسے مذاق بنالیا ہے۔

انذار وتبشیر کے اس عمل ہی سے مخالفین پر حجت تمام ہوتی ہے۔ سورۂ نساء

---

[1] الحسبۃ فی الاسلام، ص ٦٧

میں بعض رسولوں کے ذکر کے بعد ارشاد ہے:

رُّسُلاً مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنذِرِيْنَ لِئَلاَّ يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزاً حَكِيْماً ○
(النساء:۱۶۵)

یہ رسول ہیں جن کو ہم نے خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجا، تاکہ لوگوں کے پاس رسولوں کے آنے کے بعد بحث کے لیے کوئی حجت نہ رہے اور اللہ عزیز و حکیم ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں بھی یہ دونوں پہلو موجود ہیں۔ معروف کے اچھے نتائج سے اور منکر کے عواقبِ بد سے آگاہ کرنا اس کے وسیع تقاضوں میں داخل ہے۔

دین کے ماننے والوں میں دعوتی کام بھی امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے

دعوتی کام کے بارے میں اس سے پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ وہ ان لوگوں کے درمیان انجام پاتا ہے جنھوں نے ابھی دین کو قبول نہیں کیا ہے۔ جو لوگ اسے قبول کرچکے ہیں ان میں اگر خامیاں ہیں تو ان کی اصلاح و تربیت کی جاتی ہے۔ لیکن اگر کوئی فرد یا گروہ دین کو ماننے کا دعویٰ کرنے کے باوجود اس سے بغاوت کردے یا دین کی اساس جن اصول و نظریات پر ہے، ان کے بارے میں شک و تردد میں گرفتار ہوجائے تو یقیناً اس پر بھی دعوتی کام ہوگا۔ اس کے بارے میں نہیں کہا جائے گا کہ وہ دعوت کا مخاطب نہیں ہے۔ کیوں کہ دین پر ایمان کے دعوے کے باوجود وہ اپنے فکر و عمل کے لحاظ سے منکرین دین کی صف میں شامل ہوگیا ہے۔

امت مسلمہ کی موجودہ حالت پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ اصلاح و تربیت کی محتاج تو ہے ہی، ساتھ ہی کسی نہ کسی حد تک دعوت و تبلیغ کی بھی محتاج ہے، کیوں کہ وہ اس وقت عملاً دو طبقوں میں بٹ گئی ہے۔ ایک طبقہ امت کی اکثریت پر مشتمل ہے، جو اللہ رسول ﷺ اور آخرت پر یقین رکھتی ہے اور قرآن و حدیث کو اپنا دستور العمل سمجھتی ہے لیکن ساتھ ہی بہت سی فکری و عملی خامیوں میں مبتلا ہے۔ اس لیے وہ اس

بات کی محتاج نہیں ہے کہ اس کو دین قبول کرنے کی دعوت دی جائے، بلکہ وہ صرف اصلاح کی محتاج ہے۔ دوسرا طبقہ امت کے ان افراد کا ہے جن کا اللہ کے دین پر ایمان تو شاید ابھی ختم نہیں ہوا ہے، لیکن ان کے ذہنوں میں اس کی بنیادیں ضرور متزلزل ہو گئی ہیں۔ ان کو اس امت سے جوڑنے والی چیز اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت نہیں ہے، بلکہ وہ سماجی اور نسلی تعلقات ہیں جو کسی گروہ کے ساتھ رہنے کے نتیجے میں فطری طور پر پیدا ہوجاتے ہیں۔ یہ تعلقات اگر نہ ہوتے تو شاید دین وملت سے ان کا رشتہ باقی نہ رہتا۔ اس سے بھی آگے امت میں ایسے لوگ بھی ہیں جو نہ صرف اس دین سے اختلاف رکھتے ہیں، بلکہ علانیہ اس کا مذاق اڑانے میں بھی جھجک نہیں محسوس کرتے۔ ظاہر ہے یہ سب لوگ دعوتِ دین کے اسی طرح محتاج ہیں جس طرح امت سے باہر کے لوگ اس کے حاجت مند ہیں۔

نزولِ قرآن کے وقت اہلِ کتاب کا اعتقادی اور عملی بگاڑ امتِ مسلمہ کے موجودہ بگاڑ سے کہیں زیادہ تھا، ان کی اکثریت اللہ کے دین سے منحرف اور باغی ہوچکی تھی۔ اللہ کے آخری رسولؐ کے اعلانِ رسالت کے بعد اُن کے لیے نجات کا راستہ صرف یہ تھا کہ وہ آپؐ کی رسالت کو تسلیم کرتے اور آپؐ کی امت میں داخل ہوجاتے، کیوں کہ آخری رسولؐ کے آنے کے بعد پچھلی تمام شریعتیں منسوخ ہو چکی تھیں۔ اب انھیں اپنی شریعت پر عمل کی قطعاً اجازت نہیں تھی، اس لیے کہ جن آسمانی کتابوں پر ان کے دین کی بنیاد تھی، خود ان میں بھی صاف صاف آپؐ کی اتباع کا حکم چلا آرہا تھا، لیکن انھوں نے آپؐ کی دشمنی میں اپنی کتابوں میں تحریف کردی، تاکہ آپؐ کو اللہ کا رسولؐ اور فرستادہ نہ ماننا پڑے۔ اس کے بعد بھی وہ اپنے آپ کو اللہ کے دین کے متبع اور اس کے علم بردار ہی سمجھتے رہے، مگر حقیقت میں وہ اس سے نکل چکے تھے، البتہ ایک چھوٹا سا گروہ ان میں وہ بھی تھا جس کا رویہ اس روشِ عام سے مختلف تھا۔ یہ لوگ نہ صرف یہ کہ خود راہ راست پر قائم تھے، بلکہ دوسروں کی اصلاح کی کوشش بھی کر رہے تھے، وہ اپنی قوم کو رسولِ اکرم ﷺ

کی مخالفت سے روکتے اور آپؐ پر ایمان لانے کی دعوت دیتے۔ ان کے اس اصلاحی اور دعوتی کام کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: وَ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرَاتِ ''وہ معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں اور نیک کاموں میں تیزی دکھاتے ہیں۔'' (آل عمران:۱۱۴)

اس سے جہاں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' منکرینِ حق کے درمیان کا دعوتی کام ہے، وہیں یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ یہ کام کبھی اپنی قوم کے اندر بھی انجام پاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اہلِ کتاب کا حق پرست گروہ اپنی قوم سے باہر کسی بھی دوسرے شخص کو اللہ اور رسول ﷺ پر ایمان اور ان کی اطاعت کی دعوت نہیں دے رہا تھا، بلکہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنی قوم کے درمیان بھی دعوت کی ذمہ داری انجام دے رہا تھا۔ اسی وجہ سے مفسرین نے ان کے اس دعوتی کام کو ان کی قوم کے ساتھ مخصوص نہیں قرار دیا ہے بلکہ اسے عمومی طریقہ کار کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ چناں چہ سورہ آل عمران کے مذکورہ فقرے کی تشریح میں امام ابن جریر طبریؒ فرماتے ہیں:

یامرون الناس بالْإیمان باللّٰہ و رسوله وتصدیق محمّد صلی الله علیه وسلم وما جاء هم به و (یَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ) یقول وینهون الناس عن الکفر باللّٰہ وتکذیب محمد و ما جاء هم به من عند اللّٰہ[1]

وہ لوگوں کو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان کا حکم دیتے ہیں اور محمد ﷺ اور آپ کے اس دین کی تصدیق کا حکم دیتے ہیں، جسے آپؐ ان کے پاس لائے ہیں۔ ''منکر سے منع کرتے ہیں'' یعنی لوگوں کو اللہ کے انکار سے اور محمد ﷺ اور خدا کی طرف سے آپؐ کے لائے ہوئے دین کی تکذیب سے منع کرتے ہیں۔

جصاص کہتے ہیں:

صفة لھٰؤلاَء الَّذین اٰمنوا من اهل الکتاب لِاَنّھم اٰمنوا باللّٰہ ورسوله و

اہل کتاب میں سے جو لوگ ایمان لائے یہ ان کی صفت ہے، کیوں کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے تھے۔ اور انھوں نے لوگوں

---

[1] جامع البیان فی تفسیر القرآن: ۴/۳۵

دعوا الناس الیٰ تصدیق النبیؐ و الاِنکار علیٰ من خالفہ فکانوا ممن قال اللّٰہ تعالیٰ (کُنتُمۡ خَیۡرَ اُمَّۃٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ)[1]

لوگوں کو دعوت دی تھی کہ نبی ﷺ کی تصدیق کریں اور آپؐ کی مخالفت کرنے والوں کی مخالفت کریں۔ اس طرح وہ ان لوگوں میں شامل ہوگئے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ "تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کی اصلاح کے لیے نکالا گیا ہے۔"

امر بالمعروف و نہی عن المنکر علمی کام بھی ہے

دعوتِ دین بالکل سادہ کام نہیں ہے، بلکہ اس میں جہاں وعظ و نصیحت اور تذکیر و تلقین کی ضرورت پڑتی ہے، وہیں دین کو خالص علمی رنگ میں پیش کرنا اور اسے دلائل سے ثابت کرنا بھی ہوتا ہے۔ دین کی یہ علمی و استدلالی خدمت بھی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ایک پہلو ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ رسولِ اکرم ﷺ کو 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کا اس وقت حکم دیا گیا تھا جب کہ آپؐ مکہ میں تھے اور دین کو پوری قوت کے ساتھ دلائل کے ذریعہ پیش کیا جا رہا تھا۔ آپؐ دین کو قبول کرنے کی نصیحت ہی نہیں فرما رہے تھے، بلکہ ایک طرف ان اعتراضات کے جوابات بھی دے رہے تھے جو مخالفین کی طرف سے اللہ کے دین پر کیے جا رہے تھے، دوسری طرف دلائل کے ذریعے یہ ثابت فرما رہے تھے کہ یہی دین، دین حق ہے اور اسی کی اتباع میں نوعِ انسانی کی نجات ہے۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ دین کو دلیل و برہان کے ساتھ پیش کرنا بھی 'امر بالمعروف' کے اسی وسیع کام کا ایک حصہ ہے جس کا آپؐ کو حکم دیا گیا تھا۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ مفسرین نے 'امر بالمعروف' کی تشریح ان الفاظ میں بھی کی ہے:

(وَاُمُرۡ بِالۡعُرۡفِ) ای باظھار الدین الحق وتقریر دلائلہ[2]

'معروف کا حکم دو' یعنی دین حق کی وضاحت اور اس کے دلائل کے اثبات کے ذریعے۔

ابن العربی مالکی کہتے ہیں کہ دین کو علمی رنگ میں پیش کرنا اور اسے دلائل سے

[1] احکام القرآن: ۲/ ۴۵ [2] مفاتیح الغیب (التفسیر الکبیر): المجلد السادس، الجزء ۱۵، ص ۷۹

ثابت کرنا 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' میں داخل ہے۔ ان کے الفاظ ہیں:

و من الاَمر بالمعروف و النهي عن المنكر نصرة الدين باقامة الحجة على المخالفين[1]

یہ بات بھی امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں شامل ہے کہ مخالفین پر حجت قائم کر کے دین کی مدد کی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں دعوتِ دین کی پوری جدوجہد شامل ہے۔ اس کا فطری اور لازمی تقاضا ہے کہ دنیا کو اللہ کے دین کی طرف بلایا جائے، شرک و کفر سے، رسالت کی تکذیب سے اور قانونِ شریعت کی مخالفت سے روکا جائے۔ اس بات کو دلائل سے ثابت کیا جائے کہ اللہ کا دین ہی دینِ حق ہے اور اسی میں نوعِ انسانی کی نجات ہے اور پھر اس دین کو فروغ دینے اور پھیلانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ خوش نصیب ہیں وہ جو اس کام میں لگے ہوئے ہیں اور بدنصیب ہیں وہ جو اس کو اس طرح چھوڑے ہوئے ہیں جیسے یہ ان پر فرض ہی نہیں ہے اور جیسے اللہ کی کتاب اس حکم ہی سے خالی ہے۔

---

[1] احکام القرآن: ۱/ ۱۲۲



جہاد فی سبیل اللہ

جہاد فی سبیل اللہ کا مفہوم

'جہاد فی سبیل اللہ' شریعت کی ایک مخصوص اصطلاح ہے۔ اس کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی پوری قوت صرف کر دینا۔ اللہ کا دین چاہتا ہے کہ انسان اس کے لیے اپنی جان، اپنا مال، اپنے تعلقات، اپنی خواہشات، اپنی صلاحیتیں، اپنا عیش و آرام، سب کچھ قربان کردے۔ اس کے بغیر صحیح معنی میں دین کی اتباع ہوسکتی ہے اور نہ اس کی خدمت۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ (الحج:۷۸) اللہ کی راہ میں جہاد کرو، جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر جہاد فی سبیل اللہ ہے

جہاد فی سبیل اللہ اپنے اندر بہت وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا پورا کام جہاد ہے۔ انسان جس معروف کو بھی قائم کرنے اور جس منکر کو بھی مٹانے کی کوشش کرتا ہے وہ حقیقت میں اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے۔ علامہ ابن عابدین جہاد کے بارے میں فرماتے ہیں:

---

۱ ردالمحتار علی الدرالمختار: ۳/۳۰۱

هذا عام يشمل المجاهد بكل امر بمعروف و نهى عن المنكر[1]

جہاد عام ہے، جو کسی بھی معروف کا حکم دینے اور کسی بھی منکر سے روکنے کے لیے کوشش کرنے والے فرد کو شامل ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ کی ایک خاص شکل یہ ہے کہ طاقت کے ذریعے اللہ کے دین کو غالب و سربلند کیا جائے، دنیا کو فتنہ وفساد سے پاک کیا جائے اور اللہ کے بندوں کے لیے ایسے حالات فراہم کیے جائیں کہ وہ سکون اور اطمینان کے ساتھ اس کی عبادت و اطاعت کرسکیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض اوقات اللہ کی زمین کو فتنہ وفساد سے پاک کرنے اور حق و صداقت کو سربلند کرنے کے لیے طاقت کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ جب دنیا عدل و انصاف کی پیاسی ہو، جب انسان اپنے ہی جیسے انسانوں کے لیے درندہ بن جائے، جب قومیں اور نسلیں ظلم و زیادتی سے کراہ رہی ہوں اور جب اللہ کے بندے محض اس وجہ سے ستائے جائیں کہ وہ اس کو یاد کر رہے ہیں اور اس کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں، اس وقت ان لوگوں کا خاموش رہنا، جو اس ظلم کو مٹا سکتے ہوں، بہت بڑا جرم ہے۔

اللہ کی راہ میں جنگ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ایک فرع ہے

رسولِ اکرم ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ جب تک مکہ میں تھے، اس حیثیت میں نہیں تھے کہ اللہ کی زمین سے باطل کو مٹاتے اور دینِ حق کو قائم و غالب کرتے۔ کیوں کہ وہ خود مظلوم تھے، کم زور اور بے بس تھے۔ ان پر اس وجہ سے زیادتی ہو رہی تھی کہ وہ اللہ کے دین پر عمل کر رہے ہیں اور دوسروں کو اس کی دعوت دے رہے ہیں۔ یہ ظلم جب اپنی آخری حد کو پہنچ گیا تو آپؐ کو اور آپؐ کے صحابہؓ کو مدینہ ہجرت کرنی پڑی۔ ہجرت کے بعد مظلومیت کا دور ختم ہوا اور آپؐ کو اتنی طاقت حاصل ہوئی کہ اللہ کی زمین سے بزور ظلم و زیادتی کو مٹا کر اس کی طرف سے بھیجا ہوا نظامِ عدل وقسط قائم کریں۔ اس وقت آپؐ کو طاقت کے ذریعے جہاد کا حکم دیا گیا۔ اس کام کے لیے قرآن نے 'قتال فی سبیل اللہ' کی

اصطلاح بھی استعمال کی ہے، یعنی ایسی جنگ جو صرف اللہ کو خوش کرنے اور اس کے دین کو غالب کرنے کے لیے لڑی جائے۔ یہ جنگ 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کے وسیع کام کا ایک جزء ہے۔ اس کا صریح حکم گو مدینہ میں دیا گیا، لیکن اس کی بنیاد مکی تعلیمات میں موجود تھی، کیوں کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا حکم مکہ میں نازل ہو چکا تھا۔ چناں چہ علامہ شاطبی اپنی کتاب الموافقات فی اصول الشریعۃ میں فرماتے ہیں:

الجهاد الذی شرع بالمدینة فرع من فروع الأمر بالمعروف و النهی عن المنكر وهو مقرر بمكة[1]	جہاد، جو مدینہ میں شروع ہوا، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی فروع میں سے ایک فرع ہے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا حکم مکہ ہی میں صادر ہو چکا تھا۔

اس کتاب کے شارح اور تعلیق نگار شیخ عبد اللہ درّاز کہتے ہیں:

بل هو اعلیٰ فروعه[2]	بلکہ جہاد فی سبیل اللہ تو 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی فروع میں سب سے اعلیٰ فرع ہے۔

اہلِ علم کی تصریحات

اس جہاد کے کچھ خاص حدود شرائط ہیں، جن کے بغیر اس کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔ یہاں ان حدود و شرائط سے بحث نہیں ہے۔ اس وقت صرف یہ عرض کرنا ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں جس طرح دین کی دعوت اور اس کی تبلیغ شامل ہے، ٹھیک اسی طرح دین کی حفاظت اور اس کے غلبہ وسربلندی کے لیے ان لوگوں سے جنگ کرنا بھی شامل ہے، جو اس کو مٹانا اور تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں بعض مستند اہلِ علم کی تصریحات پیش کی جا رہی ہیں، جن سے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ''تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لیے

---

[1] الموافقات فی اصول الشریعۃ: ۳/۵۰ [2] حوالہ سابق

يقول تأمرونهم بالمعروف ان يشهدوا ان لاَ الٰـه الاّ اللّٰه و الاِقرار بمَا انـزل اللّٰـه و تقاتلونهم عليه و لاَ الٰـه الاّ اللّٰه هو اعظم المعروف و تنهونهم عن المنكر و المنكر هو التكـذيب وهـو انكـر المنكر[1]

نکالا گیا ہے۔" تم ان کو 'معروف' کا حکم دیتے ہو، یعنی اس بات کا کہ گواہی دیں کہ سوائے خدا کے کوئی معبود نہیں ہے اور اقرار کریں کہ جو دین اس نے نازل کیا ہے وہ حق ہے۔ اور اس بنیاد پر تم ان سے جہاد کرتے ہو، کیوں کہ سب سے بڑا معروف 'لا الٰہ الا اللہ' ہے۔ 'تم ان کو منکر سے' یعنی اللہ کی تکذیب سے منع کرتے ہو اور اللہ کی تکذیب سب سے بڑا منکر ہے۔

قفّال ہمارے علم کلام کی ایک اہم شخصیت ہیں۔ وہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی تائید میں کہتے ہیں:

تفضيلهم على الُامم الذين كانوا قبلهم انما حصل لِاَجل انهم يامرون بالمعروف وينهون عن المنكر بآكد الوجوه وهو القتال، لِانّ الُامر بالمعروف قديكون بالقلب و باللسان و باليد واقواها ما يكون بالقتال، لِاَنه القاء النفس فی خطـر القتـل، و أعـرف المعروفات الدين الحق والايمان بالتوحيـد و النبـوة، و أنـكـر المنكرات الكفر باللّٰه، فكان الجهـاد فی الـدين تحملا لِاَعظم

پچھلی امتوں کے مقابلے میں امتِ مسلمہ کی فضیلت کی وجہ یہ ہے کہ وہ معروف کا حکم دینے اور منکر سے روکنے کا کام سب سے اہم اور اعلیٰ طریقے سے انجام دیتی ہے یعنی جہاد و قتال کے ذریعے۔ کیوں کہ امر بالمعروف کبھی دل سے، کبھی زبان سے اور کبھی ہاتھ سے ہوتا ہے اور ان میں سب سے مضبوط طریقہ قتال کا ہے، اس لیے کہ اس میں انسان کو موت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سب سے بڑا معروف دینِ حق اور توحید و نبوت پر ایمان ہے اور سب سے بڑا منکر اللہ کا انکار ہے۔ پس دین کی راہ میں جہاد کا مطلب یہ ہوا کہ انسان دوسروں کو سب سے بڑا فائدہ پہنچانے

---

[1] جامع البیان فی تفسیر القرآن (طبری): ۴/۲۸

المضار لغرض ایصال الغیرالی اعظم المنافع وتخلیصه عن اعظم المضار، فوجب ان یکون الجهاد اعظم العبادات، و لما کان امر الجهاد فی شرعنا اقوی منه فی سائر الشرائع لاجرم صار ذٰلک موجباً لفضل هٰذه الاُمة علی سائر الاُمم، وهٰذا معنی ماروی عن ابن عباسؓ[1]

اور سب سے بڑے نقصان سے بچانے کے لیے اپنے آپ کو سب سے بڑے نقصان سے دوچار کردے۔ اس سے لازم آیا کہ جہاد بہت بڑی عبادت ہے۔ اب چوں کہ جہاد کا مقام ہماری شریعت میں دوسری تمام شریعتوں کے مقابلے میں زیادہ اونچا اور نمایاں ہے، اس لیے وہ امتِ مسلمہ کی افضلیت کا سبب ہوگیا۔ اور یہی مطلب ہے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے قول کا (جو اوپر نقل کیا گیا ہے)۔

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

بیّن سبحانه ان هذه الاُمة خیر الامم للناس فهم انفعهم لهم و اعظمهم احسانا الیهم لانهم کملوا امرالناس بالمعروف و نهیهم عن المنکر من جهة الصفة و القدر حیث امروا بکل معروف و نهوا عن المنکر لکل احد و اقاموا ذٰلک بالجهاد فی سبیل اللّٰه بانفسهم و اموالهم و هٰذا کمال النفع للخلق[2]

اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح کردی کہ امتِ مسلمہ انسانوں کے حق میں بہترین امت ہے۔ پس وہ انھیں سب سے زیادہ نفع پہنچانے والی ہے، اور اس کا احسان ان پر سب سے بڑا ہے کیوں کہ اس نے لوگوں پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی کیفیت اور مقدار دونوں پہلوؤں سے تکمیل کردی۔ اس لیے کہ اس نے ہر معروف کا حکم دیا اور ہر ایک منکر سے منع کیا اور جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کرکے اس فرض کو انجام دیا اور یہ اللہ کی مخلوق کو فائدہ پہنچانے کی آخری حد ہے۔

آگے چل کر اسی بحث کے ذیل میں فرماتے ہیں:

---

[1] التفسیر الکبیر، المجلد الرابع، الجزء ۸، ص ۱۵۷

[2] الحسبة فی الاسلام، ص ۵۹

فمعلوم ان الاَمر بالمعروف و النهی عن المنکر و اتمامه بالجهاد هومن اعظم المعروف الذی امرنا به[۱]	یہ بات سب جانتے ہیں کہ معروف کا حکم دینا اور منکر سے منع کرنا اور جہاد کے ذریعہ اس کی تکمیل کرنا ان سب سے بڑے معروفات میں سے ہے جن کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔

ایک اور موقعے پر امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

ان اللّٰہ امر المومنین بالاٗیمان و العمل الصالح و امرھم بدعوۃ الناس و جھاد ھم علی الاٗیمان و العمل الصالح کما قال تعالیٰ وَ لَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌo اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ آتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ[۲]	اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو ایمان اور عمل صالح کا حکم دیا ہے۔ ساتھ ہی انھیں اس بات کا بھی حکم دیا ہے کہ وہ لوگوں کو ایمان اور عملِ صالح کی دعوت دیں اور اس کے لیے ان سے جہاد کریں، جیسا کہ اس نے فرمایا ہے کہ ”اللہ اس شخص کی ضرور مدد کرے گا جو اس (اس کے دین کی) کی مدد کرتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انھیں زمین میں اقتدار عطا کریں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے اور تمام معاملات کا انجام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔“

امام ابن تیمیہؒ نے اپنے دعویٰ کے استدلال میں سورۂ حج کی جو آیات پیش کی ہیں وہ اس کام کو ظاہر کرتی ہیں، جو امت مسلمہ اقتدار پر آنے کے بعد انجام دیتی ہے۔ اس کی تشریح آئندہ باب میں آئے گی۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں دعوتِ دین کی طرح جہاد بھی شامل ہے۔

علامہ ابن جریر طبریؒ فرماتے ہیں:

(وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ ... وَيَاْمُرُوْنَ	’تم میں ایک گروہ ضرور ایسا ہونا چاہیے...

---

۱ الحسبۃ فی الاسلام، ص ۶۲

۲ ایضاً، ص ۸۰

بِالْمَعْرُوْفِ) یقول یامـرون الناس باتباع محمـد صلی اللّٰہ علیـه و سلم ودینه الـذی جاء بـه من عند اللّٰـه (وَيَنْهَـوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ) یعنی وینهـون عن الکفر باللّٰه و التکذیب بمحمد وبما جاء به من عند اللّٰه بجهادهم بالأَیدی و الجوارح حتی ینقادوا لکم بالطاعة[۱]

جو معروف کا حکم دے۔' یعنی جو لوگوں کو محمدؐ کی اور اللہ کی طرف سے آپؐ کے لائے ہوئے دین کی اتباع کا حکم دے۔' 'اور منکر سے منع کرے۔' یعنی اپنے دست و بازو سے جہاد کے ذریعے اللہ کے انکار اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے لائے ہوئے دین کی تکذیب سے روکے۔ یہاں تک کہ وہ تمھارے مطیع ہوجائیں اور اطاعت قبول کرلیں۔

علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں:

إِنَّ أخصّ أوصاف المومن الامر بالمعروف والنهی عن المنکر ورأسها الدعاء الی الاسلام والقتال علیه[۲]

'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' مومن کا سب سے مخصوص وصف ہے۔ اور اس کام کی مختلف شکلوں میں اسلام کی طرف دعوت دینا اور اس کے لیے جنگ کرنا سرفہرست ہے۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں:

رأس المعـروف الأیمـان باللّٰه ورأس المنکر الکفـر باللّٰـه والجهاد یوجب الترغیب فی الأیمان و الزجر عن الکفـر والجهـاد داخل فی باب الأمر بالمعروف والنهی عن المنکر[۳]

سب سے بڑا معروف اللہ پر ایمان اور سب سے بڑا منکر اللہ کا انکار ہے۔ جہاد لازماً ایمان کی ترغیب کا اور کفر سے باز رکھنے کا ذریعہ بنتا ہے اور یہ جہاد 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کے اندر شامل ہے۔

---

۱ جامع البیان فی تفسیر القرآن: ۴/ ۲۷
۲ الجامع لاحکام القرآن، المجلد الثانی، الجزء ۴، ص ۳۱
۳ التفسیر الکبیر، المجلد الثامن، الجزء ۱۶، ص ۱۶۲

شمس الائمہ سرخسیؒ فرماتے ہیں:

و قد سمّی رسول اللهﷺ الجهاد سنام الدين وفيه امر بالمعروف و نهي عن المنكر وهو صفة هذهٖ الأمة و فيه تعرض لِاعلىٰ الدرجات و هو الشهادة[1]	رسول اللہؐ نے جہاد کو دین کی چوٹی کہا ہے۔ جہاد میں معروف کا حکم دینا اور منکر سے منع کرنا ہوتا ہے اور یہ اس امت کی صفت ہے۔ پھر جہاد میں (فلاح و سعادت کے) سب سے اونچے درجے یعنی شہادت کے لیے بھی انسان اپنے کو پیش کرتا ہے۔

شاہ ولی اللہؒ کا نقطۂ نظر

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے نزدیک اس امت کے 'خیر امت' ہونے اور لوگوں کے لیے اس کے 'نکالے جانے' کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے رسول محمد ﷺ جس مقصد کے لیے دنیا میں آئے تھے اس کی تبلیغ و اشاعت کے لیے یہ امت سارے عالم میں پھیل جائے گی اور اللہ کی راہ میں جہاد کرے گی۔ چناں چہ اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے کہ رسولِ اکرم ﷺ کے ذریعے دنیا کو ایک ایسا جامع اور مکمل دین ملا جس نے پچھلے تمام دینوں کو منسوخ کر دیا، شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اس دین کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ مختلف قومیں مذہب کی بنیاد پر برسرِ پیکار تھیں، مذہب کی حقیقت گم ہوچکی تھی اور صرف چند مراسم رہ گئے تھے:

مسّت الحاجة الىٰ امام راشد يعامل مع الملل معاملة الخليفة الراشد مع الملوك الجائرة ... وهٰذا الامام الذى يجمع الامم على ملـة واحدة يحتاج الى اصول ... منها ان يدعو قوما الى	(اس لیے) ایک ایسے صالح رہ نما کی حاجت پیش آئی جو مختلف قوموں کے ساتھ اس طرح معاملہ کرے جس طرح ظالم بادشاہوں کے ساتھ خلیفہ راشد معاملہ کرتا ہے... تمام قوموں کو ایک دین پر جمع کرنے والا یہ راہ نما چند اصولی باتوں کا ضرورت مند ہوگا... ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ پہلے کسی ایک گروہ کو راہِ راست

---

[1] شرح السیر الکبیر: ۱/ ۱۹، ۲۰

السنة الراشدة ویزکیهم ویصلح شأنهم، ثم یتخذهم بمنزلة جوارحہ فیجاهد اهل الأرض ویفرقهم فی الأفاق وهو قوله تعالیٰ (کُنتُم خَیرَ اُمَّۃٍ اُخرِجَتْ لِلنَّاسِ)

کی طرف دعوت دے، اس کا تزکیہ کرے اور اس کے حالات کو سنوارے، پھر اسے اپنا دست و بازو بنائے اور اس کی مدد سے اہل دنیا سے جنگ کرے اور اطرافِ عالم میں اسے (اس پاک مقصد کے لیے) پھیلاوے۔ یہی مدعا ہے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا کہ 'تم خیر امت ہو، جسے لوگوں کے لیے نکالا گیا ہے۔'

اس کے بعد شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ آخری دین جب نازل ہوا تو روم و ایران کی سلطنتیں متمدن دنیا پر چھائی ہوئی تھیں اور وقت کے افکار و خیالات اور تہذیب و تمدن پر ان ہی کا قبضہ تھا۔ اس لیے ضروری ہوا کہ ان دونوں سلطنتوں کو ختم کردیا جائے، تاکہ ان کی جگہ دین حق کی حکومت قائم ہوسکے:

لما اراد اللّٰه تعالیٰ اقامة الملة العوجاء وان یخرج للناس امة تامر هم بالمعروف و تناهم عن المنکر و تغیر رسومهم الفاسدة کان ذٰلک موقوفا علیٰ زوال دولة هٰذین متیسر بالتعرض لحالهما، فان حالهما یسری فی جمیع الأقالیم الصالحة او یکاد یسری، فقضی اللّٰه بزوال دولتهما و اخبر النبی صلی اللّٰه علیه و لسم بان هلک کسریٰ فلا کسری بعده وهلک قیصر فلا قیصر بعده،

اللہ تعالیٰ نے جب یہ ارادہ کیا کہ بگڑے ہوئے دین کو ٹھیک کرے اور ایک ایسی امت کو وجود میں لائے جو انسانوں کو معروف کا حکم دے اور منکر سے منع کرے اور ان کے بگڑے ہوئے رسم و رواج کو مٹا دے تو یہ کام روم وایران کی سلطنتوں کے زوال پر موقوف تھا اور ان سے تعرض کے ذریعہ ہی اسے انجام دینا آسان تھا، کیوں کہ ان کے حالات تمام متمدن ممالک پر پوری طرح یا بڑی حد تک چھائے ہوئے تھے، اس لیے اللہ نے ان دونوں سلطنتوں کے زوال کا فیصلہ کر دیا اور نبی ﷺ نے (بطور پیشین گوئی) اعلان فرمایا کہ کسریٰ ہلاک ہوچکا، اب اس کے بعد کوئی کسریٰ پیدا نہ ہوگا اور قیصر ہلاک ہوچکا، اب کوئی قیصر پیدا نہ ہوگا، اور وہ حق نازل ہوا جو تمام روئے زمین کے باطل کا

و نزل الحق الدامغ لباطل جمیع الٲرض فی دمغ باطل العرب بالنبی صلی اللہ علیه وسلم و اصحابه ودمغ باطل هذین الملکین بالعرب و دمغ سائر البلاد بملئهما و للّٰه الحجة البالغة[1]

سر توڑ دینے والا تھا۔ اس کی صورت یہ ہوئی کہ پہلے نبی ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ نے عرب کے باطل کو توڑا، پھر عرب نے ان دونوں سلطنتوں کے باطل کو ختم کیا اور آخر میں ان دونوں کے ذریعے تمام ممالک کے باطل کا سر کچل دیا گیا اور حقیقت کو پہنچنے والی حجت اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ امت اللہ کا کلمہ بلند کرنے اٹھی ہے۔ اس کا کام ہے دنیا سے نظام باطل کو مٹا کر روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کی حکومت قائم کرنا۔ وہ اپنی ذمے داری سے اسی وقت سبک دوش ہوسکتی ہے جب کہ وہ اس راہ میں اپنی پوری قوت صرف کردے، اپنا تمام فکری و عملی سرمایہ کھپا دے اور اپنے جان و مال کی بازی لگا دے۔ اسی کا نام قرآن و حدیث کی زبان میں جہاد فی سبیل اللہ بھی ہے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر بھی۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ:۱/ ۲۲۰-۲۲۲

☆☆

اسلامی ریاست (☆)

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے اقتدار کی ضرورت

اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران میں امت مسلمہ کو 'دعوت الی الخیر' اور 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کا حکم دینے کے فوراً ہی بعد فرمایا ہے:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَ اخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ۝ (آل عمران:۱۰۵)

ان لوگوں کے مانند نہ ہو جاؤ جو فرقوں میں بٹ گئے اور اپنے پاس کھلی ہوئی ہدایات آنے کے بعد (بھی) اختلافات میں پڑ گئے۔ یہ وہ ہیں جن کے لیے بڑا عذاب ہے۔

یہ بڑی قابلِ غور بات ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے حکم کے ساتھ ہی تفرق و اختلاف سے کیوں منع کیا گیا ہے؟ اس کی بہت سی وجہیں ہوسکتی ہیں، لیکن جو سب سے بڑی اور نمایاں وجہ ہے، وہ یہ ہے کہ 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کا فرض، جس طرح دعوت و تبلیغ کا تقاضا کرتا ہے اسی طرح وہ اقتدار و حکومت بھی چاہتا ہے اور اقتدار و حکومت تک رسائی کے لیے اتحاد و اتفاق انتہائی ضروری ہے۔ کیوں کہ جس قوم میں اختلاف و انتشار ہو وہ اللہ کی زمین پر اقتدار کی مستحق نہیں رہتی اور اس پر محکومیت مسلط ہوجاتی ہے، اس کو دوسروں کی غلامی قبول کرنی پڑتی ہے اور وہ اپنی مرضی کا سیاسی

☆ یہاں اسلامی ریاست کا تفصیلی خاکہ نہیں پیش کیا گیا ہے، بلکہ اپنے موضوع کے حدود میں اس کا صرف اجمالی ذکر آیا ہے۔ اس کی بعض تفصیلات راقم نے 'غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق' میں پیش کی ہیں۔

نظام قائم کرنے اور اس پر عمل کرنے کے حق سے محروم ہو جاتی ہے۔ یہی حقیقت اس آیت میں مسلمانوں کو سمجھائی گئی ہے۔ اس میں ان کو بتایا گیا ہے کہ سیاسی سطح پر 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کا فرض انجام دینا تمہارے لیے اسی وقت ممکن ہوگا جب کہ تمھاری صفوں میں اتحاد ہو اور الفت و محبت نے تمھیں جسدِ واحد بنا دیا ہو۔ اس کے برعکس تم نے اپنا اتحاد و اتفاق کھو دیا تو تمھاری سیاسی قوت پارہ پارہ ہوجائے گی اور اقتدار تمھارے ہاتھ سے لازماً چھن جائے گا۔ اس کے بعد ہوسکتا ہے کہ تم معروف کی اتباع اور منکر سے اجتناب کی نصیحت تو کرتے رہو، لیکن معروف کا قانونی نفاذ اور منکر کی سیاسی بندش تمھارے لیے ناممکن ہوجائے گی۔

امام رازیؒ نے اس آیت کے دو رَبط بیان کیے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا تعلق پورے سلسلۂ کلام سے ہے۔ اور دوسرا یہ کہ وہ خاص امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے حکم سے متعلق ہے۔ علاّمہ رشید رضا نے پہلے ربط کو پسند کیا ہے، لیکن دوسرے کو پہلے پر ترجیح دی ہے۔[1] یہاں اسی دوسرے ربط کو امام رازیؒ ہی کے الفاظ میں پیش کیا جا رہا ہے:

انه تعالیٰ لمّا امر بالمعروف و النهی عن المنکر وذٰلک ممّا لایتم الّا اذاکان الأمر بالمعروف قادرا علی تنفیذ هٰذا التکلیف علی الظلمة و المتغالین ولاَ تحصل هٰذه القدرة الاّ اذا حصلت الالفة والمُحبة بین اهل الحق و الدین لاَجرم حذرهم تعالیٰ من الفرقة والاُختلاف لکی

اللہ تعالیٰ نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا جو حکم دیا ہے اس کی تکمیل اسی وقت ہوسکتی ہے جب کہ امر بالمعروف کے فرض کا انجام دینے والا ظالموں اور حد سے بڑھنے والوں کے خلاف اپنے اس فریضے کی انجام دہی کی قدرت رکھتا ہو اور یہ قدرت اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب کہ حق پرستوں اور دین والوں کے درمیان الفت و محبت ہو، اس لیے اللہ نے ان کو اختلاف اور پھوٹ کے خلاف متنبہ فرمایا، تاکہ اس

---

[1] تفسیر القرآن الحکیم (المنار): ۴/۴۸

لا یصیر ذٰلک سبباً لعجزھم عن القیام بھذا التکلیف[1]	کی وجہ سے وہ امر بالمعروف کے فرض کی انجام دہی سے عاجز نہ رہ جائیں۔

علامہ نظام الدین نیشا پوری نے بھی 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کے حکم اور اس آیت کے درمیان یہی ربط بیان کیا ہے۔[2] ان دونوں آیتوں کے ربط سے قطع نظر، بقول امام تیمیہؒ خود امر بالمعروف میں یہ بات شامل ہے کہ امت کے اندر اتحاد پیدا کرنے اور اسے اختلاف و انتشار سے بچانے کی کوشش کی جائے۔ چناں چہ فرماتے ہیں:

من الأمر بالمعروف الأمر بالأئتلاف والاجتماع والنھی عن الفرقة[3]	یہ بھی امر بالمعروف ہے کہ اتحاد اور ائتلاف کا حکم دیا جائے اور افتراق سے منع کیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو آخری حد تک انجام دینے کے لیے قوت اور اقتدار بالکل ناگزیر ہے اور اقتدار اتحاد کے بغیر نہ حاصل ہوتا ہے اور نہ باقی رہتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کارِ دعوت ہی نہیں، بلکہ سیاسی عمل بھی ہے۔ اس سے زیادہ صحیح تعبیر شاید یہ ہوگی کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر دعوت بھی ہے اور سیاست بھی۔ گزشتہ صفحات میں اس کے دعوتی پہلو کی تشریح گزر چکی ہے۔ یہاں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے سیاسی رخ سے بحث پیش نظر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت کے سب سے پہلے اور سب سے اونچے طبقے کے بارے میں صراحت کی ہے کہ زمین میں اقتدار پانے کے بعد وہ معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے اور جن اصول ونظریات پر ان کا ایمان ہے انسانوں کے درمیان انھیں نافذ کریں گے۔ ایسا نہیں ہوگا کہ اقتدار ملنے سے پہلے جس دین کی دعوت دے رہے

---

[1] مفاتیح الغیب، المجلد الرابع، الجزء ۸، ص ۱۴۷

[2] غرائب القرآن و رغائب الفرقان: ۴/ ۳۳

[3] مجموعة الرسائل الکبری، الرسالة السابعة، الوصیة الکبری: ۱/ ۳۰۹

ہیں، اقتدار کے ملنے کے بعد وہ اسے بھلا دیں اور اپنی خواہشات کی تکمیل میں لگ جائیں۔ چناں چہ سورۂ حج کی اکتالیس ویں آیت دیکھئے کہ صحابۂ کرامؓ کو اقتدار وحکومت عطا کرنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (الحج:۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انھیں زمین پر اقتدار عطا کریں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے اور تمام معاملات کا انجام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے[۱]

اسلامی ریاست کا منشور

قرآن کی اس آیت کو اسلامی حکومت کا منشور (Manifesto) کہنا چاہیے۔ اس میں اس کارِ سیاسی کو ظاہر کیا گیا ہے جو امتِ مسلمہ اقتدار پانے کے بعد انجام دیتی

---

[۱] سورۂ حج کی اس آیت سے پہلے مہاجرین کا ذکر ہے، اس لیے گویا آیت میں اصلاً ان ہی کے اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے، یہ صفات صرف مہاجرین ہی سے مطلوب نہیں ہیں، بلکہ پوری امت میں اور اس کے سب ہی طبقات میں ان کا پایا جانا ضروری ہے۔ اسی وجہ سے جن مفسرین کے پیش نظر آیت کا سیاق رہا ہے ان کے نزدیک آیت میں مہاجرین کا ذکر ہے، لیکن جن اصحاب نے آیت کے مفہوم اور منشا کو سامنے رکھا ہے انھوں نے امت کے دیگر طبقات کو، بلکہ پوری امت کو اس میں شامل سمجھا ہے۔ قتادہ کہتے ہیں، اس سے مراد صحابہؓ ہیں اور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے نزدیک اس سے مہاجرین، انصار اور تابعین مراد ہیں۔ عکرمہؒ کا بیان ہے کہ آیت میں پانچ وقت کی نماز پڑھنے والوں کا ذکر ہے۔ حسن بصریؒ اور ابو العالیہ کی رائے میں اس سے امت محمدیہ مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ ان کو اقتدار دے تو وہ نماز قائم کریں گے۔ ابن ابی نجیح کہتے ہیں کہ اس میں حکام کا بیان ہوا ہے۔ ضحاک کا قول ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ حکومت اور سلطنت عطا کرے ان پر اس آیت میں ایک شرط لگی ہے (اور انھیں اس شرط کا پورا کرنا ضروری ہے) علامہ قرطبی نے اپنی تفسیر میں ان اقوال کو نقل کرنے کے بعد آخری قول کے بارے میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ (دیکھئے الجامع لاحکام القرآن، المجلد السادس، الجزء ۱۲، ص۴۹)

ہے۔ اس سے آپ جان سکتے ہیں کہ اسلامی حکومت کس مقصد کے لیے وجود میں آتی ہے؟ اس کا مزاج کیا ہوتا ہے؟ اس کے اعمال کس قسم کے ہوتے ہیں؟ اور وہ اپنے تمام وسائل و ذرائع کس راہ میں لگاتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی یہ مختصر سی آیت بہت ہی واضح الفاظ میں اہل ایمان کے ہاتھوں قائم ہونے والی حکومت کے بنیادی فرائض کا اعلان ہے۔ اسی حقیقت کے بیان کے لیے حافظ ابو البرکات نسفی اور بعض دوسرے مفسرین نے یہ تعبیر اختیار کی ہے:

هو اخبار من الله عما ستكون عليه سيرة المهاجرين ان مكّنهم في الارض وبسط لهم في الدنيا و كيف يقومون بامر الدين[1]

یہ اللہ کی طرف سے اس بات کا پیشگی اعلان ہے کہ اگر وہ مہاجرین کو زمین میں اقتدار بخشے گا اور مال و دولت میں وسعت عطا کرے گا تو ان کی سیرت کا کیا حال ہوگا اور وہ کس طرح دین کے معاملے کی ذمہ داریاں نبھائیں گے۔

اہلِ ایمان کے شخصی و سیاسی اوصاف

سورۂ حج کی مذکورہ بالا آیت میں ان ایمان والوں کے، جو اقتدار و حکومت کے مالک ہوں، چار اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ اقامت صلوٰۃ، ایتاء زکوٰۃ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ پہلے دو وصف ان کے ذاتی کردار کی نشان دہی کرتے ہیں اور بعد کی دو صفات میں ان کا اجتماعی و سیاسی کردار بیان ہوا ہے۔ دورِ جدید کے مفسر علامہ احمد مصطفیٰ المراغی نے اس آیت کی تفسیر کے بعد اس کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

انهم هم الذين كملوا انفسهم باستحضار المعبود والتوجه اليه في الصلوٰة علىٰ قدر الطاقة و كانوا عونا لامهم باعانة فقرائهم وذوالحاجة منهم و كملوا غيرهم

یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے نماز میں طاقت کی حد تک معبود کے استحضار اور اس کی طرف توجہ سے اپنے نفوس کی تکمیل کی ہو اور فقراء اور حاجت مندوں کی مدد کرکے اپنی قوموں کے مددگار ہوں اور پھر انھوں نے اپنے علاوہ دوسروں کی بھی تکمیل کی ہو، اس طرح

---

[1] مدارک التنزیل وحقائق التاویل۔ ابوحیان اندلسی، البحر المحیط: ۶/ ۶۰

فافاضوا علیھم من علومھم و اٰدابھم و منعوا المفاسد التی تعوق غیرھم عن الوصول فی الرقی الخلقی والادب السامی[1]

کہ ان میں اپنے علوم و آداب پھیلائے ہوں اور انھیں ان مفاسد سے منع کیا ہو جو اخلاقی بلندی اور اونچے ادب تک پہنچنے سے ان کو روکتے ہیں۔

علامہ ابن جریر طبری آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

یعنی بقوله اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ ان وَطّنا لھم فی البلاد فقھروا المشرکین وغلبوھم علیھا وھم اصحاب رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم، یقول ان نصرنا ھم علیٰ اعدائھم و قھروا مشرکی مکة اطاعوا اللّٰه فَاَقَامُوا الصَّلٰوۃ بحدودھا وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ، یقول و اعطوا زکوٰۃ اموالھم من جعلھا اللّٰه له، وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ یقول ودعوا الناس الیٰ توحید اللّٰه و العمل بطاعتهٖ و مایعرفه اھل الاٰیمان باللّٰه، وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ، یقول و نھوا عن الشرک باللّٰه و العمل بمعاصیه الذی ینکرہ اھل الحق والاٰیمان باللّٰه[2]

'اگر ہم نے انھیں زمین میں اقتدار عطا کیا' یعنی اگر ہم نے انھیں شہروں میں بسا دیا اور انھوں نے مشرکین کا زور توڑ دیا اور ان پر غالب آگئے۔ اس سے مراد رسول اللہؐ کے اصحاب ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ہم نے دشمنوں کے مقابلے میں ان کی مدد کی اور وہ مشرکین مکہ پر غالب آگئے تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں گے اور نماز کو اپنے تمام حدود و آداب کے ساتھ قائم کریں گے 'زکوٰۃ دیں گے' یعنی یہ لوگ اللہ کے بتائے ہوئے مستحقین کو اپنے مالوں کی زکوٰۃ حوالہ کرتے رہیں گے۔ 'معروف کا حکم دیں گے' یعنی لوگوں کو اللہ کی وحدانیت کی، اس کی اطاعت و فرماں برداری کی اور ان اعمال کی دعوت دیں گے جو اہل ایمان کے درمیان جانے پہچانے (اور مقبول) ہیں۔ 'اور منکر سے منع کریں گے' یعنی اللہ کے ساتھ شرک کرنے سے اور اس کی نافرمانی سے روکیں گے، جسے اہل حق اور اہل ایمان ناپسند کرتے ہیں۔

---

1. تفسیر المراغی: ۱۷/ ۱۲۰
2. جامع البیان فی تفسیر القرآن: ۱۷/ ۱۱۵

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں:

اَقَامُوا لصَّلوٰۃَ وَاٰتَوُ الزَّکوٰۃَ اشارہ است باقامت ارکان اسلام وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ شامل است احیاء علوم دین را وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ شامل است جہاد کفار و اخذ جزیہ رازیراکہ منکرے زیادہ تر از کفر نیست و نہیے دروے بالاتر از قتل اہل کفر وگرفتن جزیہ نہ وشامل است اقامت حدود وتعزیرات رابرعصاۃ مسلمین[1]

'نماز قائم کریں گے اور زکوۃ دیں گے۔' اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ سارے ارکانِ اسلام کو قائم کریں گے۔ 'معروف کا حکم دیں گے' اس میں علوم دین کا زندہ کرنا (بھی) شامل ہے۔ 'منکر سے منع کریں گے۔' اس میں کفار کے ساتھ جہاد کرنا اور ان سے جزیہ لینا (بھی) داخل ہے، کیوں کہ کفر سے بڑا منکر کوئی نہیں اور اہل کفر کو منع کرنے کی سب سے آخری شکل یہ ہے کہ انھیں قتل کیا جائے اور ان سے جزیہ لیا جائے۔ پھر اس نہی عن المنکر میں نافرمان مسلمانوں پر حدود قائم کرنا اور تعزیرات کا جاری کرنا بھی شامل ہے۔

علامہ قرطبیؒ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے سلسلے میں ریاست کے اختیارات کا ذکر فرماتے ہیں:

ان الْامر بالمعروف لاَ یلیق بکل احد و انما یقوم به السلطان اذا کانت اقامة الحدود الیه والتعزیر الیٰ رأیه والحبس و الِاطلاق له و النفی والتغریب، فینصب فی کل بلدة رجلا صالحا قویّا امینا و یامره بذٰلک ویمضی الحدود علی وجهها من غیر زیادة۔ قال

امر بالمعروف کے لیے ہر ایک مناسب نہیں ہوسکتا، اس کو حکم راں ہی انجام دے گا۔ کیوں کہ حدود کا قائم کرنا اسی کا کام ہے اور تعزیر اسی کی رائے کے مطابق ہوتی ہے۔ اسی طرح قید اور رہا کرنے نیز جلاوطن کرنے کا اختیار بھی اسی کو ہے۔ پس وہ ہر شہر میں کسی صالح، مضبوط اور امانت دار آدمی کو اس کام پر مقرر کرے گا اور اسے اس کا حکم دے گا اور حدود کو صحیح شکل میں بغیر کسی زیادتی کے جاری کرے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا

---

[1] ازالة الخفاء عن خلافة الخلفاء:۱/۲۳۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ اور بعض دیگر اہل علم نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے دائرے میں جن امور کا ذکر کیا ہے ان میں سے ہر ایک کا موقع و محل اور اصول و احکام الگ ہیں۔ یہاں اس سے بحث نہیں ہے، صرف اس کی وسعت کے اثبات کے لیے ان کا حوالہ دیا گیا ہے۔

اللّٰہ تعالیٰ اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰھُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ... الخ[1]

ہے: "اگر ہم نے ان کو زمین میں اقتدار عطا کیا تو وہ نماز قائم کریں گے".... الخ

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

الاَمر بالمعروف و النھی عن المنکر لاَیتم الاّ بالعقوبات الشرعیۃ، فان اللّٰہ یزع بالسلطان ما لاَ یزع بالقراٰن، واقامۃ الحدود واجبۃ علی ولاَۃ الاُمور، وذٰلک یحصل بالعقوبات علی ترک الواجبات و فعل المُحرمات[2]

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی تکمیل شرعی سزاؤں کے نفاذ کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ اقتدارِ حکومت کے ذریعے ان کاموں کو بھی روک دیتا ہے جو قرآن کے ذریعہ نہیں رُکا کرتے۔ حدود کا قائم کرنا حکام پر واجب ہے اور یہ چیز حاصل ہوتی ہے واجبات کے چھوڑنے اور محرمات کے ارتکاب کرنے پر سزا دینے سے۔

معلوم ہوا کہ قرآن نے اہل ایمان کے اقتدار وحکومت کا جو حال بیان فرمایا ہے: وہ یہ ہے کہ وہ ایک طرف خدا کے مطیع وفرماں بردار اور اس کے بتائے ہوئے حدود کے پابند ہوتے ہیں اور کسی بھی معاملہ میں ان سے خودسری اور بغاوت کا مظاہرہ نہیں ہوتا، دوسری طرف وہ خدا کے دین کی دعوت دیتے ہیں، ایمان وعمل صالح کی تبلیغ کرتے ہیں، دنیا کو شرک ومعصیت سے باز رکھتے ہیں، علومِ دین کو زندہ اور قانون شریعت کو نافذ کرتے ہیں، جن چیزوں کو خدا نے واجب کیا ہے ان کے چھوڑنے اور جن چیزوں سے اس نے منع کیا ہے ان کے ارتکاب کرنے پر سزا دیتے ہیں۔ سب سے آخری بات یہ کہ وہ خدا کی راہ میں اس وقت تک اپنا جہاد جاری رکھتے ہیں جب تک کہ بدی کی جگہ نیکی اور شر کی جگہ خیر نہ آجائے اور ہر طرف خدا کا دین قائم وغالب نہ ہوجائے۔

---

[1] الجامع لاحکام القرآن، المجلد الثانی، الجزء ۱۲، ص ۷۳
[2] الحسبۃ فی الاسلام، ص ۴۴

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا حکم پوری شریعت کا نفاذ چاہتا ہے

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اہل علم کی جو تشریحات اوپر نقل کی گئی ہیں ان میں دین کے چند بنیادی امور ہی نمایاں ہوسکے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلامی ریاست کے لیے صرف ان ہی چند باتوں میں قوانینِ الٰہی کی پابندی ضروری ہے، بلکہ پورے دین کی اطاعت و خدمت اس کا فرض ہے۔ 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر'، جسے قرآن نے اسلامی ریاست کے حکم رانوں کا وصف خصوصی بتایا ہے، اپنے اندر، جیسا کہ اوپر واضح کیا جاچکا، بڑی وسعت رکھتا ہے۔ معروف میں ہر وہ عقیدہ وعمل داخل ہے جس کی شریعت نے تعلیم دی ہے اور منکر میں ایسے تمام عقائد و اعمال شامل ہیں جن سے شریعت نے منع کیا ہے۔ اس لیے امر بالمعروف ونہی عن المنکر یہ ہے کہ ان تمام اوامر و نواہی کے بارے میں ٹھیک وہ رویہ اختیار کیا جائے جس کا اسلامی شریعت تقاضا کرتی ہے۔ اسی وجہ سے علامہ محمد خطیب شربینی (م ۹۷۷ھ) نے اسلامی ریاست کے حکم رانوں کے اس وصف کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:

(وَ اَمَرُوا بِالْمَعْرُوْفِ) ای الذی امر اللّٰہ تعالیٰ بہ ورسولہ (وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ) ای الذی نھی اللّٰہ و رسولہ عنہ[1]	'وہ معروف کا حکم دیں گے' یعنی ان چیزوں کا حکم دیں گے جن کا اللہ اور اس کے رسولؐ نے حکم دیا ہے۔ 'اور منکر سے منع کریں گے۔' یعنی ان چیزوں سے منع کریں گے جن سے اللہ اور اس کے رسولؐ نے منع کیا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ اسلامی ریاست کے حکم رانوں کے بارے میں یہ کہنا کہ 'وہ معروف کا حکم دیتے اور منکر سے منع کرتے ہیں' در اصل یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ اپنے حدود اقتدار میں اللہ کی شریعت کو بے کم و کاست نافذ کرتے ہیں اور ان کا پورا نظامِ سلطنت اللہ تعالیٰ کے قانون کے تابع ہوتا ہے۔

---

[1] السراج المنیر: ۲/ ۵۵۳

امر بالمعروف و نہی عن المنکر اسلامی ریاست کا مقصد ہے

حقیقت یہ ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہی اسلامی ریاست کی اصل بنیاد ہے۔ اسی کے لیے وہ وجود میں آتی ہے اور اسی سے اس میں اور دوسری ریاستوں میں فرق واقع ہوتا ہے۔ معروف کا حکم دینا اور منکر سے منع کرنا اس کا مقصدِ وجود ہے۔ اگر یہ مقصد اس کے کاموں میں نہیں رہا تو اس کی اسلامیت ختم ہوگئی۔ ابن عربی مالکی کہتے ہیں:

الأمر المعروف و النهی عن المنکر الذی هو اصل الدین و خلافة المسلمین[1]

امر بالمعروف و نہی عن المنکر دین کی بنیاد اور مسلمانوں کی خلافت کی اساس ہے۔

علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

اذا کان جماع الدین وجمیع الولایات هو امر و نهی فالامر الذی بعث الله به رسوله هو الامر بالمعروف و النهی الذی بعثه به هو النهی عن المنکر و هٰذا نعت النبی و المومنین[2]

جب پورا دین اور تمام حکومتی مناصب دراصل 'امر و نہی' سے عبارت ہیں تو (یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ) وہ 'امر' جسے دے کر اللہ نے اپنے رسولؐ کو بھیجا ہے 'امر بالمعروف' ہے اور وہ 'نہی' جسے دے کر اللہ نے اپنے رسولؐ کو بھیجا ہے 'نہی عن المنکر' ہے اور یہی امر بالمعروف و نہی عن المنکر نبی اور اہل ایمان کا وصف ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر اسلامی ریاست کا کوئی ایک کام نہیں ہے، بلکہ کل کام ہے۔ وہ اپنے تمام وسائل و ذرائع کے ساتھ اسی کام کی تکمیل کرتی ہے۔ اس کا ہر شعبہ اسی کے تابع ہوتا ہے اور اسی کے لیے کام کرتا ہے۔ علامہ ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ بیک زبان کہتے ہیں:

---

[1] احکام القرآن: ۱/ ۲۹۴

[2] الحسبۃ فی الاسلام، ص ۳۰

جمیع الولایات الاسلامیة مقصودها الامر بالمعروف والنهی عن المنکر[1]

سارے اسلامی مناصبِ حکومت کا مقصد 'امر بالمعروف و نہی المنکر' ہے۔

اس اجمال کی تفصیل بھی امام ابنِ تیمیہؒ کے الفاظ میں سن لیجیے:

و الولاَیات کلها الدینیة مثل امرة المؤمنین و مادونها من ملک ووزارة و دیوانیة سواء کانت کتابة خطاب اوکتابة حساب لمستخرج اومصروف فی ارزاق المقاتلة او غیرهم و مثل امارة حرب و قضاء و حسبة وفروع هٰذهِ الولاَیات انما شرعت للامر بالمعروف و النهی عن المنکر[2]

سارے اسلامی مناصبِ حکومت جیسے مومنوں کی امارت یا اس سے کم تر کوئی منصب جیسے سرداری، وزارت، دیوانی امور، خواہ ان امور کا تعلق خط و کتابت سے ہو یا خراج کی آمدنی، یا مجاہدین وغیرہ کے حساب کتاب سے (اسی طرح) جنگ کی سربراہی، قضاء و عدالت، احتساب اور ان تمام محکموں کی شاخیں، تو یہ سب کی سب 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کے لیے مشروع کی گئی ہیں۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں احتساب بھی شامل ہے

جس طرح اسلامی ریاست کے لیے ضروری ہے کہ اس کی مالیات شریعت کی تابع ہوں، اس کی عدالتوں میں اسلامی قانون کی حکم رانی ہو اور اس کا نظامِ تعلیم اسلامی ہدایت کے مطابق ہو، اسی طرح امت کی عام دینی و اخلاقی اصلاح اور اس کا احتساب بھی اس کے لیے ضروری ہے۔ ہمارے علماء نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ذیل میں بڑے اہتمام کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے۔ علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:

اما الحسبة فهی وظیفة دینیة من باب الامر بالمعروف والنهی عن

احتساب امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ذیل کا ایک دینی فریضہ ہے اور امر بالمعروف

---

[1] الحسبۃ فی الاسلام، ص ۳۰۔ الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ، ص ۲۱۷

[2] الحسبۃ فی الاسلام، ص ۴۰

المنکر الذی ھو فرض علی القائم بامور المسلمین، یعین لذٰلک من یراہ اھلا لہ فیتعین فرضہ علیہ و یتخذ الاعوان علی ذٰلک و یبحث عن المنکرات و یؤدب علی قدرھا و یحمل الناس علی المصالح العامۃ فی المدینۃ[۲]

و نہی عن المنکر مسلمانوں کے سربراہ پر فرض ہے، وہ اس کام پر کسی ایسے شخص کو جسے وہ اس کے لیے اہل سمجھے گا متعین کرے گا اور اس پر اس فرض کی ادائیگی متعین طور سے لازم ہو جائے گی۔ وہ اس کام کے لیے اپنے بہت سے مددگار رکھے گا، منکرات کے بارے میں چھان بین کرتا رہے گا اور ان پر ان کی مناسبت سے تادیب کرے گا اور لوگوں کو شہر کے مصالح عامہ پر ابھارے گا۔

علماء نے احتساب کے شعبے سے متعلق جو کام بتائے ہیں ان کو تین عنوانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(۱) امت کی دینی و اخلاقی اصلاح، جیسے لوگوں کو نماز کا حکم دینا، اماموں اور مؤذنوں کی نگرانی کرنا، تاکہ ان سے اپنے فرائض میں کوئی غلطی یا کوتاہی اور غفلت نہ ہونے پائے، نا اہل اشخاص کو شریعت کے مسائل میں رائے زنی سے روکنا، اسی طرح اس بات کا خیال رکھنا کہ کسی سے کوئی غیر اخلاقی اور غیر شرعی حرکت نہ سرزد ہو، مثال کے طور پر اجنبی عورتوں سے بات چیت اور اختلاط وغیرہ۔

(۲) ایسے معاملات کے بارے میں اقدام کرنا جو عدالت کے دائرۂ کار سے باہر ہوں یا جن کی نوعیت ایسی ہو کہ مشکل ہی سے وہ عدالت میں پہنچ سکتے ہوں، جیسے ناپ تول میں کمی بیشی، کاروبار میں دھوکہ دہی، اشیاء خوردنی میں ملاوٹ، ناجائز اشیاء کی خرید وفروخت، لین دین میں خلافِ شرع طریقوں کا اختیار کرنا، ذخیرہ اندوزی وغیرہ۔

(۳) مصالح عامہ کی نگرانی، جیسے بستیوں میں پانی کا مناسب انتظام کرنا، ٹریفک کے اصول بنانا اور اس کی پابندی کرانا، مسافر خانوں کی تعمیر اور مسافروں کو سہولتیں بہم

۲۔ مقدمہ ابن خلدون، ص ۲۲۵

پہنچانا، جن عمارتوں کے گرنے کا خطرہ ہو ان کو اس طرح گرانا کہ کوئی جانی و مالی نقصان نہ ہو۔ وغیرہ[1]

احتساب خالص حکومتی سطح ہی پر انجام پانے والا کام نہیں ہے، بلکہ عام افراد کو بھی اس کا حق حاصل ہے۔ احتساب پر سرکاری افراد کے مامور ہونے کے باوجود غیر سرکاری افراد خلافِ شرع امور پر ہر کسی کا، حتیٰ کہ امراء و حکام کا بھی احتساب کر سکتے ہیں، لیکن عام اشخاص کے لیے وہ ایک نفلی کام ہے اور سرکاری محتسب کے لیے اس کی انجام دہی فرض ہے۔ علّامہ ماوردی فرماتے ہیں کہ اس سے دونوں کی حیثیتوں میں حسبِ ذیل نو پہلوؤں سے فرق واقع ہو جاتا ہے:

(۱) محتسب کے لیے احتساب فرض عین ہے، کیوں کہ اس پر فرائضِ احتساب حکومت کی طرف سے متعین ہوتے ہیں اور متنفل (رضا کار) کے لیے اس کی نوعیت فرض کفایہ کی ہے۔ (۲) محتسب اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے کام میں مشغول نہیں ہوسکتا اور متنفل کے لیے اس کی اجازت ہے۔ (۳) محتسب اس بات پر متعین ہوتا ہے کہ جن معاملات میں نہی عن المنکر ضروری ہے ان میں لوگ اس سے مدد طلب کریں اور متنفل اس پر متعین نہیں ہوتا۔ (۴) جو شخص اس سلسلے میں مدد طلب کرے، محتسب کے لیے اس کی مدد کرنا ضروری ہے اور متنفّل کے لیے ضروری نہیں ہے۔ (۵) بڑے بڑے منکرات کے بارے میں تحقیق کرنا کہ کہاں ان کا ارتکاب ہو رہا ہے اور پھر وہاں پہنچ کر ان کو روکنا، اسی طرح یہ دیکھنا کہ بالکل کھلے ہوئے معروفات کہاں کہاں چھوڑ دیے گئے ہیں اور پھر ان کا قائم کرنا محتسب کا فرض منصبی ہے، لیکن متنفل کے لیے یہ چھان بین اور تحقیق ضروری نہیں ہے۔ (۶) محتسب چوں کہ احتساب پر باقاعدہ متعین ہوتا ہے اور وقت ضرورت لوگ اس سے مدد طلب کرتے ہیں لہٰذا وہ اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے الاحکام السلطانیۃ، ص۲۳۱ وما بعدھا۔ الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ، ص۲۱۵ وما بعدہا۔

اعوان و انصار رکھ سکتا ہے، تاکہ وہ اس کام پر پوری طرح قدرت رکھے اور بہ آسانی انجام دے سکے۔ اس کے برخلاف متنقل کے لیے اعوان و انصار کا طلب کرنا صحیح نہیں ہے[1] (۷) عام منکرات کے سلسلے میں محتسب کو تعزیز کا، جو حد شرعی تک نہ پہنچے، حق ہے (کیوں کہ حد شرعی کا نفاذ اسلامی عدالت ہی سے ہوگا)، لیکن متنفل کو تعزیر کا حق نہیں ہے[2] (۸) محتسب اپنی اس خدمت پر بیت المال سے تنخواہ لے سکتا ہے، لیکن متنفل کے لیے اس کام پر وظیفہ لینا صحیح نہیں ہے۔ (۹) جن چیزوں کا تعلق عرف اور مصالح عامہ سے ہے ان میں محتسب اپنے اجتہاد کے مطابق کام کرسکتا ہے اور متنفل کو اس کی اجازت نہیں ہے۔[3]

اسلامی ریاست کی غرض و غایت، اس کے طریقہ کار اور اس کے مزاج سے متعلق اس تفصیل سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر نہ تو اسلامی ریاست کا اختیاری عمل ہے کہ اس کے کرنے یا نہ کرنے میں وہ آزاد ہے اور نہ اس کی حیثیت محض استحباب کی ہے کہ اس کے کرنے پر وہ اجر وثواب کی مستحق قرار دی جائے اور نہ کرنے پر اس کو غلط کار نہ کہا جاسکے، بلکہ یہ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعین کیا ہوا فرض ہے، جس کا ادا کرنا اس کی خاص ذمہ داری ہے۔ اس کو نظر انداز کرنا کیا معنی، اس میں کوتاہی اور غفلت بھی اس کے لیے جائز نہیں ہے، کیوں کہ اسی سے اس کی اسلامیت کا تعین ہوتا ہے اور اسی پر اس کے دینی اور غیر دینی ہونے کا انحصار ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر حکام کے لیے واجب ہے

اسلامی ریاست امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے وجود میں آتی ہے، اس لیے اس کے سربراہ کی ذمے داری ہے کہ ریاست میں معروفات کا قیام عمل میں لائے

---

[1] اس مسئلہ پر 'وسائل و ذرائع' کے عنوان کے تحت تفصیلی بحث آگے آرہی ہے۔

[2] اس موضوع پر بھی 'حدود و آداب' کے ذیل میں تفصیل سے بحث آئندہ صفحات میں آرہی ہے۔

[3] الاحکام السلطانیۃ، ص ۲۳۱

اور منکرات کو ختم کرے۔ کیوں کہ اگر وہ اس کام کو چھوڑ دے تو ریاست کبھی اپنے مقصد میں کام یاب نہیں ہوسکتی۔ اسی وجہ سے علماء نے لکھا ہے کہ فرماں روائے ریاست کے لیے امر بالمعروف و نہی عن المنکر واجب ہے۔ چناں چہ سورۂ حج کی جو آیت اس بحث میں اوپر گزر چکی ہے اس کے ذیل میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم لکھتے ہیں:

فيه ايجاب الأمر بالمعروف و النهي عن المنكر على من مكّنه الله في الأرض واقدره على القيام بذٰلك[1]	اس میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو ان لوگوں پر واجب کر دیا گیا ہے جن کو اللہ تعالیٰ زمین میں اقتدار عطا کرے اور اس ذمے داری کے اٹھانے کی طاقت بخشے۔

اسلامی ریاست کے سربراہ کے لیے امر بالمعروف و نہی عن المنکر واجب ہی نہیں، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دوسروں کے مقابلہ میں اس پر اس کی زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پاس اس کی غیر معمولی طاقت ہوتی ہے اور طاقت و استطاعت ہی وہ چیز ہے، جس کے مطابق امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا وجوب ہوتا ہے۔ امام ابن تیمیہؒ نے اس اصول کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

ذوو السلطان اقدر من غيرهم وعليهم من الوجوب ما ليس على غيرهم، فان مناط الوجوب هو القدرة فيجب على كل انسان بحسب قدرته[2]	اصحاب اقتدار (امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی) دوسروں کے مقابلے میں زیادہ طاقت رکھتے ہیں، اس لیے وہ ان پر جس حد تک واجب ہے دوسروں پر نہیں ہے۔ کیوں کہ وجوب کی بنیاد قدرت ہے، اس لیے ہر انسان پر وہ اس کی قدرت کے لحاظ سے واجب ہوتا ہے۔

امام شوکانی فرماتے ہیں کہ جو شخص زیادہ سے زیادہ قدرت اور استطاعت رکھنے کے باوجود امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو چھوڑ بیٹھے وہ شریعت کے نزدیک گناہ گار بھی

۱۔ فتح البیان فی مقاصد القرآن: ۶/ ۱۹۳

۲۔ الحسبۃ فی الاسلام، ص ۳۰

دوسروں سے بڑھ کر قرار پائے گا۔ چناں چہ وہ اپنے ایک رسالہ میں لکھتے ہیں:

من كان اقدر على الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر كان ذنبه اشد و عقوبته اعظم و معصيته افظع، بهٰذا جاءت حجج الله و قامت براهينه و نطقت به كتبه و ابلغته الى عباده رسله[1]

جو شخص امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی اور لوگوں سے زیادہ طاقت رکھتا ہو اور پھر یہ فرض انجام نہ دے، اس کا گناہ بھی زیادہ سخت، اس کی سزا بھی زیادہ بڑی اور اس کی معصیت بھی زیادہ گھناؤنی ہوگی۔ اس حقیقت پر اللہ کی طرف سے دلائل و براہین آئے ہیں، یہی بات اس کی کتابیں کہتی ہیں اور یہی اطلاع اس کے رسولوں نے اس کے بندوں تک پہنچائی ہے۔

امام شوکانی کا یہ بیان قرآن و حدیث کی ٹھیک ٹھیک ترجمانی کر رہا ہے اور یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ عام آدمی کا امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو ترک کرنا جتنا بڑا جرم ہوسکتا ہے، اس سے بڑا اور سنگین جرم یہ ہے کہ حاکم ریاست اسے چھوڑ بیٹھے۔ کیوں کہ وہ اس کی زبردست طاقت رکھتا ہے اور کسی بھی دوسرے شخص کے مقابلے میں اس کام کو زیادہ آسانی اور خوبی سے انجام دے سکتا ہے۔

حکّام کی اصلاح بھی امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے

اسلامی ریاست خالص دینی ریاست ہے۔ اس لیے اس کے حکم راں کا خداترس، دین دار، معروفات کا متبع اور منکرات سے مجتنب ہونا ضروری ہے۔ لیکن عام انسانوں کی طرح وہ بھی انسان ہی ہوتا ہے، لہٰذا وہ معروفات کو چھوڑ بھی سکتا ہے اور منکرات کا ارتکاب بھی اس سے ممکن ہے۔ بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اس کے بگڑنے اور غلط راہ پر جا پڑنے کے امکانات اور لوگوں سے زیادہ ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر وہ کسی معروف کو ترک کردے یا کسی منکر کا ارتکاب کرنے لگے تو عام مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے؟ یہ مسئلہ بہت ہی پیچیدہ ہے۔ اس کو ٹھیک سمجھنے کے لیے پہلے بعض اصولی

---

[1] مجموعة الرسائل المنيرية، الجزء الثاني (الدواء العاجل فی دفع العدد الصائل، ص ۳)

باتوں پر غور کرنا ہوگا۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر حکومت کی بھی ذمے داری ہے اور عوام کی بھی۔ جس طرح حکومت کا فرض ہے کہ ریاست کے کسی شہری کا عمل خلافِ شرع ہے تو اس سے باز پرس کرے، ٹھیک اسی طرح عوام کو بھی سربراہانِ ریاست کے احتساب کا حق ہے، لیکن اس کے ساتھ اسلامی ریاست کے سربراہوں کی تعظیم و احترام کا بھی حکم ہے۔ چناں چہ حدیث میں ہے:

من اکرم سلطان اللّٰہ فی الدنیا اکرمہ اللّٰہ یوم القیامۃ، ومن اھان سلطان اللّٰہ فی الدنیا اھانہ اللّٰہ یوم القیامۃ[۱]

اللہ تعالیٰ نے جس شخص کو حاکم بنایا ہے دنیا میں جو اس کی عزت کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت میں اس کی عزت کرے گا (اس کے برعکس) جس شخص کو اللہ نے حاکم بنایا ہے جو کوئی دنیا میں اسے ذلیل کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت میں اس کو ذلیل کرے گا۔

اس میں شک نہیں کہ حکام کو معروف کا حکم دینا اور منکر سے منع کرنا عوام کی ذمے داری ہے، لیکن اس فرض کو انجام دیتے وقت انھیں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ حکام کا وقار باقی رہے اور پبلک میں ان کی سبکی اور بے قدری نہ ہونے پائے۔ اس کی صورت حدیث میں یہ بتائی گئی ہے۔

من اراد ان ینصح لسلطان بامر فلا یبدلہ علانیۃ ولکن لیأخذ بیدہ فیخلوبہ فان قبل منہ فذک و الّا کان قد ادی الذی علیہ لہ[۲]

جو شخص حاکم کو کسی معاملے میں نصیحت کرنا چاہے تو علانیہ اس کا اظہار نہ کرے، بلکہ اس کا ہاتھ پکڑ کر لے جائے اور تنہائی میں اس کو نصیحت کرے۔ اگر وہ اس کو قبول کرلے تو ٹھیک ہے، ورنہ نصیحت کرنے والے نے اپنی ذمے داری پوری کردی۔

امام غزالیؒ کا نقطۂ نظر

جہاں تک وعظ و نصیحت کے ذریعہ حکام کی اصلاح کا تعلق ہے، اس سے تو

---

[۱] مسند احمد: ۶/۳۴۔ و فی الترمذی: من اہان سلطان اللّٰہ فی الارض اہانہ اللّٰہ۔ ابواب الفتن، باب ماجاء فی الخلفاء [۲] مسند احمد: ۴/۴۰۶

کسی کو بھی اختلاف نہیں ہے چناں چہ یہ کام مختلف ادوار میں ہوتا رہا ہے اور بسا اوقات اس کے بہت اچھے نتائج بھی نکلے ہیں۔ اصل سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ زبانی تنقید اور احتساب کا اثر نہ ہو اور حاکم اپنی غلط روش پر جما رہے۔ اس بارے میں امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

> ”اگر حاکم اپنی بے علمی اور ناواقفیت کی بنا پر منکر کا ارتکاب کرے تو رعایا اس کی ناواقفیت دور کرے گی۔ باقی رہی اس سے آگے کی بات، مثلاً اگر اس کے خزانے میں ناجائز مال ہو تو اس پر قبضہ کرلینا اور حق داروں کو دے ڈالنا، یا اس کے کپڑوں میں ریشم شامل ہو تو اس کو نوچ کر الگ کر دینا، یا وہ شرابی ہو تو اس کے گھر میں گھس کر شراب کے برتن توڑ دینا، تو اس میں جہاں ایک طرف اس بات کا خدشہ ہے کہ حاکم کا رعب داب ختم ہوجائے گا، جس کی کہ ممانعت ہے، تو دوسری طرف یہ حقیقت بھی موجود ہے کہ منکر پر سکوت اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اس مشکل صورتِ حال کا حل یہ ہے کہ دیکھا جائے وہ منکر کتنا بڑا ہے، جس کا کہ حاکم مرتکب ہو رہا ہے، اور ساتھ ہی اس کا بھی اندازہ کیا جائے کہ اس منکر سے اسے باز رکھنے کے لیے اگر طاقت استعمال کی گئی تو اس سے اس کی ہیبت کس قدر کم ہوسکتی ہے؟ اور پھر اسی کے مطابق اقدام کیا جائے۔ یہ خالص اجتہادی معاملہ ہے جس کے لیے کوئی لگا بندھا اصول وضع نہیں کیا جاسکتا۔[1]

اس میں شک نہیں کہ اسلامی ریاست کا حاکم اگر ناواقفیت کی بنا پر یا کسی وقتی جذبہ کے تحت منکر کا ارتکاب کرگزرے تو زبانی نصیحت کارگر ہوسکتی ہے اور بالعموم ہوتی بھی ہے۔ اس سے آگے اس کا بھی امکان ہے کہ وہ قصداً معروفات کو ترک کردے اور منکرات میں مبتلا ہوجائے، بلکہ اس کا بھی خطرہ کہ وہ ریاست کے وسائل و ذرائع کو کتنے ہی معروفات کے مٹانے اور منکرات کے فروغ دینے میں لگادے، اس کی قوت برائیوں کے پھیلانے میں صرف ہونے لگے، اس کے عمال اور کارکن فرائضِ دینی کو خود بھی چھوڑ

---

[1] احیاء علوم الدین: ۲/ ۳۴۶

بیٹھیں اور ان کے چھوڑنے والوں پر گرفت بھی نہ کریں، محرمات شرع کا خود بھی ارتکاب کریں اور ارتکاب کرنے والوں کو کوئی سزا بھی نہ دیں، تو کیا اس صورت میں بھی اسلامی ریاست کے عوام کو قوت کے ذریعے اپنے حاکم کی اصلاح کا حق ہے یا نہیں؟ کیا وہ صبر و سکون کے ساتھ اس صورتِ حال کو برداشت کرتے رہیں گے، یا اس کو بدلنے اور اپنے بدکردار حاکموں کی جگہ نیک سیرت حکام کو لانے کی کوشش کریں گے؟ ان حالات میں امام غزالیؒ کا فتویٰ غالباً یہی ہوگا (جیسا کہ اوپر کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے) کہ حاکم کے احترام کا اب کوئی موقع نہ رہ جائے گا اور طاقت کے ذریعے اس کے منکر کو مٹانا واجب ہوگا۔

علاّمہ ابن حزمؒ کا نقطۂ نظر

امام ابن حزم اور علامہ ابوبکر جصاصؒ نے اس موضوع پر خاصی طویل بحث کی ہے، لیکن اس کو پوری طرح سمجھنے کے لیے یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ ان کی بحث دو بحثوں کا مجموعہ ہے۔ ایک یہ کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے اسلامی ریاست کے حاکم کے خلاف تلوار اٹھانے کا کیا حکم ہے؟ دوسری یہ کہ اسلامی ریاست کا کوئی طبقہ اگر بغاوت کردے تو اس کے مقابلے میں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟

پہلے ہم امام ابن حزم کی بحث کی خلاصہ اپنے الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

> "پوری امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ (حاکم وقت اور بغاوت کرنے والوں پر) امر بالمعروف و نہی عن المنکر واجب ہے۔ اس سے کسی بھی شخص کو اختلاف نہیں ہے، البتہ اس کی کیفیت کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض قدیم اہل سنت، جن میں صحابہؓ کی ایک جماعت اور ان کے بعد کے لوگ بھی شامل ہیں، یہ رائے رکھتے ہیں کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر عمل صرف دل سے اور طاقت ہو تو زبان سے ہوگا، اس سے آگے قوت کے ذریعے اور ہتھیار اٹھا کر اس کام کو کبھی بھی انجام نہیں دیا جائے گا۔ ان کی یہ رائے اس صورت میں ہے جب سربراہِ مملکت عادل نہ ہو، لیکن اگر وہ منصف اور عادل

ہے اور اس کے مقابلے میں کسی فاسق و فاجر نے تلوار اٹھائی ہے تو وہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ امام عادل کے ساتھ ہو کر اس سے جنگ کی جائے گی۔

اہل سنت کے ایک دوسرے گروہ کی یہ رائے ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے اس وقت تلوار اٹھانا بالکل واجب ہے جب کہ دفعِ منکر کی سوائے اس کے اور کوئی صورت نہ رہ جائے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر اہل حق ایک جماعت کی شکل میں ہوں اور ان کے لیے دفع منکر کا امکان بھی ہو، ساتھ ہی وہ اپنی کام یابی سے مایوس بھی نہ ہوں تو قوت کے ذریعے معروف کا حکم دینا اور منکر سے منع کرنا ان پر فرض ہے، لیکن اگر وہ اتنی کم تعداد میں ہوں کہ اپنی قلت اور ضعف کی وجہ سے کام یابی کی توقع نہ کر سکتے ہوں تو ان کو اجازت ہے کہ تغیر بالید کی صورت چھوڑ دیں اور حسب استطاعت تغیر باللسان یا تغیر بالقلب پر عمل کریں۔ یہ رائے صحابہؓ کی ایک بہت بڑی تعداد، عام معتزلہ، تمام خوارج اور فرقہ زیدیہ کی ہے۔

جو لوگ پہلے نقطۂ نظر کے قائل ہیں ان میں سے بعض کا کہنا ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے تلوار اٹھانے میں بڑا نقصان ہے، کیوں کہ اس سے محرمات کی اباحت خوں ریزی، اموال کی لوٹ مار، بے عزتی، انتشار اور بدنظمی پھیلتی ہے۔ اس کا جواب دوسروں نے یہ دیا ہے کہ جو شخص امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض انجام دے اس کے لیے قطعاً جائز نہیں ہے کہ ناحق کسی کے مال پر قبضہ کر لے، یا جو لوگ لڑنا نہ چاہیں ان سے تعرض کرے، بلکہ اس کو کسی بھی ممنوع فعل کے ارتکاب کی اجازت نہیں ہے۔ اگر وہ اس قسم کی کسی حرکت کا ارتکاب کرتا ہے تو یہ خود ایک منکر ہے، جس کی تغییر ہونی چاہیے، لیکن اس کا اہلِ منکر کو قتل کرنا خواہ وہ کم ہوں یا زیادہ، ناجائز نہیں ہے، بلکہ یہ اس کا فرض ہے۔ اس کے برعکس اہل منکر کا لوگوں کو قتل کرنا، ان کے اموال پر قبضہ کر لینا اور ان کی عورتوں کی بے حرمتی کرنا، منکر ہے اور لوگوں پر اس کی تغییر واجب ہے، جن اندیشوں کا ان لوگوں نے ذکر کیا ہے وہ تغییر منکر اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی راہ میں اگر رکاوٹ بن سکتے ہیں تو یہی چیز اہل حرب سے جہاد میں بھی مانع ہو سکتی ہے، حالاں کہ کوئی بھی

مسلمان جہاد کے وجوب کا انکار نہیں کرتا۔ فرض کیجیے جہاد کے نتیجے میں نصاریٰ مسلمانوں کی عورتوں اور بچوں کو قید کرلیں، ان کے اموال لوٹ لیں اور ان کی بے عزتی کریں تو کیا ان سے جنگ نہیں کی جائے گی؟ ظاہر ہے، کوئی بھی مسلمان اس کا قائل نہیں ہے، بلا اختلاف سب کے نزدیک ان سے جہاد واجب ہے۔ اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ کفار سے جنگ اور غلط کار حکم رانوں کے خلاف تلوار اٹھانے میں کوئی جوہری فرق نہیں ہے، کیوں کہ ان میں سے ہر ایک جہاد اور قرآن وسنت کی طرف دعوت ہے۔

جب کوئی ظلم واقع ہو، خواہ وہ چھوٹا ہی کیوں نہ ہو،[1] تو ضروری ہے کہ اس سلسلے میں امام سے گفتگو کی جائے اور اس سے اس کو روکا جائے۔ اگر وہ رک جائے اور حق کی طرف رجوع کرے یا قصاص لینے یا حد جاری کرنے کا معاملہ ہو اور وہ اس کے لیے تیار ہوجائے تو اس کو معزول کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ جیسے وہ پہلے مسلمانوں کا امام تھا اب بھی ان کا امام رہے گا، لیکن اگر وہ ان احکام کے نفاذ کے لیے تیار نہ ہو اور حق کی طرف رجوع نہ کرے تو اس کا معزول کرنا اور اس کی جگہ کسی دوسرے شخص کو لے آنا، جو حق کو قائم کرے، ضروری ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: 'تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى وَلاَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ' (المائدۃ:۲)[2] شریعت کے واجبات میں سے کسی بھی واجب کو ضائع کرنا قطعاً جائز نہیں ہے[3]

جصّاص کا نقطۂ نظر

علاّمہ ابوبکر جصّاص فرماتے ہیں:

"سلف اور خلف کے علماء وفقہاء میں سے کسی نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے وجوب کی مخالفت نہیں کی، سوائے حشویہ کے ایک گروہ اور ناواقف

۱؎ یہ بات اتنے عموم کے ساتھ شاید صحیح نہیں ہوگی، بلکہ اس سلسلے میں امام غزالیؒ کے بیان کردہ اصول کو، جس کا ابھی ہم نے تذکرہ کیا ہے، پیش نظر رکھنا ہوگا۔

۲؎ نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں باہم تعاون کرو، لیکن گناہ اور زیادتی کے کاموں میں تعاون نہ کرو۔

۳؎ الفصل فی الملل والاہواء والنحل: ۴/۱۷۰-۱۷۶

اصحابِ حدیث کے۔ ان لوگوں کو باغی گروہ سے جنگ کرنے اور ہتھیار کے ذریعے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض انجام دینے کی صحت سے اختلاف ہے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے اگر ہتھیار اٹھانا اور باغی گروہ سے لڑنا پڑے تو یہ اس کو فتنہ و فساد کہتے ہیں، حالاں کہ وہ اس سلسلے میں اللہ کا یہ قول سن چکے ہیں: فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰی تَفِیْٓءَ اِلٰٓی اَمْرِ اللّٰهِ [الحجرات:۹] (تم باغی جماعت سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرلے) آیت کے الفاظ کا واضح تقاضا ہے کہ باغی گروہ سے جنگ کرنا واجب ہے (یہ صراحت ان کے سامنے ہے، اس کے باوجود) وہ کہتے ہیں کہ حاکمِ وقت ظلم و جور اور قتلِ نفس، جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے، جیسے منکرات کا بھی ارتکاب کرے تو اس پر نکیر نہیں کی جائے گی۔ ہاں اگر غیر حاکم سے ان کا ارتکاب ہو تو زبان یا ہاتھ سے نکیر کا حق ہے۔ مگر اس صورت میں بھی ہتھیار اٹھانے کی اجازت نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ امت کے حق میں اس کے مخالفین سے زیادہ برے ہیں، کیوں کہ انھوں نے لوگوں کو باغی گروہ سے جنگ اور حاکم کے ظلم و جور پر نکیر کرنے سے روک دیا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ فاسق و فاجر بلکہ مجوس اور اسلام کے دشمن غالب آ گئے ہیں، سرحدیں خراب ہو رہی ہیں، ظلم پھیل رہا ہے، شہر برباد ہو رہے ہیں، الحاد، غلو، مذاہب ثنویت اور خرمیہ اور مزدکیہ جیسے فرقے ظاہر ہو چکے ہیں۔ یہ سب نتیجہ ہے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو چھوڑنے اور سلطان جائر پر نکیر نہ کرنے کا۔"[1]

امام الحرمین فرماتے ہیں:

اذا جار والی الوقت وظهر ظلمه وغشمه ولم ینزجر حین زجر عن سوء صنیعه بالقول فلاهل	حاکم وقت اگر ظلم کرے اور اس کا ظلم و جور نمایاں ہو جائے اور زبان سے منع کیے جانے پر وہ اپنے اس برے عمل سے باز نہ آئے تو

[1] احکام القرآن: ۲/ ۴۳

الحل و العقد التواطئو علی خلعه و لو بشهر الاَسلحة و نصب الحروب[1]

اہلِ حل وعقد کو اس کی معزولی پر اتفاق کرنا چاہیے، خواہ اس کے لیے تلوار اٹھانا اور جنگ کرنا ہی پڑے۔

امام نوویؒ اس خیال کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

هٰذا الذی ذکرہ من خلعه غریب و مع هٰذا فهو محمول علی ما اذا لم یخف منه اثارة مفسدة اعظم منه[2]

امام کی معزولی کی یہ بات، جو امام الحرمین نے کہی ہے، کچھ انوکھی سی ہے۔ اس کے باوجود وہ ایسی صورتِ حال پر محمول ہوگی جب کہ اس سے کسی اس ظلم سے بھی بڑے فتنے کے برپا ہوجانے کا اندیشہ نہ ہو۔

امام نوویؒ نے اپنے اس خیال اور تبصرے پر کوئی دلیل نہیں دی ہے، حالاں کہ امام الحرمین اپنی اس رائے میں منفرد نہیں ہیں، بلکہ جیسا کہ ابھی ہم نے بیان کیا ہے، امام ابنِ حزم اور علامہ ابوبکر جصاص جیسے محققین ان کے ساتھ ہیں۔ باقی رہی یہ بات کہ عزل امام کا اقدام اس وقت کیا جائے گا جب کہ کسی بڑے فتنے کا اندیشہ نہ ہو تو اس کی معقولیت سے کون انکار کرسکتا ہے؟

---

[1] شرح مسلم للنووی: المجلّد الاول، الجزء ۲، ص ۲۳

[2] حوالہ سابق

☆☆

تجدیدِ دین و اصلاحِ اُمت

قوموں کے عروج و زوال کا قانون

دنیا کا کوئی بھی گروہ ایسا نہیں ہوسکتا، جس کا ہر فرد برائیوں سے پاک اور صلاح وتقویٰ کے اونچے معیار پر ہو۔ ہر جماعت میں اچھے اور برے دونوں طرح کے انسان ہوتے ہیں۔ جماعت کے نیک اور صالح افراد کی ذمہ داری ہے کہ معاشرے میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے برابر سرگرمِ کار رہیں، بروں کی اصلاح کریں اور ان کو راہِ راست پر لے چلیں۔ اگر انھوں نے اس میں کوتاہی کی تو برائی عام ہوگی اور پوری قوم کو تباہ کرکے رکھ دے گی۔ کسی قوم کے اندر خیر کو پھیلانے اور شر کو مٹانے والے افراد اس کا جوہرِ حیات ہوتے ہیں جب وہ خاموش ہوجاتے ہیں تو قوم اپنی زندگی کھو دیتی ہے۔ قوموں کے عروج اور ترقی کا زمانہ وہ ہوتا ہے جب کہ وہ اپنی اجتماعی زندگی سے برائیوں کو مستقل دور کرتی اور اپنی اخلاقی قوت میں ہر دن اضافہ کرتی رہتی ہے۔ جس جماعت میں نیک سیرت افراد کی تعداد بدکردار لوگوں سے زیادہ ہو اور برائی صرف چند گوشوں میں محدود ہو، اللہ تعالیٰ اسے زمین پر باقی رکھتا اور اس کے لیے ترقی کے مواقع فراہم کرتا ہے، لیکن اگر بروں کی تعداد اچھوں کی تعداد پر غالب آجائے اور زندگی کے ہر گوشے میں بدی پھیل جائے تو اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ زوال کی طرف بڑھنے لگتی ہے اور بحیثیت ایک قوم دھیرے دھیرے ختم ہو جاتی ہے۔ اس تباہی و بربادی میں وقت تو لگ سکتا ہے اور بالعموم لگتا بھی ہے، لیکن کوئی بدکردار قوم اس سے بالکلیہ محفوظ نہیں رہ

سکتی۔ یہی حقیقت قرآن کریم کی اس آیت میں بیان ہوئی ہے:

وَ اتَّقُوْا فِتْنَةً لَّاتُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً (الانفال:۲۵)

اس فتنے سے ڈرو جو مخصوص طور پر تم میں سے صرف ان ہی لوگوں کو لاحق نہیں ہوگا جنھوں نے ظلم کیا ہے (بلکہ وہ عام ہوگا اور اس کی زد میں سب ہی آجائیں گے)۔

رسولِ خداﷺ سے حضرت زینبؓ بنت جحش نے پوچھا: أنهلك وفينا الصالحون؟ کیا ہم ہلاک ہوجائیں گے جب کہ ہمارے اندر نیک لوگ بھی موجود ہوں گے؟ آپؐ نے جواب دیا: نعم اذا كثر الخبث[1] ہاں جب کہ بدی بہت بڑھ جائے۔

یہ نصوص اپنے مفہوم میں واضح ہیں کہ جب کسی قوم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوتا ہے تو اس کی زد میں بروں کے ساتھ نیک اور صالح افراد بھی آجاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس عام قانون کے سلسلے میں بعض تفصیلات بھی قرآن و حدیث میں بیان ہوئی ہیں۔ یہاں ان کی کسی قدر وضاحت کی جائے گی۔

مصلحین عذابِ عام سے محفوظ ہوتے ہیں

بعض لوگ اپنی حد تک تو نیک ہوتے ہیں، لیکن دوسروں میں نیکی نہیں پھیلاتے۔ وہ خود تو بدی سے بچتے ہیں، لیکن معاشرے میں بدی کو برداشت کرتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس بعض لوگوں کی نیکی انھیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ دنیا میں نیکی کو مٹتے اور بدی کو فروغ پاتے ہوئے دیکھیں۔ وہ نیکی پر عمل بھی کرتے ہیں اور دوسروں میں اسے پھیلاتے بھی ہیں، بدی سے اجتناب بھی کرتے ہیں اور دوسروں کو اس سے باز رکھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔

ہمارے بعض علماء نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذابِ عام آتا ہے تو بروں کے ساتھ یہ دونوں ہی قسم کے نیک انسان اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ لیکن یہ

---

[1] بخاری، کتاب الفتن، باب ویل للعرب من شر قد اقترب۔ مسلم، کتاب الفتن و اشراط الساعة

خیال صحیح نہیں ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ عذابِ عام میں بروں کے ساتھ صرف پہلی قسم کے افراد ہلاک ہوتے ہیں اور دوسری قسم کے نیک انسان بچالیے جاتے ہیں۔ قرآن نے صراحت کی ہے کہ جب اللہ کی نافرمان قوموں پر اس کا عذاب نازل ہوا تو اس نے اپنے رسولوں اور اہلِ ایمان کو بچالیا:

ثُمَّ نُنَجِّي رُسُلَنَا وَالَّذِينَ اٰمَنُوا كَذٰلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا نُنجِ الْمُؤْمِنِينَ

(یونس: ۱۰۳)

پھر ہم (جب کہ ہمارا عذاب آتا ہے) بچالیتے ہیں اپنے رسولوں کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے۔ یہی ہمارا طریقہ ہے۔ ہم پر حق ہے کہ مومنوں کو بچالیں۔

اللہ تعالیٰ کے رسول اصلاح و ہدایت کے لیے بھیجے جاتے ہیں، ان کی بہترین صلاحیت اس کام میں صرف ہوتی ہے۔ ان کی قومیں جس ظلم اور فتنہ وفساد میں مبتلا ہوتی ہیں وہ اس کے خلاف پوری قوت کے ساتھ اور مسلسل جدوجہد کرتے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ ان کو اس ظلم کے نتیجے سے بھی محفوظ رکھتا ہے جس سے ان کی قومیں دوچار ہوتی ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دنیا کو راہِ ہدایت دکھانے والے ہر حال میں اللہ کے عذاب سے محفوظ ہوتے ہیں۔ احادیث میں صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ بروں کے ساتھ بھلے اس وقت اللہ کے عذاب کی زد میں آتے ہیں جب کہ وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض ترک کر چکے ہوں اور اصلاحِ حال کی کوشش نہ کر رہے ہوں۔

رسولِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

ما من قوم یعمل فیھم بالمعاصی ثم یقدرون علی ان یغیّروا ثم لم یغیّروا الّا یوشک ان یعمّھم اللّٰہ منہ بعقاب[1]

جس کسی قوم میں اللہ کی نافرمانی ہوتی ہے اور اس میں ایسے لوگ موجود ہوں جو اس کو بدل سکتے ہوں اور پھر وہ نہ بدلیں تو بہت جلد اللہ تعالیٰ ان پر اپنا عذابِ عام بھیج دے گا۔

ایک دوسری روایت ہے:

---

[1] ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب الامر والنہی، وروی الترمذی والنسائی بمعناہ

ان اللّٰہ عز وجل لاَ یعذّب العامّۃ بعمل الخاصۃ حتّٰی یروا المنکر بین ظھرانیھم و ھم قادرون علٰی ان ینکروا فلا ینکروہ فاذا فعلو ذلک عذّب اللّٰہ الخاصّۃ والعامّۃ[1]

یقیناً اللہ تعالیٰ خاص لوگوں کے عمل (بد) کی وجہ سے عام لوگوں کو عذاب نہیں دیتا، تاآں کہ وہ اپنے درمیان منکر کو دیکھیں اور اس پر نکیر کی قدرت کے باوجود نکیر نہ کریں، جب ان کی روش یہ ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ خواص اور عوام سب پر اپنا عذاب نازل کر دیتا ہے۔

یہ حدیثیں ظاہر کر رہی ہیں کہ اللہ کا عذاب یا تو کسی قوم کے ان لوگوں پر آتا ہے جو منکرات میں مبتلا ہوں یا ان لوگوں پر جو ان منکرات کو مٹانے کی طاقت رکھنے کے باوجود ان کو مٹانے کی کوشش نہ کر رہے ہوں۔ اس سے خود بخود یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ افراد جو بگڑے ہوئے ماحول میں تغییر منکر کا فرض انجام دے رہے ہوں وہ اللہ کے عذاب سے محفوظ ہوتے ہیں۔ محدث ابن ابی جمرہ اور علامہ قرطبی کی بھی یہی رائے ہے۔[2]

اصحابِ سبت کے واقعے سے تائید

اس کی تائید اصحابِ سبت کے واقعہ سے بھی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لیے سبت یعنی ہفتہ کے دن کو مقدس قرار دیا تھا۔ ان کو حکم تھا کہ وہ اس دن کو اللہ کی عبادت کے لیے مخصوص کر دیں اور کوئی دنیوی کام نہ کریں۔ لیکن ان کی ایک آبادی نے جو سمندر کے کنارے واقع تھی، اس حکم کی خلاف ورزی کی اور ہفتہ کے دن مچھلی کا شکار کرنے لگی۔ قرآن کہتا ہے کہ ان کے اس غلط رویہ پر آبادی کے ایک طبقے نے نصیحت کی اور انھیں باز رکھنے کی کوشش کی تو ایک تیسرے طبقے نے ان مصلحین سے کہا:

لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۨاللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا (الاعراف: ۱۶۴)

تم ان لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنھیں اللہ ہلاک کرنے والا یا سخت عذاب دینے والا ہے۔

---

[1] مسند احمد: ۵/ ۲۱۳

[2] فتح الباری: ۱۳/ ۴۸

ان نصیحت کرنے والوں کے پاس اس کا جواب یہ تھا کہ ہم یہ سب کچھ اس لیے کر رہے ہیں تاکہ:

مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ۝ (الاعراف: ۱۶۵)

تمھارے رب کے حضور ہم معذرت پیش کرسکیں اور شاید یہ لوگ اپنے غلط رویّہ سے باز آ جائیں۔

اس طرح یہ آبادی تین گروہوں میں بٹ گئی۔ ایک گروہ نے اللہ کے حکم کی صریح خلاف ورزی کی اور سبت کی حرمت پامال کی، دوسرے گروہ نے اس کو نصیحت کی اور باز رکھنے کی کوشش کی، تیسرے گروہ نے نہ تو اللہ کے حکم کی نافرمانی کی اور نہ اس گروہ کو، جو علانیہ نافرمانی کر رہا تھا، اس سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ قرآن ان تینوں گروہوں کے ذکر کے بعد کہتا ہے:

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْءِ وَ اَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍ بَئِيْسٍ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ۝ (الاعراف: ۱۶۶)

پس جب وہ ان باتوں کو بالکل فراموش کر گئے، جن کی ان کو نصیحت کی گئی تھی تو ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو انھیں برائی سے روکتے رہے تھے اور ظلم کرنے والوں کو ان کی نافرمانی کی وجہ سے سخت عذاب میں پکڑ لیا۔ پس جب وہ اس جرم میں حد سے بڑھ گئے، جس سے ان کو منع کیا گیا تھا تو ہم نے ان سے کہا کہ ہو جاؤ بندر ذلیل وخوار۔

ان آیات میں قرآن نے صراحت کے ساتھ دو باتیں کہی ہیں: ایک یہ کہ جس گروہ نے حکم خداوندی کی نافرمانی کی وہ اس کے عذاب میں گرفتار ہوگیا۔ دوسری یہ کہ جن لوگوں نے اس گروہ کو اس نافرمانی سے روکنے کی کوشش کی وہ اس عذاب سے محفوظ رہے۔ یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ اللہ کی طرف سے کسی قوم پر عذاب آتا ہے تو وہ لوگ اس سے بالکل مامون ہوتے ہیں جو اس کے اندر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض انجام دیتے رہتے ہیں۔

اوپر کے واقعہ میں قرآن نے اس تیسرے گروہ کے انجام کا صراحت سے کوئی ذکر نہیں کیا ہے، جو نہ تو سبت کی حرمت کو پامال کر رہا تھا اور نہ ان لوگوں کو منع کر رہا تھا جو اس جرم کا ارتکاب کر رہے تھے۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ گروہ بھی نجات پانے والوں میں تھا، لیکن بعض دوسرے اہلِ علم کی رائے ہے کہ اللہ کا عذاب اس پر بھی آیا تھا۔ اوپر ہم نے جو حدیثیں نقل کی ہیں ان سے اسی دوسری رائے کی تائید ہوتی ہے۔ کیوں کہ ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی قوم میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی طاقت رکھنے والے افراد اس فرض کو چھوڑ دیتے ہیں، تو نہ صرف قوم تباہ ہوتی ہے، بلکہ اس کے ساتھ وہ خود بھی تباہ ہوتے ہیں۔ علامہ شوکانی فرماتے ہیں:

... فان كان من يتاهل للامر بالمعروف والنهى عن المنكر معرضاً عن ذلك غير قائم بحجة الله ولاَ مبلغ لها الىٰ عباده فهو شريكهم فى جميع مااقترفوه من معاصى اللّٰه سبحانه مستحق للعقوبة المعجلة و المؤجلة قبلهم، كما صحّ فى قصة من تعدى السبت من اتباع موسىٰ عليه السلام فان اللّٰه تعالىٰ ضرب من ترک الاُمر بالمعروف و النهى عن المنكر بسخط عذابه و مسخهم قردة و خنازير مع انهم لم يفعلوا مافعله المعتدون من الذنب بل سكتوا عن ابلاغ

... جو شخص امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی اہلیت رکھتا ہے، وہ اگر اس سے اعراض کر جائے اور اللہ کی حجت قائم نہ کرے اور نہ اس کے بندوں تک اسے پہنچائے تو وہ ان تمام گناہوں میں جن کا اس کے نافرمان بندے ارتکاب کرتے ہیں، ان کا شریک قرار پائے گا اور ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو دنیوی اور اُخری سزا ملے گی اس کا وہ بھی مستحق ٹھہرے گا، جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کی قوم کے ان لوگوں کے معاملے سے ثابت ہے جنھوں نے سبت کے سلسلے میں زیادتی کی تھی، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر بھی اپنا عذاب نازل کیا تھا جنھوں نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو چھوڑ دیا تھا اور ان کی شکلوں کو مسخ کرکے بندر اور سور بنا دیا تھا۔ ایسا اس کے باوجود ہوا کہ اس گناہ کا انھوں نے ارتکاب نہیں کیا تھا جس کا ارتکاب حد سے بڑھ جانے والوں نے کیا تھا۔ ان کی غلطی بس یہ تھی کہ

حجته و القیام بما امر هم به من الأمر بالمعروف و النهی عن المنکر، والحاصل انه لاَ فرق بین من فعل المعصیة و بین من رضی بها و لم یفعلها و بین من لم یرض بها لکن ترک النهی عنها مع عدم المسقط لذلک عنهم[1]	اللہ تعالیٰ کی حجت کے پہنچانے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا جو حکم انھیں ملا تھا اس کے انجام دینے سے وہ رک رہے تھے۔ حاصل یہ کہ معصیت کا ارتکاب کرنے والے، اس کا ارتکاب نہ کرنے کے باوجود اسے پسند کرنے والے، اسے پسند نہ کرنے کے باوجود نہی عن المنکر کا فریضہ، بغیر کسی ایسے سبب کے جو اسے فی الواقع ساقط کردینے والا ہو، چھوڑ بیٹھنے والے سب کے سب برابر ہیں۔

بروں کی اصلاح نیکوں کا فرض ہے

قرآن نے مختلف مواقع پر حق وباطل کی داستانِ کش مکش بیان کی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب کسی قوم میں دعوتِ حق اٹھتی ہے تو وہ دو گروہوں میں بٹ جاتی ہے۔ ایک طرف اصحابِ غرض ہوتے ہیں جو ہر قدم پر اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ دوسری طرف اصحابِ اخلاص ہوتے ہیں جو آگے بڑھ کر اسے اس طرح سینے سے لگا لیتے ہیں کہ وہ ان کے دل و دماغ میں پوری طرح اتر جاتی ہے اور ان کے ایک ایک عمل سے اس کا اظہار ہونے لگتا ہے۔ وہ پوری وفاداری کے ساتھ اس کی خدمت کرتے ہیں اور اس کے لیے ہر طرح کی مشقتیں برداشت کرتے ہیں، حتّٰی کہ ان کی زندگی اور موت اسی کے لیے اور صرف اسی کے لیے ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ حالت زیادہ دنوں تک باقی نہیں رہتی، رفتہ رفتہ باعمل انسانوں کی جگہ بے کردار افراد لینے لگتے ہیں، ان کی زندگی نفاق کا شکار ہوجاتی ہے اور وہ اللہ کا نام لینے کے باوجود اللہ سے بہت دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ قرآن نے بعض پیغمبروں کے ذکر کے بعد ایک جگہ فرمایا ہے:

فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ (مریم:۵۹)	پھر ان کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہوئے جنھوں نے نماز کو ضائع کردیا اور خواہشات کے پیرو ہو رہے۔

[1] مجموعۃ الرسائل المنیریۃ، الجزء الثانی، الرسالۃ الاولیٰ (الدواء العاجل فی دفع العدوا الصائل) ص ۲-۳

اپنے اسلاف کے یہ بدترین جانشین دعوت حق کے لیے باعثِ رسوائی ہوتے ہیں۔ ان کا وجود ملت اسلامیہ کے لیے اس کے کھلے ہوئے دشمنوں سے زیادہ خطرناک ثابت ہوسکتا ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ بسا اوقات ہوا بھی ہے۔ ایسے لوگوں کی اصلاح کی کوشش کرنا اور ان کے غلط اثرات کو پھیلنے سے روکنا، ان لوگوں کی ذمے داری ہے جو صحیح معنی میں خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ اگر کسی کے اندر اس اصلاح کی تڑپ نہیں ہے اور وہ اس صورتِ حال کو بدلنے کے لیے بے چین نہیں ہے تو اس کا ایمان خطرے میں ہے۔ نبی ﷺ فرماتے ہیں:

مامن نبی بعثه اللّٰه تعالیٰ فی امة قبلی الٰاکان له من امتهٖ حواریون و اصحاب یاخذون بسنته و یقتدون بامره، ثم انها تخلف من بعدهم خلوف یقولون ما لاَ یفعلون و یفعلون ما لایؤمرون، فمن جاهدهم بیده فهو مومن و من جاهدهم بلسانه فهو مومن و من جاهدهم بقلبه فهو مومن و لیس وراء ذٰلک من الٰایمان حبة خردل[1]

مجھ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے جس نبی کو بھی کسی امت میں مبعوث فرمایا، اس کی امت میں اس کے ایسے مددگار اور ساتھی ضرور رہے جو اس کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کرتے اور اس کے احکام کی اتباع کرتے تھے، پھر ان کے بعد ایسے برے جانشین پیدا ہوئے جو باتیں وہ کرتے، جن پر خود عمل نہ کرتے اور کام وہ کرتے جن کا ان کو حکم نہ ملا ہوتا۔ پس جس نے ان سے اپنے ہاتھ سے جہاد کیا وہ مومن ہے اور جس نے ان سے اپنی زبان سے جہاد کیا وہ (بھی) مومن ہے اور جس نے ان سے اپنے دل سے جہاد کیا وہ (بھی) مومن (ہی) ہے، لیکن اس کے بعد رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔

دوسروں کی اصلاح سے اپنی اصلاح ہوتی ہے

بگڑے ہوئے ماحول میں نیک سے نیک آدمی کے بھی راہِ راست سے ہٹ

---

[1] مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کون النہی عن المنکر من الایمان الخ

جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس سے نجات کی صورت صرف یہ ہے کہ آدمی اس ماحول سے پوری قوت کے ساتھ اور مسلسل جنگ کرتا رہے، شر کے مقابلے میں خیر کا داعی بن جائے اور جہاں کوئی خرابی نظر آئے اس کی اصلاح کے لیے دوڑ پڑے۔ اگر اس میں اس نے کوتاہی کی تو ماحول کے غلط اثرات خود اس کی ذات پر پڑنے لگیں گے اور وہ بگاڑ سے محفوظ نہ رہ سکے گا۔ بسا اوقات انسان یہ دیکھ کر اصلاح کی کوشش چھوڑ دیتا ہے کہ اس کی بات سنی نہیں جاتی اور اس کا اثر ظاہر نہیں ہوتا، حالاں کہ اس میں خود اس کا ذاتی نقصان ہے۔ جب آدمی بدی کے مقابلے میں شکست کھا کر اصلاح کی کوشش چھوڑ دیتا ہے تو فطری طور پر اس کے دل میں برائیوں کے خلاف وہ نفرت بھی باقی نہیں رہتی جو فی الواقع ہونی چاہیے، پھر آہستہ آہستہ وہ ان سے مانوس ہونے لگتا ہے، یہاں تک کہ ایک وقت وہ بھی آتا ہے کہ برائیوں سے شدید نفرت کرنے والا انسان خود ان ہی میں ملوث ہو جاتا ہے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے چھوڑنے سے بنی اسرائیل کے نیک لوگ بگڑ گئے

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں برائیاں پھیلنے لگیں تو ابتداء میں نیک لوگ ان برائیوں پر ٹوکتے تھے، لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ ان کی یہ نکیر کارگر نہیں ہو رہی ہے تو انھوں نے خاموشی اختیار کرلی اور پھر یہ بھی ہوا کہ وہ ان ہی بروں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے لگے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ برائی سے نفرت جو ایک مومن کا سرمایہ ہوتی ہے، ان کے دلوں سے ختم ہوگئی۔ اس کے بعد ان میں ایسے افراد نہیں رہے جو بدی کو بدی کہتے اور اس پر نکیر کرتے۔ جب یہ حالت ہوگئی تو خدا کی نظرِ عنایت ان سے پھر گئی اور وہ اس کی لعنت کے مستحق قرار پائے۔ ابوداؤد کی روایت ہے:

قال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم: ما دخل النقص علیٰ بنی اسرائیل کان الرجل یلقی الرجل فیقول یا ھٰذا اتق اللّٰہ ودع ما	رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل میں نقص کی ابتدا یوں ہوئی کہ ایک آدمی دوسرے آدمی سے (جو مرتکب جرم ہوتا) ملاقات کرتا اور اسے سمجھاتا کہ اے اللہ کے بندے! خدا

تصنع فانه لاَ یحل لک ثم یلقاه من الغد فلا یمنعه ذٰلک ان یکون اکیله و شریبه و قعیده، فلما فعلوا ذٰلک ضرب اللّٰہ قلوب بعضهم علی بعض ثم قال لُعِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ[1]

سے ڈر اور اپنے اس غلط کام کو چھوڑ دے، کیوں کہ یہ تیرے لیے جائز نہیں ہے۔ (لیکن اس نصیحت کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا) اب یہ ناصح اس سے دوسرے دن ملتا تو اس کی معصیت کاری اسے اس چیز سے نہ روکتی کہ وہ اس کا ہم پیالہ وہم نوالہ و ہم نشیں بن جائے۔ جب یہ حال ہوا تو اللہ نے سب کے دل ایک سے کر دیے۔ اس بعد آپؐ نے قرآن کی آیت پڑھی کہ 'بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ان پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے لعنت کردی گئی'۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے چھوڑنے پر بنی اسرائیل کی مذمت

قرآن نے بنی اسرائیل کے علماء اور سربرآوردہ کارگروہ کی اس بات پر سخت مذمت کی ہے کہ اللہ نے ان کو اصلاحِ امت کا اونچا مقام دیا تھا، لیکن وہ اپنی ذمے داریوں سے غافل رہے۔ عوام ان کے سامنے معصیت کی زندگی گزار رہے تھے، ایک دوسرے پر ظلم و زیادتی کر رہے تھے اور حرام وحلال سے بے نیاز ہو چکے تھے، لیکن وہ اس صورتِ حال کو تبدیل کرنے کی قطعاً کوشش نہیں کر رہے تھے:

وَ تَرٰی کَثِیْرًا مِّنْهُمْ یُسَارِعُوْنَ فِی الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ اَکْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ० لَوْلَا یَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِیُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَ اَکْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا کَانُوْا یَصْنَعُوْنَ ०

(المائدۃ: ۶۲-۶۳)

اور تم ان میں سے بہت سوں کو دیکھو گے کہ وہ گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں اور حرام مال کے کھانے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جا رہے ہیں، یقیناً بہت برا ہے جو یہ کر رہے ہیں۔ ان کو ان کے مشائخ اور علماء جھوٹ بولنے اور مال حرام کھانے سے کیوں نہیں منع کرتے۔ یقیناً بہت بری روش ہے جو وہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔

---

[1] ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب الامر والنہی۔ وروی الترمذی بمعناه

ان آیات کے ذیل میں امام رازیؒ فرماتے ہیں:

ان اللّٰہ تعالٰی استبعد من اھل الکتاب انھم ما نھوا سفلتھم و عوامھم عن المعاصی وذلک یدل علیٰ ان تارک النھی عن المنکر بمنزلة مرتکبه لِانه تعالیٰ ذم الفریقین فی ھٰذا الْاٰیة علیٰ لفظ واحد[1]	اللہ تعالیٰ نے علماء اہلِ کتاب سے یہ بات (ان کے مقام سے) بعید قرار دی ہے کہ انھوں نے اپنے نیچے کے لوگوں اور عوام کو معاصی سے منع نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ منکر سے نہ روکنے والا بھی منکر کا ارتکاب کرنے والے ہی کے درجے میں ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دونوں گروہوں کی ایک ہی قسم کے الفاظ میں مذمت کی ہے۔

اتنا ہی نہیں، امام رازیؒ اور دوسرے مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ قرآن نے منکر کا ارتکاب کرنے والوں کے بارے میں اتنا سخت لفظ اختیار نہیں کیا ہے جتنا سخت کہ منکر سے نہ منع کرنے والوں کے بارے میں اختیار فرمایا ہے۔ پہلے گروہ کے لیے تو اس نے صرف 'یَعْمَلُوْنَ' ہی کہا ہے، جب کہ دوسرے کے لیے 'یَصْنَعُوْنَ' فرمایا ہے۔

قرآن مجید نے ان آیات میں علماء بنی اسرائیل پر جو تنقید کی ہے اس میں امتِ مسلمہ اور خاص کر اس کے اہلِ علم کے لیے بڑی عبرت اور بڑا سبق ہے۔ اس میں ان کو بتایا گیا ہے کہ وہ بھی اللہ کی اسی زجر و ملامت اور عتاب کا نشانہ ہوں گے اگر وہ اپنی ذمے داریوں سے غافل ہو رہے اور اصلاحِ امت کا کام چھوڑ بیٹھے۔ اللہ کو نہ تو کسی سے کوئی ذاتی تعلق ہے کہ اس کی کم زوریوں کے باوجود اس سے محبت کرے اور نہ کسی سے اسے ذاتی عداوت اور دشمنی ہے کہ اس کی خوبیوں کے باوجود اس سے نفرت کرے۔ اسی وجہ سے حق پرست علماء نے ہمیشہ اس آیت کو اپنے حق میں زبردست تنبیہ سمجھا ہے۔

ابن جریرؒ فرماتے ہیں:

کان العلماء یقولون ما فی القراٰن	علماء کہا کرتے تھے کہ قرآن میں کوئی بھی

---

[1] مفاتیح الغیب (تفسیر کبیر)، المجلد السادس، الجزء ۱۲، ص ۳۴

اٰیۃ اشدّ توبیخاً للعلماء من ھٰذہ الاٰیہ ولاَ أخوف علیھم منھا	آیت ایسی نہیں ہے، جس میں اصحابِ علم کے لیے اس سے زیادہ سخت توبیخ ہو اور جوان کے لیے اس سے زیادہ خوف کا باعث ہو۔

اس آیت کے بارے میں یہی بات حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، ضحاکؒ اور عطاءؒ تابعی نے بھی کہی ہے[1]

رسولِ اکرم ﷺ نے ایک موقع پر بنی اسرائیل کے قومی بگاڑ اور تباہی کے ذکر کے بعد امت کو ہدایت فرمائی:

کلا و اللّٰہ لتامرنّ بالمعروف و لتنھونّ عن المنکر و لتاخذنّ علی ید الظالم و لتاطرنّہ علی الحق اطرا[2]	ہرگز نہیں! قسم خدا کی، تم ضرور معروف کا حکم دو اور ضرور منکر سے روکو اور ظالم کا ہاتھ لازماً پکڑ لو اور اس کو ضرور حق کی طرف پھیر دو۔

امت مسلمہ کا دورِ اول اس کے لیے مثالی دور ہے

اس امت کے لیے اس کا دورِ اول ہر حیثیت سے ایک اعلیٰ مثال اور بہترین نمونہ ہے، کیوں کہ یہ دور اللہ کے دین کی خدمت اور اس کے نتائج دونوں پہلوؤں سے اس کا قابل رشک دور تھا۔ اس میں ہر طرف خدا پرستی اور نیکی چھائی ہوئی تھی، حق غالب اور باطل مغلوب تھا، معروف کی حکومت تھی اور منکر سرنگوں تھا، بدی کی جگہ نیکی اور شر کی جگہ خیر کی فرماں روائی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے جس طرح دعوتِ دین کا کام اعلیٰ پیمانے پر کیا تھا، اسی طرح آپؐ نے امت کی جس طرح اصلاح و تربیت کی وہ بھی مثالی تھی۔ اس سے بہتر کسی گروہ کی تربیت کا تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس مبارک دور کے پاکیزہ اثرات آپؐ کے بعد بھی مدت دراز تک باقی رہے اور پھر بہ تدریج کم ہوتے چلے گئے۔

---

[1] جامع البیان فی تفسیر القرآن: ۶/ ۱۷۰

[2] ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب الامر والنہی

بہ الفاظِ دیگر امت اپنے دورِ خیر و صلاح کے بعد بگاڑ کی طرف بڑھنے لگی۔ نبی ﷺ کی پیغمبرانہ بصیرت نے بہت پہلے اس کی پیشین گوئی کردی تھی۔ آپؐ نے فرمایا تھا:

خیرکم قرنی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم، قال عمران فلا ادری قال رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلم بعد قرنه مرتین او ثلاثا، ثم یکون بعدهم قوم یشهدون و لاَ یستشهدون و یخونون و لاَ یؤتمنون و ینذرون و لاَ یوفون و یظهرفیهم السمن[1]

تمہارا سب سے اچھا دور میرا دور ہے، پھر ان لوگوں کا دور ہے جو اس کے بعد آئیں گے۔ اس کے بعد ان لوگوں کا جو اس کے بعد آئیں گے۔ حضرت عمرانؓ (راوی حدیث) نے کہا کہ مجھے یاد نہیں رہا کہ نبی ﷺ نے اپنے بعد دو زمانوں کا ذکر کیا یا تین زمانوں کا۔ آپؐ نے فرمایا: ان ادوار کے بعد ایسے لوگ ہوں گے جو (آگے بڑھ بڑھ کر) گواہی دیں گے، لیکن وہ گواہی کے لیے طلب نہیں کیے جائیں گے۔ وہ خیانت کریں گے، اس لیے کوئی ان کے پاس امانت نہیں رکھے گا۔ وہ نذر مانیں گے، لیکن نذر پوری نہیں کریں گے اور ان میں موٹاپا (تعیش) پھیل گیا ہوگا۔

ظاہر ہے، امت کے پہلے لوگوں کی یہ تعریف بلاوجہ نہیں تھی، بلکہ اس لیے وہ تعریف کے مستحق قرار پائے تھے کہ انھوں نے دین کی راہ میں زبردست قربانیاں دی تھیں اور امت کی اصلاح و تربیت اور نصح و خیر خواہی سے کبھی غافل نہیں رہے۔ اگر یہ خوبیاں بعد کے کسی دور میں پائی جائیں تو بلاشبہ وہ بھی قابلِ تعریف ہوگا۔ علامہ قرطبیؒ کہتے ہیں:

ان قرنه انما فضل لاَنهم کانوا غرباء فی ایمانهم لکثرة الکفار و صبرهم علی اذاهم و تمسکهم بدینهم وان اواخرهٰذهِ الاُمة اذا

آپؐ کے دور کے لوگوں کو اس لیے فضیلت دی گئی کہ وہ اپنے ایمان کی بنا پر معاشرے میں اجنبی تھے کیوں کہ کفار کی کثرت تھی اور انھوں نے ان کی ایذا رسانیوں پر صبر کیا تھا

---

[1] بخاری، باب فضائل اصحاب النبیؐ۔ مسلم، کتاب الفضائل، باب فضل اصحابہ ثم الذین یلونہم الخ واللفظ لمسلم

اقاموا الدین وتمسکوا بہ و صبروا علیٰ طاعة ربھم فی حین ظھور الشر و الفسق و الھرج و المعاصی و الکبائر کانوا عند ذٰلک ایضًا غرباء و زکت اعمالھم فی ذٰلک الوقت کما زکت اعمال اوائلھم[1]

اور اپنے دین پر مضبوطی سے ثابت قدم رہے تھے۔ اس امت کے پچھلے لوگ بھی اس وقت، جب کہ بدی اور فسق و فجور کا، فتنہ اور معاصی کا اور کبائر کا ظہور ہو چکا ہو، اگر دین کو قائم رکھیں گے اور اسے مضبوطی سے پکڑے رہیں گے اور اللہ کی بندگی پر جمے رہیں گے تو وہ بھی اپنے ماحول میں اجنبی بن جائیں گے اور ان کے اعمال بھی اسی طرح اونچے اور ستھرے ہوجائیں گے جس طرح ان سے پہلوں کے اعمال اونچے اور ستھرے ہوئے تھے۔

دین کی اجنبیت دورِ اوّل و دورِ آخر میں

رسولِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ دین جس طرح اپنے دورِ آغاز میں اجنبی تھا اسی طرح وہ بعد کے دور میں بھی اجنبی بن جائے گا۔ بہت ہی مبارک ہیں وہ لوگ جو ان حالات میں دین پر قائم رہیں اور اس کی وجہ سے اپنے ماحول میں بیگانہ بن جائیں:

بدأ الاِسلام غریبا و سیعود کما بدأ غریبًا فطوبا للغرباء[2]

اسلام کا آغاز اجنبیت کی حالت میں ہوا اور پھر وہ اسی طرح اجنبیت کی حالت میں لوٹ جائے گا جیسا کہ شروع میں تھا۔ پس خوش خبری ہے اجنبیوں کے لیے۔

دین کی اجنبیت اس کا انکار کرنے والوں میں

بعد کے ادوار میں دین کے اجنبی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نبی ﷺ کی بعثت کے وقت جس طرح جاہلیت کا غلبہ تھا، پھر جاہلیت کا غلبہ ہوجائے اور ہر طرف باطل کی فرماں روائی ہونے لگے۔ ذہنوں پر غلط افکار چھا جائیں اور صحیح فکر رکھنے اور اسے پیش کرنے والے اقلیت میں چلے جائیں اور انھیں گوارا نہ کیا جائے، گھنی آبادیاں اللہ تعالیٰ

---

[1] الجامع لاحکام القرآن، المجلد الثانی، الجزء ۴، ص ۱۱۱

[2] مسلم، کتاب الایمان، باب بیان ان الاسلام بدء غریباً الخ

کے ذکر اور چرچے سے خالی ہوجائیں اور اس کے دین پر عمل کرنے والے صفحۂ زمین پر تھوڑے رہ جائیں، بڑی بڑی بستیوں میں اللہ کا نام اور اس کے دین کی رہ نمائی حاصل کرنے والے کم سے کم ہوجائیں اور انسانوں پر دین سے غفلت چھا جائے۔ چناں چہ نبی ﷺ سے پوچھا گیا کہ جن اجنبیوں کو آپؐ خوش خبری دے رہے ہیں وہ کون ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

اناس صالحون فی اناس سوء کثیر من یعصیهم اکثر ممن یطیعهم[۱]

کچھ تھوڑے سے نیکو کار لوگ، بہت سے برے انسانوں کے انبوہ میں۔ ان کی نافرمانی کرنے والے ان کی اطاعت کرنے والوں سے زیادہ ہوں گے۔

یعنی یہ وہ اللہ کے نیک بندے ہیں جو تاریکی میں روشنی کا چراغ جلاتے ہیں اور جن کے ہاتھوں دنیا میں اصلاح کا کام انجام پاتا ہے۔ یہ باطل کے غلبے سے ہراساں نہیں ہوتے، بلکہ اس کی جگہ حق کو غالب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ ان کو پیغمبروں کا جانشین کہیں تو غلط نہ ہوگا، کیوں کہ ان کے کام کی نوعیت ٹھیک وہی ہوتی ہے جو پیغمبروں کے کام کی ہوتی ہے۔ ان کے ذریعے بگڑے ہوئے انسانوں کو اسی طرح راہِ ہدایت ملتی ہے جس طرح پیغمبروں کے ذریعے ملتی ہے۔ اسی وجہ سے بعض احادیث میں غرباء (دین کی راہ میں اجنبی ہونے والے) کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے:

الذین یصلحون اذا افسد الناس[۲]

اصلاح کا کام کرنے والے جب کہ لوگ بگاڑ پیدا کردیں۔

رسولِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ مصلحین اپنے ماحول میں اجنبی ہوں گے، لوگوں کے لیے ان کے نظریات میں کوئی کشش نہ ہوگی، ان کی باتیں دنیا کو نرالی معلوم ہوں گی اور ان کے اعمال اور طور وطریق نامانوس لگیں گے، ان کی راہ تنہائی کی راہ ہوگی اور ان کا کوئی ہم دم و ہم ساز نہیں ہوگا، لیکن اس کے باوجود وہ زندگی کے آخری لمحوں تک

---

۱ مسند احمد: ۲/ ۱۷۷

۲ ایضاً: ۵/ ۲۵

اپنا سفر جاری رکھیں گے اور یہی ان کی سب سے بڑی کامیابی ہوگی۔

علاّمہ ابن اثیر حدیثِ بالا کی شرح میں فرماتے ہیں:

انه (ای اسلام) کان فی اول امره کا لغریب الوحید الذی لاَ اهل له عنده لقلة المسلمین یومئذ و سیعود غریبا کما کان ای یقلّ المسلمون فی اٰخر الزمان فیصیرون کا لغرباء فطوبیٰ للغرباء ای الجنة لِاُولئک المسلمین الذین کانوا فی اول الاسلام و یکونون فی اٰخره وانما خصّهم بها لصبرهم علی اذی الکفار اولاً و آخرًا و لزومهم دین الاسلام[1]

اسلام اپنے آغاز میں مسلمانوں کی قلت کی وجہ سے اس تنہا اجنبی کی مانند تھا جس کے پاس اس کے گھر کے لوگ نہ ہوں اور پھر وہ اجنبی ہوجائے گا جیسا کہ پہلے تھا، یعنی آخر زمانے میں مسلمان اقلیت میں ہو جائیں گے اور اس طرح (اکثریت کے درمیان) اجنبی بن جائیں گے۔ 'پس خوش خبری ہے اجنبیوں کے لیے' یعنی جنت ہے ان مسلمانوں کے لیے جو اسلام کے دورِ آغاز میں تھے اور اس کے دورِ آخر میں ہوں گے۔ خصوصیت سے انھیں جنت کی بشارت دینے کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے دورِ اول اور دورِ آخر میں کفار کی ایذا رسانیوں پر صبر کیا اور دینِ اسلام کو پکڑے رہے۔

دین کے ان 'اجنبی' مسافروں کو وہ تمام مشکلات پیش آئیں گی جو حق کے ہر راہی کو عموماً پیش آتی ہیں۔ ان کو ستایا جائے گا، ان پر طعن و تشنیع کے تیر برسائے جائیں گے، ان کی آسائش و راحت چھن جائے گی، ان کے حق میں چمن کے پھول کانٹوں میں تبدیل ہونے لگیں گے، حتیٰ کہ زندگی بھر کے دوست ان کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہ ہوں گے اور خونی رشتہ دار دشمنِ جاں بن جائیں گے، ان کے لیے خدا کی زمین تنگ ہونے لگے گی اور وہ اپنے وطن میں غریب الدیار ہوجائیں گے، بلکہ ہوسکتا ہے کہ ان کو مظلومیت کے عالم میں گھر بار تک چھوڑنا پڑے۔ چناں چہ ایک حدیث میں 'غرباء' کی تشریح ان الفاظ میں بھی کی گئی ہے:

---

[1] النہایة فی غریب الحدیث: ۳/۵۲، مادہ 'غرب'

النّزاع من القبائل[1] قبیلوں سے نکل جانے والے۔

محدثین نے لکھا ہے کہ اس سے مراد 'مہاجرین' ہیں۔ اس ایک لفظ سے اجنبیت اور مظلومیت کی تصویر پوری طرح سامنے آجاتی ہے۔ اس سے آپ تصور کرسکتے ہیں کہ وہ کتنی کٹھن راہ تھی جس سے حق کے پہلے مسافر گزرے تھے اور جس سے بعد والوں کو گزرنا پڑے گا۔

دین کی اجنبیت اس کے ماننے والوں میں

دین کی غربت کی ایک شکل یہ بھی ہوسکتی ہے کہ خود دین کے ماننے والے بے دینی کا شکار ہوجائیں، باطل کے سیلاب میں وہ اس طرح بہہ جائیں جس طرح منکرینِ خدا بہہ جاتے ہیں، ان میں وہ ایمانی قوت باقی نہ رہے جو فتنوں کے مقابلے میں مردِ مومن کو ثابت قدم رکھتی ہے، ان کے اندر ایسے اصحابِ فکر کم سے کم تر ہوجائیں جو دین کی روشنی میں اپنے مسائل پر غور کرتے ہیں اور ایسے اصحابِ عمل کی تعداد گھٹ جائے جو اپنے ہر اقدام سے پہلے دین کا نقطۂ نظر معلوم کریں اور اس کے مطابق اپنی راہ متعین کریں۔ بالفاظِ دیگر دین کا نام لینے والے تو اکثریت میں ہوں، لیکن صحیح دینی فکر کے حامل اور دین کی راہ پر چلنے والے اقلیت میں رہ جائیں۔ ظاہر ہے، ان حالات میں خود دین کے ماننے والوں کے درمیان ہی دین کے حقیقی خادموں اور اس کے سچے وفاداروں پر اجنبیت کا عالم چھا جائے گا، لیکن اللہ اور اس کے رسولؐ کے نزدیک یہ اجنبیت بہت ہی مبارک اجنبیت ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے ارشادات میں اس اجنبیت کا بھی بیان موجود ہے۔ آپؐ سے لوگوں نے پوچھا کہ غرباء سے مراد کون ہیں؟ آپؐ نے جواب دیا:

الذین یزیدون اذانقص الناس[2] وہ (فکر و عمل میں) زیادہ ہوں گے، جب کہ لوگ (اس پہلو سے) کم ہوں گے۔

---

[1] مسند احمد: ۱/ ۶۵۸۔ ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب بدء الاسلام غریباً

[2] رواہ احمد (مدارج السالکین: ۳/ ۱۲۲)

مطلب یہ کہ غرباء وہ ہیں جو تقویٰ و خدا پرستی میں اس وقت آگے ہوں گے جب کہ دوسرے لوگ اس میں پیچھے ہوں گے۔

اس سے آگے آپؐ یہ بھی فرماتے ہیں کہ وہ نہ صرف خود صلاح یافتہ ہوں گے، بلکہ اصلاحِ امت کا فرض بھی انجام دیں گے۔

الذین یصلحون ماافسد الناس من سنتی[1] — وہ افراد جو اس بگاڑ کی اصلاح کریں گے جسے لوگ میری سنت میں پیدا کر چکے ہوں گے۔

یہی روایت ان الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے:

الذین یحیون سنتی و یعلّمونھا الناس[2] — وہ افراد جو میری سنت کو زندہ کریں گے اور لوگوں کو اس کی تعلیم دیں گے۔

بعض محدثین نے حدیث کی تشریح اسی پہلو سے کی ہے۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں:

اما انه ما یذھب اھل الاِسلام و لکن یذھب اھل السنة حتی ما یبقیٰ فی البلد منھم الاّ رجل واحد[3] — بے شک اسلام کے نام لیوا نہیں ختم ہو جائیں گے، بلکہ سنت کی پیروی کرنے والے باقی نہیں رہیں گے، یہاں تک کہ پورے شہر میں سنت کی پیروی کرنے والا صرف ایک ہی شخص رہ جائے گا۔

امام ابن قیمؒ حدیث 'بدء الاسلام غریباً' کے ذیل میں اپنے دور کا حال بیان کرتے ہیں کہ امت کے اندر بگاڑ اور طریقۂ سنت سے انحراف عام ہے، ہر طرف بدعتیں اور خلاف شرع امور دیکھے جاتے ہیں، سماج پر گم راہ فرقے چھائے ہوئے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں رسول اللہ ﷺ کے طریقہ پر عمل کرنے والے اجنبی بن کر رہ گئے ہیں۔ فرماتے ہیں:

---

1. ترمذی، کتاب الایمان، باب ماجاء ان الاسلام بدء غریباً وسیعو د غریباً
2. مدارج السالکین: ۳/۱۱۲
3. کشف الکربۃ فی وصف حال اہل الغربۃ، ابن رجب حنبلی، ص ۱۰

''اہلِ اسلام عام لوگوں میں، اہلِ ایمان اسلام لانے والوں میں، اہلِ علم ایمان والوں میں اور سنت اور خواہشات و بدعات کے درمیان تمیز کر سکنے والے اہلِ سنت بدعتیوں میں اجنبی ہیں اور سنت کی طرف بلانے والے اور مخالفین کی ایذا رسانیوں پر صبر کرنے والے تو ان سب سے زیادہ اجنبی ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہی اہل اللہ ہیں۔ ان کے لیے حقیقت میں کوئی اجنبیت نہیں ہے۔ ان کی اجنبیت اس اکثریت کے درمیان ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ 'اگر تم ان میں سے بیش تر کی جو زمین میں ہیں اتباع کرو گے تو وہ تم کو اللہ کے راستے سے پھیر دیں گے۔' گو یہ لوگ اکثریت میں ہیں، لیکن اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کے دین سے اجنبی ہیں اور ان کی اجنبیت زیادہ وحشت انگیز ہے، خواہ وہ کتنے ہی معروف و مشہور کیوں نہ ہوں اور لوگ ان کی طرف عقیدت سے اشارے ہی کیوں نہ کرتے ہوں۔''

چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں:

... ایک اجنبیت تو وہ ہے جو اللہ والوں اور اس کے رسولؐ کی سنت کی اتباع کرنے والوں کو مخلوق کے درمیان ہوتی ہے۔ یہ اجنبیت جن انسانوں کو لاحق ہو، رسول اکرمؐ نے ان کی تعریف کی ہے... یہ اجنبیت (ضروری نہیں کہ پورے عالم پر چھا جائے، بلکہ یہ) کسی جگہ ہوسکتی ہے اور کسی جگہ نہیں بھی ہوسکتی، کسی خاص وقت میں ہوسکتی ہے اور کسی وقت میں نہیں بھی ہوسکتی اور کسی قوم میں ہوسکتی ہے اور کسی قوم میں نہیں بھی ہوسکتی۔ لیکن بہرحال یہ لوگ وہ اجنبی ہیں جو قطعی طور پر اللہ والے ہیں، کیوں کہ انھوں نے اللہ کے سوا کسی کے دامن میں پناہ نہیں لی اور اس کے رسولؐ کے سوا کسی دوسرے کی طرف نہ تو اپنا انتساب کیا اور نہ تعلیمات رسولؐ کے سوا کسی دوسری تعلیم کی طرف دنیا کو دعوت دی۔''

اسی بحث میں آگے چل کر فرماتے ہیں:

''وہ صحیح اسلام، جس پر محمد ﷺ اور آپؐ کے اصحابؓ قائم تھے، آج اپنے زمانۂ آغاز سے زیادہ اجنبی ہے، گو کہ اس کی نشانیاں اور ظاہری رسوم معروف و

مشہور ہیں۔ حقیقی اسلام انتہائی نامانوس اور اس پر عمل کرنے والے بے حد اجنبی ہیں۔ خیال کرو کہ ایک جماعت کیسے مختصر اور اجنبی نہ ہوگی ایسے بہتر (۷۲) فرقوں[۱] کے درمیان جو اپنے متبعین بھی رکھتے ہیں اور جن کے پاس ریاست، منصب اور اقتدار بھی ہے۔ ان لوگوں کی ساری گرم بازاری عبارت ہے تعلیماتِ رسولؐ کی مخالفت سے، کیوں کہ آپؐ کی تعلیمات ٹکراتی ہیں ان کی خواہشات سے، ان کی لذتوں سے، دین کے بارے میں ان کے ان شکوک وشبہات سے جو ان کے علم وفضیلت کی آخری حد ہیں، اور ان کی خواہشاتِ نفس سے جو ان کے مقاصد اور ارادوں کی غایت ہیں۔ لہٰذا وہ مومن جو اتباعِ رسول ﷺ کی راہ سے اللہ کی طرف چل رہا ہو وہ ایسے لوگوں کے درمیان کیوں نہ اجنبی ہوگا جو اپنی خواہشات کے غلام اور حرص و ہوا کے تابع ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی رائے پر نازاں ہے۔"

اسی سلسلے میں فرماتے ہیں:

"وہ مومن، جسے اللہ نے اپنے دین کی بصیرت، اپنے رسولؐ کی سنت کی سوجھ بوجھ اور اپنی کتاب کا فہم عطا کیا ہے اور ساتھ ہی اسے یہ بھی دکھا دیا ہے کہ لوگ کن خواہشوں، بدعتوں اور گم راہیوں میں گرفتار ہیں اور کس طرح وہ اس صراطِ مستقیم سے بھٹک گئے ہیں جس پر رسول ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ گام زن تھے، اگر وہ اس راہِ راست پر چلنا چاہے تو اسے جاہلوں اور اہل بدعت کی مذمت پر، ان کی طعن و تشنیع پر، ان کی تحقیر وعیب چینی پر صبر کرنا ہوگا۔ وہ لوگوں کو اس سے نفرت دلائیں گے اور اس سے خوف زدہ کریں گے، ان کا سلوک اس کے ساتھ ٹھیک اسی طرح کا ہوگا جس طرح کا سلوک کفار اس کے مقتدا اور امام (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ کرتے تھے۔ اگر وہ ان کو صراطِ مستقیم کی طرف دعوت دے اور ان کی روش پر تنقید کرے تو ان کے

---

[۱] اشارہ ہے اس حدیث کی طرف جس میں رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ بنو اسرائیل بہتر (۷۲) فرقوں میں بٹ گئے اور میری امت تہتر (۷۳) فرقوں میں بٹ جائے گی۔ یہ سب کے سب جہنم میں جائیں گے سوائے ایک جماعت کے، جو میرے اور میرے ساتھیوں کے راستے پر چلے گی۔ (ترمذی)

درمیان قیامت برپا ہوجائے گی، وہ اس کے ساتھ ہر طرح کے مکر کریں گے، اس کے لیے دھوکے کے جال بچھائیں گے اور اپنی فوج لے کر اس پر دوڑ پڑیں گے۔ وہ ان کے درمیان اپنے دین میں اجنبی ہوگا، کیوں کہ ان کا دین بگڑ چکا ہوگا۔ وہ اپنی اتباعِ سنت میں اجنبی ہوگا، کیوں کہ وہ بدعتوں سے چمٹے ہوئے ہوں گے۔ وہ اپنے صحیح عقیدے میں اجنبی ہوگا، کیوں کہ ان کے عقائد غلط اور باطل ہوں گے، وہ اپنی نمازوں میں اجنبی ہوگا کیوں کہ ان کی نمازیں فاسد ہوں گی۔ وہ اپنے طریقے میں اجنبی ہوگا، کیوں کہ وہ غلط راہوں پر چل رہے ہوں گے۔ وہ اپنے عقل میں اجنبی ہوگا، کیوں کہ وہ اللہ کے رسولؐ کی طرف منسوب ہوگا اور وہ اپنے جھوٹے راہ نماؤں کی طرف منسوب ہوں گے۔ وہ اپنی معاشرت میں اجنبی ہوگا، کیوں کہ وہ ان کی خواہشات کے خلاف ان سے سلوک کرے گا۔ مختصر یہ کہ وہ اپنی دنیا و آخرت کے تمام معاملات میں بالکل منفرد اور بے گانہ ہوگا اور اپنا کوئی مددگار اور معاون نہ پائے گا۔ وہ جاہلوں کے درمیان عالم، اہل بدعت کے درمیان متبعِ سنت اور خواہشوں اور بدعتوں کی طرف بلانے والوں کے درمیان خدا اور اس کے رسول کی طرف بلانے والا ہوگا۔ وہ ایسے لوگوں کے درمیان امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض انجام دینے والا ہوگا جن کے نزدیک معروف منکر اور منکر معروف بن چکا ہوگا۔"[1]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ دین کی غربت اور اجنبیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ماننے والوں ہی کے درمیان بے گانہ ہوکر رہ جائے اور رسولِ اکرم ﷺ نے امت کو جو راستہ دکھایا تھا اس سے وہ بھٹک جائے۔ ان حالات میں جو لوگ آپؐ کی سنت پر قائم رہنے اور اسے زندہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یقیناً وہ بہت ہی خوش قسمت ہیں۔ لیکن یہاں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ سنت سے آپؐ کے زندگی کا کوئی خاص پہلو مراد نہیں ہے، بلکہ وہ پورا طریقۂ حیات مراد ہے جس پر آپؐ چل رہے تھے۔ بالفاظِ دیگر

---

[1] مدارج السالکین: ۳/ ۱۱۲-۱۱۷

جس نظامِ عقائد و اعمال کی طرف آپؐ نے دنیا کو دعوت دی ہے، سنت کا لفظ اس پورے نظام کا ترجمان ہے۔ آدمی صحیح معنوں میں متبع سنت اسی وقت ہوگا جب کہ وہ اس پورے نظام کی اتباع کرے۔ اس میں عقیدہ بھی شامل ہے اور عمل بھی۔ آپؐ کی تعلیمات پر ایمان ہو تو اس طرح ہو کہ وہ شکوک و شبہات سے یکسر پاک ہو اور ان پر عمل ہو تو اس طرح ہو کہ کہیں نفسانی خواہشات کی آمیزش نہ ہونے پائے۔ ابن رجب حنبلی کہتے ہیں:

اما السنة الکاملة فھی الطریقة السالمة من الشبھات و الشھوات کما قال الحسن و یونس بن عبید وسفیان و الفضیل وغیر ھم[1]

سنت کاملہ اس راستے کا نام ہے جو (عقائد میں) شبہات سے اور (عمل میں) خواہشات کی دراندازی سے محفوظ ہو، جیسا کہ حضرت حسن بصریؒ، یونس بن عبید، سفیان ثوریؒ، فضیل بن عیاضؒ وغیرہم نے کہا ہے۔

دورِ فتن میں اتباعِ سنت کا حکم

دین کی غربت اور اجنبیت کے دور کو حدیثوں میں دورِ فتن بھی کہا گیا ہے، کیوں کہ یہ انسان کے فکر و عمل کی آزمائش کا دور ہوتا ہے۔ اس میں ایسے زبردست فتنے ابھرتے ہیں کہ بعض اوقات بڑے باہمت اور مخلص اشخاص بھی ان سے پوری طرح محفوظ نہیں رہ پاتے۔ وہ آندھی اور طوفان کی طرح اٹھتے ہیں اور عقائد و اعمال کی عمارت کو متزلزل کر دیتے ہیں۔ اس امت پر بارہا دورِ فتن آتے اور اس کے دین و ایمان کو آزماتے رہے ہیں۔ آج بھی وہ ایک دورِ فتن سے گزر رہی ہے، جس میں الحاد و دہریت نے اس کے نظریات و افکار، اخلاق و عبادات، تہذیب و معاشرت اور تمدن و سیاست کو امتحان میں ڈال رکھا ہے۔ اس امتحان میں کامیابی کا طریقہ پہلے بھی یہی تھا اور آج بھی یہی ہے کہ انسان اس راستے پر مضبوطی سے جما رہے جس پر محمد عربی ﷺ اور آپؐ کے ساتھیوں کے نقوش پا ثبت ہیں۔ آپ ﷺ نے ایک مرتبہ خطبہ دیا۔ اس کا ایک فقرہ یہ تھا:

---

[1] کشف الکربة فی وصف حال اہل الغربة، ص ۱۲

من یعش منکم بعدی فسیری اختلافا کثیرا فعلیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین المھدیین تمسکو بھا و عضوا علیھا بالنواجذ وایاکم ومحدثات الأمور فان کل محدثة بدعة وکل بدعة ضلالة[1]	تم میں سے جو شخص میرے بعد زندہ رہے گا وہ بڑا اختلاف دیکھے گا۔ تو تم اس وقت میری سنت اور صاحب رشد و ہدایت خلفاء کی سنت کی پیروی کو اپنے اوپر لازم رکھنا، اس پر مضبوطی سے جمے رہنا اور اسے دانتوں سے پکڑ لینا اور (دین میں پیدا کی جانے والی) نئی باتوں سے دور رہنا، کیوں کہ (دین میں) نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گم راہی ہے۔

رسولِ اکرم ﷺ نے دورِ فتن میں بدعت سے بچنے، سنت پر قائم رہنے اور اسے زندہ کرنے کی بڑی فضیلت بیان کی ہے۔ ہم یہاں صرف دو روایتیں نقل کرتے ہیں، جو اپنے مضمون میں بہت ہی واضح ہیں:

من أحیی سنة من سنتی قد امیتت بعدی فان له من الأجر مثل اجر من عمل بھا من الناس لاَ ینقص من اجور الناس شیئا[2]	جس نے میری سنتوں میں سے کسی ایسی سنت کو زندہ کیا جو میرے بعد مرچکی ہو، تو اس کو ان سب لوگوں کے اجر کے برابر اجر ملے گا جو اس پر عمل کریں گے، بغیر اس کے کہ ان لوگوں کے اجر میں کوئی کمی کی جائے۔
المتمسک بسنتی عند فساد امتی له اجر شھید[3]	میری اُمت کے بگاڑ کے وقت میری سنت کے تھامنے والے کو ایک شہید کا ثواب ہے۔

---

۱ رواہ احمد وابوداؤد الترمذی وابن ماجہ (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الایمان، باب فی الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

۲ ابن ماجہ، مقدمہ، باب امن احیی سنۃ قدامیتت، ترمذی، کتاب العلم، باب الاخذ بالسنۃ واجتناب البدعۃ۔ اس حدیث کے ایک راوی کثیر بن عبد اللہ کو محدثین نے متروک الحدیث قرار دیا ہے۔ حافظ منذری کہتے ہیں: ولکن للحدیث شواھد، یعنی حدیث کی تائید میں دوسری روایتیں موجود ہیں (الترغیب والترہیب: ۱/ ۴۷)

۳ رواہ الطبرانی۔ اس روایت کی سند کے بارے میں حافظ منذری کہتے ہیں: لاباس بہ (الترغیب والترہیب جلد: ۱/ ۴۱) لیکن علامہ مناوی نے لکھا ہے، اسنادہ حسن (التیسیر بشرح الجامع الصغیر: ۲/ ۴۵۴)

یہی روایت ان الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے:

من تمسک بسنتی عند فساد امتی فله اجر مائة شهيد[1]	جو شخص میری امت کے بگاڑ کے زمانے میں میری سنت پر جما رہے اسے سو شہیدوں کا ثواب ہے۔

ان روایتوں سے جہاں اتباعِ سنت کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے وہاں اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ احادیث میں بدعت کی شدید مذمت کیوں کی گئی ہے اور اسے ضلالت اور گم راہی کیوں قرار دیا گیا ہے۔ بدعت دراصل دین کی تحریف اور اس کے بگاڑ کا دوسرا نام ہے، اس لیے زندگی کے جس گوشے میں بھی بدعت راہ پائے گی اس سے سنت مٹ جائے گی، یعنی اصل دین ختم ہو جائے گا۔

غضیف بن حارث ثمالی کہتے ہیں:

ان النبی صلی الله علیه وسلم قال ما احدث قوم بدعة الارفع مثلها من السنة فتمسک بسنة خير من احداث بدعة[2]	نبیؐ نے فرمایا کہ جب کوئی قوم کسی بدعت کو ایجاد کرتی ہے تو اس جیسی سنت (اس قوم کے درمیان سے) اٹھا لی جاتی ہے۔ لہٰذا سنت کو مضبوطی سے پکڑے رہنا بدعت کے ایجاد کرنے سے بہتر ہے۔

عبداللہ بن دیلمی[3] کہتے ہیں:

بلغنی ان اول ذهاب الدین ترک السنة یذهب الدین سنة کما یذهب الحبل قوة قوة[4]	مجھے یہ بات (حضور اکرم ﷺ سے) پہنچی ہے کہ دین کے مٹنے کا آغاز سنت کو چھوڑنے سے ہوگا۔ دین اس طرح مٹے گا کہ ایک ایک سنت ختم ہوتی چلی جائے گی جیسے رسی کا ایک ایک بل نکل جاتا ہے اور وہ بکھر جاتی ہے۔

اسی وجہ سے ایک روایت میں کہا گیا ہے کہ:

---

1. رواہ البیہقی (الترغیب والترہیب:۱/۴۱) اس حدیث کے ایک راوی حسن بن قتیبہ کو محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ لسان المیزان: ۲/۲۴۶
2. مسند احمد: ۴/۷۶
3. تابعی ہیں۔ بعض لوگوں نے صحابہ میں شمار کیا ہے۔ تہذیب التہذیب: ۵/۳۵۸
4. دارمی، مقدمہ، باب اتباع السنۃ

من وقّرصاحب بدعة فقد اعان علی ھدم الاسلام[1]	جس شخص نے بدعتی کی تعظیم کی اس نے اسلام کے ڈھانے میں مدد دی۔

'سنت' کی راہ جس طرح دین کے آغاز میں اجنبی تھی اسی طرح آج بھی اجنبی ہے، لیکن منزل ان ہی کی ہے جو ہر بدعت کو مٹانے اور سنت کی راہ پر چلنے کا عزم و حوصلہ رکھتے ہیں۔ امام زہریؒ فرماتے ہیں:

کان من مضی من علمائنا یقولون الاِعتصام بالسنة نجاة[2]	ہمارے پچھلے علماء کہا کرتے تھے کہ سنت کو پکڑے رہنے ہی میں نجات ہے۔

فتنوں کا مقابلہ کرنا امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہے

اتباعِ سنت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا جو دین محمد ﷺ نے پیش کیا ہے، انسان ہر حال میں اس پر قائم رہے۔ اس کی طرف دنیا کو دعوت دینے اور اسے قائم و غالب کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے اور ان فتنوں اور باطل تحریکوں کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرتا رہے جو اس دین کے خلاف اٹھیں۔ یہ وسیع جدوجہد امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور اس کے تقاضوں کی تکمیل ہے۔ یہ کام امت میں ہمیشہ ہوتا رہا ہے اور رسولِ اکرم ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی ہے کہ امت کے دورِ آخر میں بھی ایسے لوگ موجود ہوں گے جو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا یہ فرض انجام دیں گے اور دین کے خلاف اٹھنے والے فتنوں کا مقابلہ کریں گے۔

سیکون فی اٰخر ھٰذہ الاُمة قوم لھم مثل اجر اولھم یامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر و یقاتلون الفتن[3]	اس امت کے آخر میں ایسے لوگ ہوں گے جن کو اس کے اگلوں کا سا اجر ملے گا۔ وہ معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے اور فتنوں کا مقابلہ کریں گے۔

---

[1] رواہ البیہقی فی شعب الایمان مرسلاً۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الایمان، باب فی الاعتصام بالکتاب والسنة

[2] دارمی، مقدمہ، باب اتباع السنة

[3] رواہ البیہقی (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الفتن، باب ثواب ھذہ الامة)

یہی بات آپؐ نے ان الفاظ میں بھی کہی ہے:

ان من امتی قوما یعطون مثل اجور اولھم ینکرون المنکر[1]

میری امت کے کچھ (بعد کے) لوگوں کو ان کے اگلوں کے سے اجر دیے جائیں گے، کیوں کہ وہ برائی پر نکیر کریں گے۔

امت میں دین کے محافظین ہمیشہ رہیں گے

محمد ﷺ کے ذریعے دنیا کو آخری بار اللہ تعالیٰ کا دین ملا ہے۔ اس دین کو اللہ تعالیٰ قیامت تک باقی رکھنا چاہتا ہے، اس لیے وہ ہر دور میں اس کے محافظ پیدا کرتا رہا ہے اور آئندہ بھی پیدا کرتا رہے گا۔ محمد ﷺ فرماتے ہیں کہ اس دین کے ماننے والوں میں بہت سی دینی و اخلاقی خرابیاں پیدا ہوں گی اور وہ غلط کاری میں پچھلی امتوں کے نقشِ قدم پر چلیں گے، لیکن اس کے باوجود ان میں ایک گروہ ایسا ضرور موجود ہوگا جو دین کو اس کی صحیح شکل میں باقی رکھے گا۔ دین پر حملے خواہ اس کے ماننے والوں کی طرف سے ہوں یا اس کا انکار کرنے والوں کی طرف سے، وہ ان کا مقابلہ کرے گا اور دین کو بگاڑنے کی جو بھی کوششیں ہوں گی وہ ان کو ناکام بنا دے گا۔ اس کی زبان سچائی کی ترجمان ہوگی اور وہ باطل پرستوں کے مقابلے میں حق کا اظہار کرتا رہے گا۔ اس راہ میں نہ تو وہ پست ہمت ہوگا اور نہ کوئی اسے مرعوب کر سکے گا، وہ دین کی خاطر ہر محاذ پر لڑے گا اور بڑی سے بڑی قربانی دیتا رہے گا۔ جو کوئی اس گروہ کی حمایت میں نہیں کھڑا ہوگا وہ خود رسوا ہوگا اور جو ان کی مخالفت کرے گا وہ نامراد ہوگا۔

لاَ تزال طائفة من امتی قائمة بامر اللّٰہ لاَ یضرّھم من خذلھم او خالفھم حتی یأتی امر اللّٰہ و ھم ظاھرون علی الناس[2]

میری امت میں ایک ایسی جماعت برابر موجود رہے گی جو اللہ کے دین کی ذمہ داریاں اٹھانے والی ہوگی۔ جو اس کو چھوڑ دے گا یا اس کی مخالفت کرے گا وہ اس کو نقصان نہ پہنچا سکے گا، یہاں تک کہ قیامت آجائے گی اور حال یہ ہوگا کہ یہ جماعت لوگوں پر غالب ہوگی۔

---

[1] مسند احمد: ۵/ ۷

[2] مسلم، کتاب الامارۃ، باب قولہ لاتزال طائفۃ من امتی الخ

امام بخاریؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث میں جس جماعت کا ذکر ہے وہ اہلِ علم کی جماعت ہے[1] امام نووی نے اس حدیث کو زیادہ وسیع معنی میں لیا ہے۔ فرماتے ہیں:

یحتمل ان ھٰذہ الطائفة مفرقة بین انواع المومنین منھم شجعان مقاتلون ومنھم فقھاء و منھم محدثون و منھم زھّاد و اٰمرون بالمعروف و الناھون عن المنکر و منھم اھل انواع اخری من الخیر و الّا یلزم ان یکونوا مجتمعین بل قد یکون متفرقین فی اقطار الاُرض[2]

ممکن ہے کہ یہ جماعت اہلِ ایمان کے مختلف طبقات کے درمیان منقسم ہو، جن میں راہِ خدا میں لڑنے والے بہادر بھی ہوں، فقہاء بھی ہوں، محدثین بھی ہوں، زہّاد بھی ہوں، معروف کا حکم دینے والے اور منکر سے روکنے والے بھی ہوں، ان کے علاوہ دوسری بھلائیوں کے کرنے والے بھی ہوں۔ حدیث سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ وہ سب کے سب کسی ایک ہی خطے میں جمع ہوں، بلکہ وہ زمین کے مختلف حصوں میں بکھرے ہوئے بھی ہو سکتے ہیں۔

ایک دوسری حدیث میں رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

یحمل ھٰذا العلم من کل خلف عدولہ ینفون عنہ تحریف الغالین و انتحال المبطلین و تاویل الجاھلین[3]

ہر نسل کے بعد آنے والے عادل لوگ اس علم (دین) کے حامل ہوں گے، جو حد سے بڑھنے والوں کی تحریف کو، باطل پرستوں کے غلط دعوؤں کو اور جاہلوں کی تاویل کو دین سے دور کرتے رہیں گے۔

اسی کام کو آپؐ نے تجدید امت کا بھی نام دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰہ یبعث لھٰذہ الاُمة علٰی رأس کل مأة سنة من یجدد لھا دینھا[4]

اس امت کے لیے ہر صدی کے آخر میں اللہ تعالیٰ یقیناً ایسے اشخاص پیدا کرتا رہے گا جو اس کی بھلائی کے لیے اس کے دین کی تجدید کرتے رہیں گے۔

---

[1] بخاری، کتاب الاعتصام، باب قول النبی لاتزال طائفة من امتی...الخ
[2] شرح مسلم للنووی، المجلد الاول، الجزء ۲، ص ۱۴۳
[3] رواہ البیہقی (مشکوٰة المصابیح، کتاب العلم)
[4] ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب مایذکر فی القرن المأة۔ مستدرک حاکم: ۴/۵۲۲

امت کے اندر پیدا ہونے والے ان مجددین نے ایک طرف اللہ کے دین کو صحیح حالت میں باقی رکھا اور دوسری طرف اس امت کو بحیثیت مجموعی بگڑنے اور راہِ راست سے بھٹکنے سے بچایا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ محمد ﷺ سے پہلے دنیا میں جو پیغمبر آئے تھے ان میں سے بعض کی تعلیمات بالکل مٹ گئیں اور بعض کی تعلیمات میں خود ان کے ماننے والوں نے ایسی تحریف کردی کہ وہ حق و باطل کا مجموعہ بن کر رہ گئیں، لیکن محمد ﷺ نے دنیا کے سامنے جو دین پیش کیا، آج بھی وہ صحیح شکل میں پوری طرح محفوظ ہے اور اس کی ترجمانی کرنے والے بھی ہر جگہ موجود ہیں۔ جب بھی اس دین کے خلاف کسی فتنہ نے سر اٹھایا اس کو کچلنے کے لیے مردانِ کار سامنے آگئے اور اسے انھوں نے ختم کرنے کی سعی و جہد کی۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا یہ جذبہ اس دین کے ماننے والوں میں بعض اوقات کم زور تو پڑا ہے، لیکن کبھی ختم نہیں ہوا۔ اسی وجہ سے دین کو مٹانے یا بدلنے کی کوئی بھی کوشش کبھی کامیاب نہیں ہوئی۔ دین کے مخلص خادموں اور سچے ترجمانوں نے ہر تحریف، ہر جھوٹے دعوے اور ہر غلط تاویل کا مقابلہ کیا اور دین کی حفاظت کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دیتے رہے، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اس دین پر اندر اور باہر سے ایسے شدید حملے ہوتے رہے ہیں کہ اب تک وہ یا تو بالکل ختم ہو چکا ہوتا یا اس کی صورت اس قدر مسخ ہو چکی ہوتی کہ آج اس کا پہچاننا بھی مشکل ہوتا۔

ٹھیک یہی حال اس امت کا بھی ہے۔ جب بھی اس میں کوئی خرابی پیدا ہوتی ہے تو اس کی اصلاحی قوتیں ابھر آتی ہیں اور اس کو دور کر دیتی ہیں۔ چناں چہ چودہ سو سال کے طویل عرصے میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ یہ امت پوری کی پوری راہِ راست سے منحرف اور ضلالت اور گم راہی پر متفق ہوگئی ہو۔ رسولِ اکرم ﷺ نے پیش گوئی فرمائی تھی:

ان امتی لاَ تجتمع علی ضلالة[1] یقیناً میری امت گم راہی پر جمع نہ ہوگی۔

---

[1] ترمذی، ابواب الفتن، باب فی لزوم الجماعۃ۔ ابن ماجہ، ابواب الفتن، باب السواد الاعظم

یہ پیشین گوئی اب تک صحیح ثابت ہوتی رہی ہے اور یقین ہے کہ آئندہ بھی اس کی تصدیق ہی ہوتی رہے گی۔

امت کی اصلاح اور تجدیدِ دین پوری امت کا کام ہے

اس میں شک نہیں کہ اس امت کے اندر مجددین برابر پیدا ہوتے رہے ہیں اور نازک ترین حالات میں انھوں نے دین کی حفاظت اور امت کی اصلاح کا مشکل کام انجام دیا ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ امت کو بگاڑ سے بچانا اور اس کے اندر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کام کرنا ہر شخص کا فرض ہے یا یہ کسی خاص جماعت کے کرنے کا کام ہے؟ قرآن مجید نے اس سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا ہے:

وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ يُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○ (التوبۃ:۷۰)

مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب کے سب ایک دوسرے کے دوست ہیں، معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے منع کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں، جن پر اللہ ضرور رحم کرے گا۔ یقیناً اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور امت کی اصلاح کسی مخصوص طبقہ اور جماعت کی ذمے داری نہیں ہے، بلکہ یہ پوری امت کے کرنے کا کام ہے۔ قرآن ایمان والوں کو اس حال میں دیکھنا چاہتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو معروف کا حکم دے رہے ہوں اور منکر سے منع کر رہے ہوں۔ کیوں کہ یہی ان کی صحیح ترین حالت ہے۔ اگر یہ وصف کسی فرد میں نہیں ہے تو وہ مسلم معاشرے کا ایک نااہلِ فرد ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

فقد نعت المؤمنين بانهم يامرون بالمعروف و ينهون عن المنكر فالذى هجر الأمر بالمعروف و النهى عن المنكر خارج عن هؤلاء المومنين المنعوتين فى هٰذه الاٰية[1]

اللہ تعالیٰ نے (اس آیت میں) اہل ایمان کی یہ صفت بیان کی ہے کہ وہ معروف کا حکم دیتے اور منکر سے منع کرتے ہیں، پس جو شخص امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو ترک کردے وہ ان مومنین سے خارج ہے جن کا اس آیت میں ذکر ہے۔

علامہ عبد القادر عودہ شہیدؒ فرماتے ہیں:

ان جمهرة الفقهاء توجب الأمر بالمعروف والنهى عن المنكر على كافة افراد الامة لاعلى فئة معينة منها[2]

بیش تر فقہاء امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو امت کے کسی مخصوص گروہ پر نہیں، بلکہ اس کے سب ہی افراد پر واجب قرار دیتے ہیں۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور تواصی بالحق

امت کے اندر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا جو کام انجام دیا جاتا ہے اور جسے دراصل اصلاحِ امت کہنا چاہیے، اس کے لیے قرآن نے 'تواصی بالحق اور تواصی بالصبر' کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے اور ایمان و عملِ صالح کے بعد اسی کو قوموں اور ملتوں کی کام یابی کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے:

وَ الْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِی خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (العصر:۱-۳)

زمانہ گواہ ہے کہ انسان گھاٹے میں ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنھوں نے اچھے کام کیے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی۔

'حق' کے لفظ میں پورا دین شامل ہے اور 'صبر' کے معنی ہیں دین پر ثابت قدم

---

۱ احیاء علوم الدین: ۲/ ۳۳۴

۲ التشریع الجنائی الاسلامی: ۱/ ۴۹۵

رہنا۔ 'تواصی بالحق اور تواصی بالصبر' یہ ہے کہ دین پر عمل کرنے اور اس پر ثابت قدم رہنے کی ایک دوسرے کو تلقین کی جائے۔ امت مسلمہ کی اصلاح اور دین پر اس کے مضبوطی کے ساتھ جمے رہنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اندر 'تواصی بالحق اور تواصی بالصبر' کا یہ جذبہ ہمیشہ زندہ رہے، تاکہ پہلے تو کوئی بھی خرابی اس میں پیدا ہی نہ ہوسکے اور اگر پیدا ہوتو بڑھنے اور پھیلنے نہ پائے۔ جب تک امت کے اندر تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا یہ جذبہ موجود ہوگا اس کی اصلاح کی راہیں کھلی رہیں گی اور وہ بڑی سے بڑی غلطی کے بعد بھی سنبھل جائے گی، لیکن اگر یہ جذبہ ختم ہوجائے تو جو بگاڑ اس میں رونما ہوگا آہستہ آہستہ اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جائے گا اور اصلاحِ حال کی راہیں مسدود ہونے لگیں گی۔ ظاہر ہے، یہ چیز اس کو بالکل تباہ کرکے رکھ دے گی۔

اسلام معاشرے میں ایسی فضا پیدا کرنا چاہتا ہے کہ اس کے اندر 'خیر' کو نشو ونما ملتی رہے اور 'شر' کو پھیلنے کے مواقع حاصل نہ ہوں۔ آدمی نیکی کی طرف بڑھنے کا ارادہ کرے تو ہر قدم پر اسے یہ محسوس ہو کہ پورا معاشرہ اس کی پشت پر ہے اور اس کے ساتھ چل رہا ہے، اس کے برعکس جب وہ بدی کے راستے پر چلنا چاہے تو ماحول میں اجنبی بن جائے اور کوئی اس کا ساتھ دینے والا نہ رہے۔ 'معروف' پر عمل کرنا اس کے لیے آسان ہو اور منکر کے ارتکاب میں اسے سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے۔ اس کی ہدایت ہے کہ بر وتقویٰ کے معاملے میں تو آپس میں تعاون کیا جائے، لیکن جہاں اثم وعدوان کا سوال ہو وہاں دستِ تعاون کھینچ لیا جائے:

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدۃ:۲)	نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔

اس امت کے راہِ راست پر قائم رہنے کی تدبیر قرآن وحدیث میں یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اپنے افراد کا سخت احتساب کرتی رہے، نیکی کو پھلنے پھولنے کے مواقع اور

اسباب فراہم کرے اور بدی کو مٹانے کے لیے آخری حد تک اپنی قوت صرف کردے، امت میں نیکی سے محبت اور برائی سے نفرت اتنی سخت ہو کہ اس کا ایک فرد بھی غلط روی کی جرأت کرے تو دس افراد آگے بڑھ کر اسے روک دیں اور راہِ راست پر لے آئیں۔ کسی انسان کی مدد یہی نہیں ہے کہ نیکی میں اس کا تعاون کیا جائے، بلکہ یہ بھی اس کی مدد ہے کہ اسے بدی کے راستے پر بڑھنے نہ دیا جائے۔ اسی وجہ سے رسول اکرمؐ فرماتے ہیں:

انصر اخاک ظالماً او مظلومًا قال یا رسول اللّٰہ ھٰذا ننصرہ مظلوماً فکیف ننصرہ ظالما قال تاخذ فوق یدیہ[1]

اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ راوی نے کہا کہ اے اللہ کے رسولؐ جب وہ مظلوم ہوگا تو (یقیناً) ہم اس کی مدد کریں گے لیکن اگر وہ ظالم ہو تو ہم اس کی کیسے مدد کریں؟ آپؐ نے فرمایا کہ اس کا ہاتھ پکڑ لو (اور ظلم سے اسے روک دو)۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور نصیحت

امت کے درمیان 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کو قرآن و حدیث میں 'نصیحت' کے لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ لفظ اپنے اندر بہت وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ چناں چہ لغت کی رو سے اس کے معنی ہیں دھوکا نہ دینا، خلوص کے ساتھ پیش آنا، کسی چیز کو پاک صاف کرنا اور بنانا سنوارنا۔ ان معانی کے ذریعہ اس کی وسعت کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ علامہ ابن اثیر فرماتے ہیں: 'نصیحت' کا مفہوم کسی ایک لفظ سے ادا نہیں ہوسکتا۔ البتہ اس کو ایک جملے میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ "اس شخص کی بھلائی چاہنا جسے نصیحت کی جائے۔"[2] اس خیر خواہی میں ایمان کی دعوت، اخلاق کی اصلاح اور فکر و عمل کی تربیت سب ہی کچھ شامل ہے۔

خیر خواہی اور اصلاح کا یہ جذبہ اسلام اپنے تمام ماننے والوں کے اندر دیکھنا چاہتا ہے، تاکہ معاشرے کا ہر فرد دوسرے کی بھلائی چاہنے والا اور اس کی اصلاح کا

---

[1] بخاری، ابواب المظالم والقصاص، باب اعن اخاک ظالما او مظلوما

[2] النہایۃ فی غریب الحدیث والاثر: ۵/ ۶۲، ۶۳

طالب بن جائے۔ ایک طرف حاکم، محکوم کی اصلاح کی کوشش کرے تو دوسری طرف محکوم، حاکم کی خامیوں کی نشان دہی کرے، امیر غریب کی کم زوریوں کو دور کرے تو غریب امیر کی خرابیوں کو رفع کرے، صاحبِ علم عام آدمیوں کو جہالت اور نادانی سے بچائے تو عام آدمی بھی اصحابِ علم کو ان کی لغزشوں کی طرف توجہ دلائے۔ اس طرح پوری امت میں نصیحت اور خیر خواہی کی ایسی فضا پیدا ہوجائے کہ خود بخود اس کی اصلاح ہوتی رہے۔ کیوں کہ اس امت میں جو بگاڑ اور خرابی پیدا ہو اس کی اصلاح کی ذمے داری کسی دوسرے گروہ پر نہیں ہے، بلکہ خود اسی کو اپنی اصلاح کرنی ہے۔ اس کا ہر شخص دوسرے کا بھی خواہ اور خیر اندیش ہے۔ وہ جس طرح اپنے نفس کی اصلاح و تربیت کی فکر کرتا ہے اسی طرح اسے عام برادرانِ ملت کی اصلاح کی بھی فکر کرنی چاہیے۔ حضرت تمیم داری فرماتے ہیں:

ان النّبی صلّی اللّٰہ علیہ و سلّم قال: الدین النّصیحۃ، قلنا لمن؟ قال للّٰہ و لکتابہ و لرسولہ و لِائمۃ المسلمین و عامتھم[1]

نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دین اخلاص اور خیر خواہی کا نام ہے۔ ہم نے پوچھا: خیر خواہی اور اخلاص کس کے ساتھ؟ آپؐ نے جواب دیا: خدا کے ساتھ، اس کی کتاب کے ساتھ، اس کے رسولؐ کے ساتھ، مسلمانوں کے ائمہ اور مسلم عوام کے ساتھ۔

دین کو قبول کرنے کے نتیجے میں انسان کے اندر جو پاکیزہ جذبات ابھرتے ہیں اس حدیث میں ان کو بہترین انداز میں بیان کر دیا گیا ہے۔ حدیث میں جس خیرخواہی اور اخلاص کا ذکر ہے اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو یہ ہے کہ وہ آدمی کے ایمان وعقیدے اور اس کی ذاتی اصلاح و تربیت سے متعلق ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس میں دعوت و تبلیغ اور اصلاح و تربیت کے اس وسیع کام کو بیان کیا گیا ہے جو ایک مسلمان کو امت کے اندر اور باہر انجام دینا ہے۔ اس طرح یہ حدیث دین اور اس کے تمام مطالبات کو ایک خاص انداز میں ہمارے سامنے رکھ رہی ہے۔ اسی وجہ سے محدثین

---

[1] مسلم، کتاب الایمان، باب بیان ان الدین النصیحۃ

نے اس کو بڑی اہمیت دی ہے۔ امام نووی نے اپنے پیش رو علماء کی تشریحات کو سامنے رکھتے ہوئے اس حدیث کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہاں پیش کیا جارہا ہے:

> ''اللہ تعالیٰ کے سلسلے میں 'نصیحت' کا مفہوم یہ ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے، اس کی صفات میں تحریف نہ کی جائے، بلکہ ان کو جوں کا توں قبول کیا جائے۔ اس کو تمام صفات کمال سے متصف اور تمام نقائص سے پاک مانا جائے، ہر معاملے میں اسی کی اطاعت کی جائے اور اس کی نافرمانی سے اجتناب کیا جائے، کسی سے محبت بھی اسی کے لیے کی جائے اور نفرت بھی اسی کے لیے کی جائے، جو اس کا دوست ہو اسے اپنا دوست اور جو اس کا دشمن ہو اسے اپنا دشمن سمجھا جائے اور جو اس کا منکر اور باغی ہو، ضرورت پڑنے پر اس سے جہاد کیا جائے، اس کی نعمتوں کا دل سے اعتراف کیا جائے اور ان پر شکر بجا لایا جائے۔ اللہ کے بارے میں 'نصیحت' کے مفہوم میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اس کی جو صفات اوپر بیان ہوئی ہیں ان کی طرف لوگوں کو دعوت دی جائے اور ان کو نرمی اور لطف و محبت سے آمادہ کیا جائے تاکہ وہ ان کو مان لیں اور اس پر ایمان لے آئیں۔''
>
> اللہ کی کتاب کے ساتھ نصیحت اور خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ اس پر اس حیثیت سے ایمان رکھا جائے کہ وہ اس کا نازل کردہ کلام ہے اور ہر انسانی تحریر و تقریر سے بالکل مختلف اور ممتاز ہے۔ وہ ایسا کلام ہے کہ اس جیسے کلام پر کوئی بھی شخص قادر نہیں ہوسکتا۔ اللہ کی کتاب کے ساتھ یہ بھی خیر خواہی ہے کہ اس کی تعظیم کی جائے، خشوع و خضوع کے ساتھ اس کی تلاوت کی جائے، اس کے احکام سے واقفیت حاصل کی جائے، اس کے علوم و امثال کو سمجھا جائے، اس کے مواعظ سے نصیحت حاصل کی جائے، اس کے عجائبات میں تفکر کیا جائے، اس کے محکمات پر عمل کیا جائے اور اس کے متشابہت کو بے چون و چرا تسلیم کیا جائے اور اس کے تمام احکام اور ان کی قسموں کی تحقیق کی جائے نیز اس کے ساتھ خیر خواہی میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اس کے علوم کو پھیلایا جائے اور اس کی طرف دنیا کو دعوت دی جائے۔

اللہ کے رسولؐ کے ساتھ خیر خواہی میں یہ باتیں شامل ہیں: آپؐ کی رسالت کی تصدیق، آپؐ کی تعلیمات پر ایمان، آپؐ کے احکام کی اطاعت، آپؐ کی زندگی میں اور آپؐ کے وصال کے بعد آپؐ کی نصرت و حمایت، جو آپؐ کا دشمن ہو اس سے دشمنی اور جو آپؐ کا دوست ہو اس سے دوستی، آپؐ کی توقیر، آپؐ کے حقوق کی تعظیم، آپؐ کی سنت کا احیاء، آپؐ کی دعوت کی توسیع، آپؐ کی شریعت کی نشر و اشاعت، اس پر جو الزام لگایا جائے اسے دور کرنا، اس کے علوم کو پھیلانا، اس کے معنی میں غور وفکر کرنا، لوگوں کو اس کی طرف دعوت دینا، احتیاط اور سلیقہ سے اس کا سیکھنا اور سکھانا، بغیر علم کے اس بارے میں گفتگو سے پرہیز کرنا، حاملینِ شریعت کا ادب و احترام کرنا وغیرہ۔ اسی طرح یہ بھی آپؐ کے ساتھ خیر خواہی ہے کہ آپؐ کے اخلاق اپنے اندر پیدا کیے جائیں، آپؐ کے بتائے ہوئے آداب اختیار کیے جائیں، آپؐ کے اصحاب اور اہلِ بیت سے محبت کی جائے اور اصحابِ بدعت سے دوری اختیار کی جائے۔

ائمہ مسلمین کے ساتھ نصیحت اور خیر خواہی میں یہ باتیں شامل ہیں: حق میں ان کا تعاون اور اطاعت، نرمی اور بہ وقت ضرورت سختی کے ساتھ ان کو نصیحت، ان کی جھوٹی تعریف سے اجتناب، جن باتوں سے وہ غافل ہیں ان سے آگاہ کرنا، مسلمانوں کے جو معاملات ان تک نہیں پہنچ رہے ہیں انھیں ان تک پہنچانا، ان کے خلاف بغیر کسی معقول وجہ کے بغاوت نہ کرنا، لوگوں کو ان کی اطاعت پر ابھارنا وغیرہ۔ خطابی نے لکھا ہے کہ ائمہ مسلمین سے علماء دین بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ ان کے ساتھ خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ ان کے ساتھ حسن ظن رکھا جائے اور احکام شریعت میں ان کی اتباع کی جائے۔

عام مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی یہ ہے کہ جن امور میں دنیا و آخرت کی بھلائی ہے ان کی طرف ان کی رہ نمائی کی جائے، ان کی تکلیفوں کو دور کیا جائے، وہ دین و دنیا کی جن چیزوں سے ناواقف ہیں ان سے انھیں واقف کرایا جائے، ان کے عیوب کی پردہ پوشی کی جائے اور ان کی کم زوریوں کو دور کیا جائے، ان پر حسد نہ کیا جائے، ان کے لیے وہی چیز پسند کی جائے جو اپنے لیے پسند ہو اور جو چیز اپنے لیے ناپسند ہو وہ ان کے لیے بھی ناپسند کی

جائے، ان کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی جائے، ان کے اندر اعلیٰ اخلاق پیدا کیے جائیں اور ان کو اللہ کی اطاعت پر ابھارا جائے[1]

رسولِ اکرم ﷺ نے مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی کو اتنی اہمیت دی ہے کہ بعض اوقات صحابہؓ سے اس کے لیے آپؐ نے خصوصی عہد و پیمان لیا ہے۔ حضرت جریر بن عبد اللہؓ فرماتے ہیں:

بایعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی النصح لکل مسلم[2]

میں نے نبی ﷺ سے ہر مسلمان کے ساتھ خیر خواہی کے لیے بیعت کی ہے۔

اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اصلاحِ امت اور مسلمانوں کے ساتھ نصح و خیر خواہی کا فرض کس قدر غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کام کے خاص شرائط اور حدود و آداب ہیں اور اس کے سلسلے میں ذرائع و وسائل کا سوال بھی بہت اہم ہے، یعنی یہ کہ اصلاحِ امت کے لیے کون سے ذرائع استعمال کیے جا سکتے ہیں اور کن ذرائع کے استعمال کی اجازت نہیں ہے؟ ان تمام سوالات پر آئندہ تفصیل سے بحث ہوگی۔ گو کہ یہ بحث اصلاً اصلاحِ امت سے متعلق ہوگی، لیکن اس کی روشنی میں امید ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے وسیع کام کے شرائط، حدود و آداب اور ذرائع و وسائل کا بھی واضح تصور سامنے آسکے گا۔

---

۱ شرح مسلم، المجلد الاول، الجزء ۲، ص ۳۳-۳۵

۲ مسلم، کتاب الایمان، باب بیان ان الدین النصیحۃ

☆☆

شرائط، وسائل و ذرائع اور حدود و آداب

شرائط

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا انجام دینا کسی خاص وقت، کسی خاص ماحول اور کسی خاص دور ہی میں ضروری نہیں ہے، بلکہ اس کی نوعیت ایسی ہے کہ کسی بھی وقت اس سے غفلت نہیں برتی جاسکتی۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

عموم الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر تقتضي الوجوب بكل حال[۱]	امر بالمعروف و نہی عن المنکر (سے متعلق آیات و احادیث) کا عموم ہر حال میں اس کے واجب ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی کچھ شرائط ہیں۔ ان شرائط میں سے بعض پر فقہاء کا اتفاق ہے اور بعض کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام غزالیؒ نے اس طرح کی کل پانچ شرطیں بیان کی ہیں۔ تکلیف (آدمی کا شرعی طور پر مکلّف ہونا)، ایمان، عدالت (نیکی اور تقویٰ)، حکومت یا اس کی

---

[۱] احیاء علوم الدین: ۳۴۸/۲

[۲] امام غزالیؒ نے بطور شرط حکومت کا ذکر نہیں کیا ہے، بلکہ صرف حاکم وقت کی اجازت کا ذکر کیا ہے، لیکن ظاہر ہے جب حکومت کی اجازت سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر صحیح ہے تو خود حکومت کے لیے اس کے صحیح ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے۔ ویسے بعض لوگوں نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے حکومت کو بھی شرط قرار دیا ہے۔ تفصیل آگے آرہی ہے۔

[۳] احیاء علوم الدین، جلد ۲، ص ۲۷۴ تا ۲۸۴۔ یہ شرائط امام غزالیؒ نے احتساب کی بیان کی ہیں اور احتساب کے بارے میں فرماتے ہیں: (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اجازت[۲] اور قدرت۔[۳] ہم ان میں سے ایمان، عدالت، حکومت یا اس کی اجازت کو شرائطِ صحت اور تکلیف اور قدرت کو شرائطِ وجوب کہہ سکتے ہیں۔ کیوں کہ پہلی تین شرطیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ ان کے بغیر امر بالمعروف و نہی عن المنکر صحیح نہیں ہے اور بعد کی دو شرطیں بتاتی ہیں کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کن حالات میں واجب ہوتا ہے اور کن حالات میں اس کا وجوب ساقط ہو جاتا ہے؟ ان تمام شرائط پر آئندہ صفحات میں تفصیل سے بحث ہوگی تا کہ ان کی صحت وضعف کا حال معلوم ہو اور یہ دیکھا جاسکے کہ وہ کس حد تک قابلِ قبول ہیں؟ پہلے ہم شرائطِ صحت پر گفتگو کریں گے۔

(گزشتہ صفحہ کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں)

هي عبارة شاملة للامر بالمعروف والنهي عن المنكر (ص ۲۷۴)	وہ ایک ایسے کام سے عبارت ہے، جس میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہوتا ہے۔

علامہ ماوردی کہتے ہیں:

الحسبة هي امر بالمعروف اذا اظهر تركه و نهي عن المنكر اذا اظهر فعله (الأحكام السلطانية (ص ۲۳۱)	احتساب یہ ہے کہ معروف کا حکم دیا جائے جب کہ علانیہ اس کو ترک کردیا گیا ہو اور منکر سے منع کیا جائے جب کہ علانیہ اس کا ارتکاب ہو۔

اس میں شک نہیں کہ 'احتساب' میں معروف کا حکم دیا جاتا اور منکر سے منع کیا جاتا ہے، لیکن وہ کل 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' نہیں ہے، بلکہ محض اس کا ایک شعبہ ہے، کیوں کہ 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کی اصطلاح 'احتساب' سے زیادہ وسیع معنی و مفہوم رکھتی ہے۔ احتساب امت کی داخلی اصلاح کا عنوان ہے اور 'امر بالمعروف و نہی المنکر میں امت کی اصلاح کے ساتھ دعوت و تبلیغ اور جہاد و سیاست بھی شامل ہے۔ اس لیے احتساب کی شرائط اصلاً امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے وسیع کام کی شرائط نہیں ہیں، بلکہ صرف اصلاحِ امت کے کام کی شرائط ہیں۔ لیکن چوں کہ احتساب 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' ہی کا ایک جزء ہے، اس لیے تفصیلات سے قطع نظر جو شرائط احتساب کے لیے قابل قبول ہیں وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے وسیع کام کی بھی شرائط ہوسکتی ہیں۔

شرائطِ صحت

ایمان

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے پہلی شرط ایمان ہے۔ مومن ہی کا یہ کام ہے کہ معروف کا حکم دے اور منکر سے منع کرے۔ اس شرط کی وجہ امام غزالیؒ یہ بیان فرماتے ہیں:

هٰذا نصرةٌ للدين فكيف يكون من اهله من هو جاحد لأصل الدين[1]	یہ دین کی نصرت ہے۔ پس اس کام کا اہل وہ شخص کیسے ہوسکتا ہے جو اصل دین ہی کا منکر اور اس کی نافرمانی کرنے والا ہو۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر چوں کہ دین کی نصرت و حمایت کا عمل ہے، اس لیے فطری طور پر دین کو ماننے والے ہی اس کے اہل بھی ہیں اور ان ہی پر اس کی ذمے داری بھی عائد ہوتی ہے۔ رہے وہ لوگ جو دین پر ایمان ہی نہ رکھتے ہوں وہ اس کام کے لیے نہ تو موزوں ہیں اور نہ ان پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ علامہ عبد القادر عودہ شہید فرماتے ہیں کہ غیر مسلموں کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ذمے داری سے مستثنیٰ قرار دینا اسلام کی رواداری کی دلیل ہے۔ کیوں کہ:

"معروف و منکر میں پوری شریعت شامل ہے۔ اگر کسی غیر مسلم پر امر بالمعروف

---

[1] احیاء علوم الدین: ۲/ ۳۳۹

ونہی عن المنکر کو واجب قرار دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ لازماً وہی عقیدہ رکھے جو ایک مسلمان کا عقیدہ ہے اور وہی بات کہے جو ایک مسلمان کہتا یا کہہ سکتا ہے۔ ظاہر ہے، یہ 'اکراہ فی الدین' ہے، جس کی اسلام میں قطعاً اجازت نہیں ہے۔ حقیقت میں اس شرط کے ذریعے اسلامی ریاست کے غیر مسلموں کو اس بات کی مکمل آزادی دی گئی ہے کہ وہ جو عقیدہ چاہیں رکھیں اور جس عقیدے کو چاہیں ماننے سے انکار کردیں، ان پر کسی قسم کا جبر نہیں ہے[1]

عدالت

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لیے ضروری ہے کہ آدمی خود بھی معروف پر عمل کرے اور منکر سے باز رہے۔ جو شخص نہ تو معروف پر عمل کرے اور نہ منکر سے باز رہے، اس کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا حق نہیں ہے۔ کیوں کہ قرآن وحدیث میں ان لوگوں پر سخت تنقید کی گئی ہے جو دوسروں کو تو نیکیوں کی دعوت دیتے ہیں اور خود ان کا دامن نیکیوں سے خالی ہوتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ (البقرۃ:۴۴)

کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَاللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (الصف:۳۲)

اے وہ لوگو جو ایمان کا دعویٰ کرتے ہو، تم ایسی باتیں دوسروں سے کیوں کہتے ہو جن پر خود عمل نہیں کرتے۔ اللہ کو یہ بات سخت ناپسند ہے کہ تم کہو وہ جس پر خود عمل نہ کرو۔

اسی طرح احادیث میں واعظینِ بے عمل کی سخت مذمت کی گئی ہے۔ یہ تو نقلی دلائل ہیں۔ عقلی طور پر بھی کسی بے عمل کا دوسروں کو عمل کی تبلیغ کرنا درست نہیں ہے۔ کیوں کہ اصلاحِ نفس دوسروں کی اصلاح پر مقدم ہے۔ خود سیدھی راہ پر چلنا اور دین پر ثابت قدم رہنا اصل ہے اور دوسروں کو راہ دکھانا اور دین پر استقامت کی تبلیغ کرنا اس کی

---

[1] التشریع الجنائی الاسلامی: ۱/۴۹۷

فرع ہے۔ ظاہر ہے جب اصل ہی موجود نہ ہو تو فرع کا وجود کیسے ہوسکتا ہے؟ آدمی کا خود صلاح یافتہ ہونا اصل سرمایہ ہے اور دوسروں کی اصلاح کرنا اس کی زکوٰۃ ہے۔ اگر اصل سرمایہ موجود نہ ہو تو زکوٰۃ کس چیز کی ادا ہوگی۔

امام غزالیؒ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:

کل ما ذکروه خیالاَت و انما الحق ان للفاسق ان یحتسب و برهانه هو ان نقول: هل یشترط فی الاِحتساب ان یکون متعاطیه معصوماً عن المعاصی کلها؟ فان شرط ذلک فهو خرق للاجماع ثم حسم لباب الاِحتساب اذ لا عصمة للصحابة فضلا عمن دونهم[1]

جو کچھ ان لوگوں نے کہا وہ سب محض بے بنیاد خیالات ہیں اور صحیح بات یہ ہے کہ فاسق کو احتساب کا حق ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ہم پوچھتے ہیں کہ جو شخص احتساب کا فرض انجام دے کیا تمام گناہوں سے اس کا معصوم ہونا شرط ہے؟ اگر یہ شرط لگائی جائے تو یہ اجماعِ امت کی مخالفت ہوگی، مزید برآں یہ احتساب کے دروازے کو بند کرنا ہے، کیوں کہ اور لوگوں سے قطع نظر صحابہ بھی معصوم نہیں ہیں۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے جو لوگ تقویٰ اور نیکی کو شرط قرار دیتے ہیں ان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسے ہر چھوٹے بڑے گناہ سے پاک ہونا چاہیے، بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اس کے اندر کم سے کم موٹی موٹی نیکیاں موجود ہوں اور وہ کبائر سے بچا رہے۔ امام غزالیؒ اس پر بھی تنقید کرتے ہیں۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ جب ایک شرابی جہاد میں حصہ لے سکتا ہے اور لیتا رہا ہے اور ایک زانی قتل سے منع کرسکتا ہے تو یہ شرط فضول ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ گناہ سے خود باز رہنا ایک الگ چیز ہے اور دوسروں کو گناہ سے منع کرنا دوسری چیز۔ ان دونوں کو ایک ساتھ جوڑ دینا صحیح نہیں ہے۔ ایک شخص جو گناہ گار ہے وہ کہہ سکتا ہے:

یجب علیّ الاِنتهاء و النهی فمن این یلزمنی من العصیان باحدهما

گناہوں سے خود رُکنا اور دوسروں کو روکنا دونوں مجھ پر واجب ہیں۔ ان میں سے ایک کی

---

[1] احیاء علوم الدین: ۲/۲۴۰

ان اعصی اللّٰہ تعالٰی بالثانی، و اذا کان النھی واجبا علیّ فمن این یسقط وجوبه باقدامی[1]

نافرمانی سے مجھ پر یہ کہاں لازم آتا ہے کہ دوسرے معاملہ میں بھی خدا کی نافرمانی کروں۔ منکر سے منع کرنا جب مجھ پر واجب ہے تو اس کا وجوب منکر کے ارتکاب سے کیسے ساقط ہو جائے گا۔

امام غزالیؒ اس سلسلے میں اصولِ کلیہ کے طور پر فرماتے ہیں:

اصلاح الغیر لاَ یراد لِاصلاح النفس، و لاَ اصلاح النفس لاصلاح الغیر، فالقول بترتب احدھما علی الاُخرۃ تحکم[2]

دوسروں کی اصلاح اپنی اصلاح کے لیے نہیں چاہی جاتی اور نہ اپنی اصلاح دوسروں کی اصلاح کے لیے۔ اس لیے یہ کہنا کہ ان میں سے ایک دوسرے پر موقوف ہے محض بے دلیل دعویٰ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ایک مستقل فرض ہے اور اس کی ادائیگی کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ پہلے دوسرے فرائض پورے کر دیے جائیں تب اسے ادا کیا جائے۔ شریعت کا ہر فرض اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اگر اس کے ادا ہونے کا وقت آ گیا ہے تو لازماً اسے ادا کیا جائے، خواہ دوسرے فرائض ادا ہو رہے ہوں یا نہ ہو رہے ہوں۔ یہی بات علامہ ابوبکر جصاص نے ان الفاظ میں کہی ہے:

ان ترک الاِنسان لبعض الفروض لا یسقط عنه فروضا غیرہ، الا تری ان ترکه للصلوٰۃ لا یسقط عنه فرض الصوم و سائر العبادات، فکذالک من لم یفعل سائر المعروف ولم ینته سائر المناکیر فان فرض الاَمر بالمعروف و النھی عن المنکر غیر ساقط عنه[3]

انسان کا بعض فرائض کو چھوڑ دینا اس سے بعض دوسرے فرائض کو ساقط نہیں کر دیتا، دیکھو کہ اگر وہ نماز کو ترک کر دے تو اس کی وجہ سے روزہ اور دوسری عبادات اس سے ساقط نہیں ہو جاتیں، اسی طرح جو شخص تمام معروفات پر عمل نہ کرے اور تمام منکرات سے باز نہ رہے تو اس کی وجہ سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض اس سے ساقط نہیں ہو جائے گا۔

---

۱ احیاء علوم الدین: ۲/۳۴۰

۲ ایضاً

۳ احکام القرآن: ۲/۴۲

بے عمل انسانوں کی دوسروں پر تبلیغ کا مسئلہ ایک اور پہلو سے بھی قابلِ غور ہے۔ وہ یہ کہ دنیا ان انسانوں کی باتوں کو قبول کرتی ہے جو باعمل ہوتے ہیں اور جن کے کردار سے ان کے خیالات کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس کے برعکس غلط کار انسانوں کی تبلیغ بالعموم رائیگاں جاتی ہے اور اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اب فرض کیجیے کہ ایک بے کردار انسان کو کسی وقت اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ اس کا امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنا بے فائدہ ہوگا تو سوال یہ ہے کہ کیا اس صورت میں بھی اس کے لیے یہ فرض ہی رہے گا اور اس کے انجام نہ دینے پر وہ قابلِ مواخذہ قرار پائے گا؟ امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

من علم ان قولهٗ لاَ یقبل فی الحسبة لعلم الناس بفسقه فلیس علیه الحسبة بالوعظ اذ لا فائدة فی وعظه فالفسق یوثر فی اسقاط فائدة کلامه ثم اذا سقطت فائدة کلامه سقط وجوب الکلام[1]

جو شخص یہ جانتا ہو کہ اگر وہ احتساب کرے تو اس کے فسق کی وجہ سے اس کی بات نہیں سنی جائے گی تو اس پر وعظ و نصیحت کے ذریعے احتساب ضروری نہیں ہوگا، اس لیے کہ اس کے وعظ و نصیحت کا کوئی فائدہ نہیں ہے، کیوں کہ اس کا فسق اس کے کلام کے، فائدے کو ساقط کرنے میں موثر ہو رہا ہے۔ جب اس کے کلام کا کوئی فائدہ ہی نہیں رہا تو کلام کا وجوب بھی ساقط ہوگیا۔

یہ بات صرف زبانی نصیحت کے سلسلے میں ہے۔ لیکن امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ایک شکل اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ آدمی قوت و طاقت کے ذریعے معروف کو قائم کرے اور منکر کو مٹائے۔ اس کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ آدمی نیک اور متقی ہی ہو۔ اگر کسی غلط کار اور فاسق کو قوت حاصل ہے تو اسے اپنی قوت کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

اما الحسبة القهرية فلا یشترط فیها ذلک، فلا حرج علی الفاسق فی اراقة الخمور و کسر الملاهی و غیرها اذ قدر[2]

رہا طاقت کے ذریعے احتساب تو اس میں یہ (تقویٰ اور نیکی) شرط نہیں ہے۔ فاسق کے لیے اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ شراب کو بہادے اور آلاتِ لہو کو توڑ دے، اگر وہ اس پر قادر ہو۔

---

[1] احیاء علوم الدین: ۲/۳۴۱ [2] ایضاً

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لیے جن لوگوں نے نیکی اور تقویٰ کو شرط قرار دیا ہے، جیسا کہ گزر چکا، انھوں نے قرآن کی دو آیتوں سے بھی استدلال کیا ہے۔ امام غزالیؒ ان کے بارے میں فرماتے ہیں:

اما الآیات التی استدلوا بها فهو انکار علیهم من حیث ترکهم المعروف لاَ من حیث امرهم و لٰکن امرهم دل علی قوة علمهم وعقاب العالم اشد لاَنه لاَ عذرله مع قوة علمه[1]

جن آیات سے ان لوگوں نے استدلال کیا ہے، ان میں بے عمل انسانوں پر اس پہلو سے تنقید ہے کہ انھوں نے معروف پر عمل کو ترک کر دیا، اس پہلو سے نہیں کہ انھوں نے امر بالمعروف کا فرض انجام دیا۔ ان کا معروف کا حکم دینا اس بات پر دلالت کرتاہے کہ ان کو علم کی قوت حاصل ہے، (لیکن اس کے باوجود جب انھوں نے عمل نہیں کیا تو ظاہر ہے کہ) عالم کے لیے عذاب زیادہ سخت ہے، کیوں کہ قوتِ علم کی وجہ سے اس کے پاس کوئی عذر نہیں رہا۔

اس سلسلے میں حضرت سعید بن جبیرؒ نے بہت ہی حقیقت پسندانہ اور فطری بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں:

لو کان المرء لاَ یامر بالمعروف و لاَ ینهی عن المنکر حتی لاَ یکون فیه شیئ ما امر احد بمعروف ولاَ نهی عن منکر

اگر امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لیے یہ شرط ہے کہ انسان کے اندر کوئی خرابی نہ ہو تو کوئی بھی شخص نہ معروف کا حکم دے سکتا ہے اور نہ منکر سے منع کر سکتا ہے۔

امام مالکؒ نے یہ بات سنی تو فرمایا:

صدق، من ذا الذی لیس فیه شیء[2]

(سعید بن جبیرؒ) نے سچ کہا۔ کون ایسا شخص ہے جس کے اندر کوئی نقص نہ ہو۔

یہ تو اس مسئلہ کا قانونی پہلو ہے، لیکن جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ آدمی

---

[1] احیاء علوم الدین: ۲/ ۲۴۲

[2] تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۰۴

کے قول و عمل میں مطابقت ہونی چاہیے، اس کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ کہتے ہیں:

ذهب بعضهم الى ان مر تكب المعاصى لاَ ينهى غيره، وهٰذا ضعيف ... و الصحيح أن العالم يأمر بالمعروف وان لم يفعله، وينهى عن المنكر وان ارتكب ... لكنه و الحالة هٰذه مذموم على تركه الطاعة و فعله المعصية لعلمه بها و مخالفته على بصيرة فانه ليس من يعلم كمن لاَ يعلم[1]

بعض لوگ اس طرف گئے ہیں کہ معاصی کا ارتکاب کرنے والا دوسروں کو منع نہیں کرسکتا، لیکن یہ رائے کم زور ہے..... صحیح بات یہ ہے کہ علم رکھنے والا معروف کا حکم بھی دے گا اگرچہ وہ اس پر عمل نہ کرے اور منکر سے منع بھی کرے گا اگرچہ اس کا ارتکاب کرے ... لیکن وہ، جب کہ اس کی یہ حالت ہے، یقیناً قابلِ مذمت ہے، کیوں کہ اس نے جانتے بوجھتے اطاعت نہیں کی اور معصیت کا ارتکاب کیا اور بصیرت کے باوجود مخالفت کا رویہ اختیار کیا۔ ظاہر ہے جو شخص جانتا ہے وہ اس کی مانند نہیں ہے جو نہیں جانتا۔

دوسروں کو دین کی تبلیغ کرنا اور اپنے عمل سے اس کی مخالفت کرنا دین کے ساتھ کھلا ہوا مذاق ہے۔ اس سے دین کا وقار مجروح ہوتا ہے اور اس کی عظمت کو صدمہ پہنچتا ہے۔ بے عملی نہ صرف ایمان کی کم زوری کی دلیل ہے، بلکہ اس سے خود کہنے والے کی بات کا بھی کوئی وزن باقی نہیں رہتا۔ قرآن کا مطالبہ یہ ہے کہ جو کچھ تم کہتے ہو اس پر عمل بھی کرو، نفاق کی روش نہ اختیار کرو کہ باتیں تو تمھاری فرشتوں کی طرح معصومانہ ہوں اور کردار ایسا ہو کہ شیطان بھی پناہ مانگے۔ حضرت شعیب علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے اور اللہ کا دین انسانوں تک پہنچا رہے تھے، لیکن قول و عمل کی اہمیت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ جن معاصی سے تمھیں باز رہنے کی تبلیغ کر رہا ہوں خود ان سے آلودہ نہیں ہوں کہ تم میری باتوں کو واعظِ بے عمل کی نصیحت سمجھ کر نظر انداز کردو:

---

[1] تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۰۴، ۲۰۵

وَ مَا اُرِیْدُ اَنْ اُخَالِفَکُمْ اِلٰی مَا اَنْھَاکُمْ عَنْهُ اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَااسْتَطَعْتُ (ہود:۸۸)

اور میں یہ نہیں چاہتا کہ جن باتوں سے میں تم کو منع کر رہا ہوں خود ان کی مخالفت کروں۔ میں تو اپنی طاقت کی حد تک صرف اصلاح چاہتا ہوں۔

رسولِ اکرم ﷺ واعظِ بےعمل کے بارے میں فرماتے ہیں کہ قیامت کے روز اسے جہنم میں پھینک دیا جائے گا اور وہ اسی میں گھوم رہا ہوگا۔ اسے دیکھ کر جہنم کے دوسرے لوگ پوچھیں گے:

اَلَسْتَ کُنْتَ تَاْمُرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْھٰی عَنِ الْمُنْکَرِ

کیا تو معروف کا حکم نہیں دیتا تھا اور منکر سے منع نہیں کرتا تھا؟ (تو پھر تو یہاں کیسے نظر آ رہا ہے؟)

وہ جواب دے گا:

اِنِّی کُنْتُ اٰمُرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَا اَفْعَلُهٗ وَاَنْھٰی عن المنکر وَ افعلهٗ[1]

ہاں، بلاشبہ میں معروف کا حکم دیتا تھا، لیکن اس پر عمل نہیں کرتا تھا اور منکر سے منع کرتا تھا اور خود اس کا ارتکاب کرتا تھا۔

حکومت یا اس کی اجازت

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر عام لوگوں کے کرنے کا کام نہیں ہے۔ اسے حاکمِ وقت انجام دے سکتا ہے یا وہ شخص جسے حاکم کی اجازت حاصل ہو۔

پہلے آپ اس سوال پر غور کیجیے کہ کیا امر بالمعروف و نہی عن المنکر صرف حکام کا فرض ہے یا عوام بھی اس کے مکلّف ہیں؟

اس میں شک نہیں کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی نوعیت ایسی ہے کہ بعض اوقات اس میں طاقت کے استعمال کی بھی ضرورت پڑتی ہے، لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ عام لوگ اس سے بری الذمہ ہیں۔ اسے اسی وقت بجا لایا جائے گا، جب کہ

---

[1] بخاری، کتاب الفتن، باب الفتنۃ التی تموج کموج البحر

آدمی کے پاس اقتدار وحکومت ہو، کیوں کہ یہ ان واضح احادیث کے خلاف ہے جن میں ظالم حاکموں اور جابر فرماں رواؤں کے خلاف حق و انصاف کے اظہار کی تعریف کی گئی ہے۔ یہاں دو حدیثیں پیش کی جارہی ہیں، ایک حدیث ہے:

افضل الجهاد كلمة عدلٍ عند سلطان جائر[1]

سب سے زیادہ فضیلت والا جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کا کلمہ کہنا ہے۔

دوسری حدیث کے الفاظ ہیں:

سيّد الشهداء حمزة بن عبد المطلب و رجل قام الٰى امام جائر فامره و نهاه فقتله[2]

شہیدوں کے سردار حضرت حمزہ بن عبد المطلب ہیں اور وہ شخص جو کسی ظالم امام کے سامنے کھڑا ہو اور اسے (نیکی کا) حکم دے اور (برائی سے) منع کرے اور (اس کے نتیجے میں) حاکم اس کو قتل کردے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں:

قال العلماء و لاَ يختص الاُمر بالمعروف و النهى عن المنكر باصحاب الولاَيات بل ذلک ثابت لآحاد المسلمين، قال امام الحرمين: و الدليل عليه اجماع المسلمين فان غير الولاَة فى الصدر الاُول والعصر الذى يليه كانوا يامرون الولاَة بالمعروف و ينهونهم عن المنكر، مع تقرير المسلمين اياهم وترک توبيخهم على التشاغل بالاُمر بالمعروف و النهى عن المنكر من غير ولاَية[3]

علماء نے کہا ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر حکام کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ یہ حکم مسلمانوں کے عام افراد کے لیے بھی ثابت ہے۔ امام الحرمین فرماتے ہیں کہ اس کی دلیل مسلمانوں کا اجماع ہے، کیوں کہ دور اول اور اس سے قریب کے زمانے میں وہ لوگ جو اصحابِ اقتدار نہیں تھے حاکموں کو معروف کا حکم دیتے اور منکر سے منع کرتے تھے۔ ان کے اس عمل پر عام مسلمان خاموش رہے اور کسی نے اس بات پر انھیں سخت سست نہیں کہا کہ وہ بغیر حکومت کے حاکموں کو معروف کا حکم دیتے اور منکر سے منع کرتے ہیں۔

---

[1] ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب الامر والنہی [2] رواہ الترمذی والحاکم وقال صحیح الاسناد (الترغیب و الترہیب: ۳/۱۵۸) [3] شرح مسلم، المجلد الاول، الجزء ۲، ص ۲۱

قرآن نے سورہ حج میں اہل ایمان کی یہ صفت بیان کی ہے کہ "اگر ان کو زمین میں اقتدار عطا کیا جائے تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے۔" (آیت نمبر:۴۱) یہ واضح دلیل ہے اس بات کی کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر مسلمان حاکموں کا مخصوص وصف نہیں ہے، بلکہ یہ ہر مسلمان کا فرض ہے، جس کے ادا کرنے سے کوئی بھی شخص اسے باز نہیں رکھ سکتا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سورۂ حج کی اس آیت کے بارے میں فرماتے ہیں:

الاَ انها ليست على الوالي وحده و لكنها على الوالي والمولىٰ عليه[1]

سن لو! یہ صرف حاکم ہی کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ یہ حاکم اور محکوم دونوں کے لیے ہے۔

اب آیئے اس پہلو سے غور کریں کہ کیا امر بالمعروف ونہی عن المنکر حاکمِ وقت کی اجازت ہی سے انجام دیا جاسکتا ہے یا اس کے لیے اس کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے؟

جو لوگ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لیے حاکمِ وقت کی اجازت کو ضروری قرار دیتے ہیں ان کے پیشِ نظر دراصل اس کام کو منظّم کرنا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہر شخص کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی اجازت دے دی جائے تو اس میں کوئی ترتیب و تنظیم باقی نہیں رہ سکتی، بلکہ بسا اوقات بگاڑ کا بھی اندیشہ ہے۔ امام غزالیؒ گو اس شرط کے مخالف ہیں، لیکن فرماتے ہیں کہ اس شرط کے حق میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ:

ربما ينتدب لها من ليس اهلا لها لقصور معرفته او قصور ديانته فيؤدي ذٰلك الىٰ وجوه من الخلل[2]

بسا اوقات احتساب کا فرض ایسا شخص بھی انجام دینے لگتا ہے جو اپنے علم اور دیانت و تقویٰ کی کمی وجہ سے اس کا اہل نہیں ہوتا اور یہ چیز بہت سی خرابیوں کا سبب بن جاتی ہے۔

علّامہ عبدالقادر عودہ شہید کہتے ہیں:

---

[1] تفسیر ابن کثیر: ۵/۴۴۸

[2] احیاء علوم الدین: ۲/۳۴۸

و الّذین یشترطون اذن الاِمام یقصدون من هذا الشرط تنظیم الاَمر بالمعروف والنهی عن المنکر[1]	جو لوگ اس کام کے لیے امام کی اجازت کی شرط لگاتے ہیں وہ اس شرط کے ذریعے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی تنظیم چاہتے ہیں۔

قرآن و حدیث میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے متعلق جو ہدایات ہیں وہ بالکل عام ہیں، اس لیے علماء نے اس شرط کو غیر ضروری قرار دیا ہے اور اس سے اتفاق نہیں کیا ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

هٰذا الاِشتراط فاسد، فان الاٰیات والاَخبار التی أوردنا ها تدلّ علی ان کل من رأی منکرًا فسکت علیه عصی، اذ یجب نهیه اینما راه و کیف ما راه علی العموم، فالتخصیص بشرط التفویض من الاِمام تحکم لاَ اصل له[2]	یہ شرط فاسد ہے، کیوں کہ (اس باب میں) جو آیات و احادیث ہم نے نقل کی ہیں وہ بالکل عام انداز میں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ جو شخص کسی منکر کو دیکھے اور خاموش ہو جائے تو اس نے خدا کی نافرمانی کی، کیوں کہ اس کے لیے ضروری ہے کہ جہاں کہیں اور جس حالت میں بھی منکر کو دیکھے روک دے۔ پس اس حکم عام میں اس شرط کے ذریعے تخصیص پیدا کرنا کہ نہی عن المنکر اسی وقت ضروری ہے جب کہ یہ ذمے داری امام کی طرف سے سونپی جائے، بے دلیل دعویٰ ہے، جس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

اسی بحث میں ابھی وہ احادیث نقل کی گئی ہیں جن میں حکام کے جور و ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی تعریف کی گئی ہے۔ امام غزالیؒ ان احادیث کے حوالے سے فرماتے ہیں:

فاذا جاز الحکم علی الاِمام علیٰ مراغمته فکیف یحتاج الیٰ اذنه[3]	جب خود امام کے علی الرغم اس پر حق کا اظہار جائز ہے تو وہ امام کی اجازت کا کیسے محتاج ہوگا۔

---

[1] التشریع الجنائی الاسلامی: ۱/ ۵۰۱
[2] احیاء علوم الدین: ۲/ ۳۴۲
[3] ایضاً: ۲/ ۳۴۳

اسی سلسلے میں مزید فرماتے ہیں:

استمرار عادات السلف علی الحسبة علی الولاۃ قاطع باجماعهم علی الاستغناء عن التفویض، بل کل من امر بمعروف فان کان الوالی راضیا به فذاک، و ان کان ساخطا له فسخطه له منکر یجب الانکار علیه، فکیف یحتاج الیٰ اذنه[1]

سلف کا یہ مسلسل رویہ کہ وہ حکام کے خلاف احتساب کرتے رہے ہیں، اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ اس کام پر حکام کی طرف سے مامور کیے جانے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، بلکہ جو بھی شخص معروف کا حکم دے، اگر حاکم اس سے خوش ہے تو ٹھیک ہے اور اگر وہ اس سے ناخوش ہے تو معروف پر اس کا ناخوش ہونا خود ایک منکر ہے، جس پر تنقید ضروری ہے، تو پھر یہ کام اس کی اجازت کا کیسے محتاج ہوگا۔

علامہ سعد الدین تفتازانی لکھتے ہیں:

کان المسلمون فی الصدر الاول و بعده یأمرون الولاۃ بالمعروف و ینهونهم عن المنکر من غیر نکیر من احد و لا توقیف علی اذن، فعلم انه لا یختص بالولاۃ بل یجوز لاٰحاد الرعیة بالقول والفعل[2]

دورِ اول اور اس کے بعد (بھی) مسلمان، حکام کو معروف کا حکم دیتے اور منکر سے منع کرتے تھے۔ ان کے اس عمل پر نہ تو کسی نے نکیر کی اور نہ اسے حکام کی اجازت پر موقوف گردانا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ حکام کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ عام رعایا کو بھی اجازت ہے کہ وہ قول و فعل سے اس کو انجام دیں۔

حقیقت یہ ہے کہ امر بالمعروف و نہی المنکر نہ تو مسلم حکم رانوں کی مخصوص ذمہ داری ہے اور نہ اس کے لیے ان کی اجازت ہی کی ضرورت ہے، بلکہ یہ ہر مسلمان کا دینی فریضہ ہے۔ جب بھی وہ اس فرض کو انجام دینے کے موقف میں ہو اسے انجام دینا چاہیے اور وہ انجام دے گا۔

---

[1] احیاء علوم الدین: ۲/ ۳۴۳

[2] شرح المقاصد: ۲/ ۱۸۰

☆☆

شرائطِ وجوب

تکلیف

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے وجوب کی پہلی شرط یہ ہے کہ آدمی شرعاً مکلّف ہو، کیوں کہ غیر مکلّف پر کوئی حکم واجب نہیں ہوتا اور وہ تمام شرعی ذمے داریوں سے مستثنیٰ ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر کوئی نابالغ معروف کا حکم دے یا منکر سے منع کرے تو یہ اس کے لیے ناجائز ہے، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اگر وہ اس کام کو چھوڑ دے تو گناہ گار نہ ہوگا[1] لیکن اگر وہ اس کو انجام دیتا ہے تو لازماً ثواب کا مستحق ہوگا۔ امام غزالیؒ اس شرط کے بارے میں فرماتے ہیں:

انه شرط الوجوب، فاما امکان الفعل و جوازه فلا یستدعی الاَ العقل، حتی ان الصبی المراهق للبلوغ الممیز و ان لم یکن مکلفا فله انکارالمنکر وله ان یریق الخمر و یکسر الملاهی، و اذا فعل ذٰلک نال به ثواباً و لم یکن لِاَحد منعه من حیث انه لیس بمکلّف فان هٰذهٖ قربة و هو من اهلها[2]

یہ صرف وجوب کی شرط ہے، باقی رہا اس عمل کا امکان اور جواز تو یہ عقل کے سوا کسی اور چیز کا مطالبہ نہیں کرتا، یہاں تک کہ ایک بچہ جو بالغ ہونے کے قریب ہے اور صاحبِ تمیز ہے، اگرچہ وہ مکلّف نہیں ہے، لیکن اسے اجازت ہے کہ شراب کو بہادے اور آلاتِ لہو کو توڑ دے[1] اگر وہ اس پر عمل کرے تو اس کا ثواب بھی پائے گا۔ کسی کو اسے اس وجہ سے منع کرنے کا حق نہیں ہے کہ وہ مکلّف نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ خدا سے تقرب کا ذریعہ ہے اور وہ یقیناً اس کا اہل ہے۔

۱۔ اس مسئلہ پر ہم آئندہ بحث کریں گے کہ اسلامی ریاست میں ایک مسلمان کو، خواہ وہ نابالغ ہو یا بالغ، بذریعہ قوت منکر کے مٹانے کا حق ہے یا نہیں؟

۲۔ احیاء علوم الدین: ۳۳۹/۲

قدرت

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے وجوب کی دوسری شرط ہے قدرت۔ جو شخص امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی قدرت رکھتا ہو اسی پر معروف کا حکم دینا یا منکر سے منع کرنا واجب ہے۔ اگر کسی میں اس کی قدرت نہیں ہے تو وہ اس پر واجب بھی نہیں ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ، فان لم یستطع فبلسانہ، فان لم یستطع فبقلبہ، وذلک أضعف الإیمان[1]

تم میں سے جو شخص بھی کسی منکر کو دیکھے، تو اسے ضرور اپنے ہاتھ سے بدل دے۔ اگر وہ اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان کے ذریعے اس کو بدلے اور اس کی بھی اس میں طاقت نہ ہو تو اپنے دل ہی سے اس کو بدلے اور یہ ایمان کا بہت ہی کم زور درجہ ہے۔

یہ اس امر کی دلیل ہے کہ انسان پر تغیر منکر بذریعہ قوت اس وقت ضروری ہے جب کہ وہ اس کی استطاعت رکھتا ہو، ورنہ اس کا فرض یہ ہے کہ برائی کے خلاف اپنی آواز بلند کرے۔ اگر اس کی بھی اس میں طاقت نہیں ہے تو اس کی ذمے داری صرف یہ رہ جاتی ہے کہ منکر سے نفرت کرے اور دل سے اس کو برا جانے۔ امام ابوبکر جصاص کہتے ہیں:

اخبر النبی صلی اللّٰہ علیہ و سلم ان انکار المنکر علی ھٰذہٖ الوجوہ الثلاثۃ علی حسب الإمکان و دل علی انہ اذا لم یستطع تغیرہ بیدہ فعلیہ تغییرہ بلسانہ ثم اذا لم یمکنہ ذٰلک فلیس علیہ اکثر من انکارہ بقلبہ[2]

نبی ﷺ نے (یہ) بیان کیا ہے کہ منکر پر نکیر کرنا مذکورہ تین طریقوں سے ہوتا ہے، ان میں سے جس کی بھی وہ طاقت رکھتا ہو۔ اور اس میں آپؐ نے یہ بتایا ہے کہ منکر پر نکیر کرنے والا جب منکر کو اپنے ہاتھ سے نہ بدل سکے تو اس کے لیے زبان سے منکر کو بدلنا ضروری ہے۔ اگر اس کا امکان بھی اس کے لیے نہ ہو تو اس کی ذمے داری اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اپنے دل سے اس پر نکیر کرے۔

---

[1] مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کون النہی عن المنکر من الایمان الخ۔ ترمذی، ابواب الفتن، باب ماجاء فی تغییر المنکر بالید او باللسان او بالقلب

[2] احکام القرآن: ۳۸/۲

عدم قدرت کی شکلیں

اب ہمیں اس سوال پر غور کرنا ہے کہ عدم قدرت کی کتنی صورتیں ہوسکتی ہیں اور ان مختلف صورتوں میں شریعت کے کیا احکام ہیں؟

عجزِ حسی

عدم قدرت کی پہلی شکل وہ ہے جسے فقہاء نے عجزِ حسی سے تعبیر کیا ہے۔ اگر آدمی جسمانی طور پر اس قدر کم زور اور بے بس ہو کہ وہ نہ معروف کو قائم کرسکے اور نہ منکر کو مٹا سکے تو اس پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ذمے داری عائد نہ ہوگی۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

و لاَ یخفٰی ان العاجز لیس علیه حسبة اِلاّ بقبله[1]

یہ کوئی پوشیدہ بات نہیں ہے کہ مجبور پر صرف دل سے احتساب کی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔

عجزِ علمی

عدم قدرت اور عجز کی ایک شکل عدمِ علم بھی ہے۔ جو شخص معروف و منکر سے ناواقف ہے اس پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ذمے داری بھی عائد نہیں ہوتی۔ علامہ عبد القادر عودہ شہیدؒ فرماتے ہیں:

و یلحق بالعجز الحسی العجز العلمی[2]

عجزِ حسی ہی کے حکم میں عجزِ علمی بھی داخل ہے۔

معروف و منکر کے حدود بہت وسیع ہیں۔ اس میں دین کی ایسی تعلیمات بھی شامل ہیں جن کا جاننا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے اور ایسے احکام بھی اس میں آتے ہیں جن کے سمجھنے کے لیے مجتہدانہ علم و بصیرت کی ضرورت ہے۔ جو شخص جس حد تک

۱؎ احیاء علوم الدین: ۲/۲۴۶

۲؎ التشریع الجنائی الاسلامی: ۱/۴۹۸

معروف اور منکر سے واقف ہے اسی حد تک اس پر ان کا حکم دینا یا منع کرنا ضروری ہے۔ اگر وہ اپنی حد سے آگے بڑھ کر تبلیغ اور نقد و احتساب کرے گا تو ہوسکتا ہے کہ دین کی خدمت کے ارادے کے باوجود اس کو نقصان پہنچا جائے۔ اس لیے علماء نے صراحت کی ہے کہ جن چیزوں کا معروف یا منکر ہونا واضح ہے عوام کو ان ہی کے بارے میں امر و نہی کرنا چاہیے۔ اجتہادی امور پر گفتگو کرنا اہلِ علم کا کام ہے۔ امام الحرمین فرماتے ہیں:

ان الحکم الشرعی اذا استویٰ فی ادراکه الخاص والعام ففیه للعالم وغیرالعالم الاَمر بالمعروف والنهی عن المنکر، واذا اختص مدرکه بالاِجتهاد فلیس للعوام فیه امر و نهی بل الاَمر فیه موکول الیٰ اهل الاِجتهاد[1]

ایسا حکم شرعی جسے ہر خاص و عام جان سکتا ہے، اس کے بارے میں عالم اور غیر عالم دونوں ہی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرسکتے ہیں۔ لیکن اگر حکم کی نوعیت ایسی ہے کہ اس کا معلوم کرنا اجتہاد ہی سے ممکن ہو تو عوام کو اس کے بارے میں حکم دینے یا منع کرنے کا حق نہیں ہے۔ اس میں معاملہ اہلِ اجتہاد کے سپرد ہے (وہ اپنے اجتہاد کے مطابق اس سلسلے میں اقدام کریں گے)۔

اسی بات کو امام نووی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

انما یامر و ینهی من کان عالما بما یامر به و ینهی عنه و ذٰلک یختلف باختلاف الشیء، فان کان من الواجبات الظاهرة و المُحرمات المشهورة کالصلوٰة و الصیام و الزنا و الخمرو نحوها، فکل المسلمین علماء بها و ان کان من دقائق الاَفعال و الاُقوال

امر بالمعروف و نہی عن المنکر وہی شخص کرے گا جو اس چیز کو جانتا ہو جس کا وہ حکم دے رہا ہے یا جس سے منع کر رہا ہے اور مسائل کے اختلاف کے ساتھ یہ امر و نہی بھی مختلف ہوتا ہے۔ اگر مسئلہ کھلے ہوئے فرائض اور مشہور محرمات میں سے ہے، جیسے نماز، روزہ، زنا، شراب وغیرہ تو سب ہی مسلمان اس کو جانتے ہیں۔ لیکن اگر وہ اعمال و اقوال کی کوئی باریکی ہے اور اس

[1] شرح المقاصد: ۲/ ۲۸۱

و مما يتعلق بالاِجتهاد لم يكن للعَوام مدخل فيه ولاَ لهم انكاره بل ذٰلک للعلماء[1]

کا تعلق اجتہاد سے ہے تو عوام کو اس میں داخل دینے کا حق نہیں ہے اور نہ ان کو اس پر نکیر کرنا چاہیے، بلکہ یہ اہلِ علم کا کام ہے۔

امام غزالیؒ نے صراحت کی ہے:

العامیّ ينبغی له ان لاَ يحتسب الاّ فی الجليّات المعلومة[2]

عام آدمی کو صرف ان امور میں احتساب کرنا چاہیے جو بہت ہی واضح اور معلوم ہیں۔

خوفِ ضرر

عدمِ قدرت کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض انجام دینے میں آدمی اپنے لیے خطرہ محسوس کرے۔ اس صورت میں یہ فرض اس سے ساقط ہو جائے گا۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

لاَ يقف سقوط الوجوب علی العجز الحسی بل يلتحق به ما يخاف عليه مكروهـا ينـاله فذٰلک فی معنی العجز[3]

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا وجوب صرف عجزِ حسی ہی کی وجہ سے ساقط نہیں ہوتا، بلکہ اس کے ساتھ یہ صورت بھی شامل ہے کہ آدمی کو کسی تکلیف کے پہنچنے کا خوف ہو۔ یہ بھی عجز ہی کے حکم میں ہے۔

محدث ابن بطال کہتے ہیں:

و النصيحـة لاَزمة علیٰ قـدر الطاقة اذا علم الناصح انه يقبل نصحه و يطاع امره و امن علی نفسه المكروه، فان خشی اذی فهو فی سعة[4]

نصیحت اور خیر خواہی طاقت کی حد تک لازم ہے، جب کہ نصیحت کرنے والا یہ جانتا ہو کہ اس کی نصیحت قبول کی جائے گی اور اس کے حکم پر عمل کیا جائے گا۔ ساتھ ہی اسے کسی تکلیف کے پہنچنے کا اندیشہ بھی نہ ہو۔ اگر اس کا اندیشہ ہو تو اس کی گنجائش ہے کہ نصیحت کرے یا نہ کرے۔

---

1. شرح مسلم: المجلد الاول، الجزء ۲، ص ۲۱
2. احیاء علوم الدین: ۲/ ۳۴۸
3. ایضاً: ۲/ ۳۴۷
4. شرح مسلم للنووی، المجلد الاول، الجزء ۲، ص ۳۵

ضرر کے مختلف پہلو

امام غزالیؒ نے اپنی کتاب احیاء علوم الدین میں ضرر کے مختلف پہلوؤں پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ یہاں ہم ان کی بحث کا خلاصہ اپنے الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

''انسان اپنے لیے بھی اور اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے لیے بھی چار چیزیں چاہتا ہے: علم، صحت، دولت و ثروت اور جاہ و مرتبہ۔ ان کے بارے میں اس کو دو باتیں ناگوار ہوتی ہیں: ایک یہ کہ ان میں سے جو چیز حاصل ہے وہ ختم ہوجائے۔ دوسری یہ کہ ان میں سے جس چیز کے مستقبل میں ملنے کی توقع ہے وہ ملنے سے رہ جائے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:

فرجع المکروہ الیٰ قسمین: احدھما خوف امتناع المنتظر و ھٰذا لاَ ینبغی ان یکون مرخصًا فی ترک الاَمر بالمعروف و النھی عن المنکر[1]

پس مکروہ کی دو قسمیں ہوئیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ جس چیز کا انتظار ہے اس کے رُک جانے کا خوف ہو، لیکن اس کی وجہ سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو چھوڑنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔

مثال کے طور پر ایک شاگرد اپنے استاذ پر اس لیے تنقید نہ کرے کہ وہ اس سے ناخوش ہوگا اور تعلیم نہ دے گا، یا کوئی مریض ڈاکٹر پر احتساب سے اس لیے گریز کرے کہ وہ اس کا علاج نہیں کرے گا اور اس طرح جس صحت کی اسے توقع ہے وہ حاصل نہ ہوسکے گی، یا آدمی حاکمِ وقت یا اپنے کسی محسن پر تنقید سے اس لیے خاموش رہے کہ وہ اس کی مالی اعانت بند کردے گا، اسی طرح آدمی کو کسی سے اچھے مرتبہ و حیثیت ملنے کی توقع ہو اور وہ اس لیے اس پر احتساب نہ کرے کہ وہ حیثیت اسے حاصل نہ ہوسکے گی۔ یہ مثالیں دینے کے بعد امام موصوف فرماتے ہیں:

---

[1] احیاء علوم الدین: ۲/۳۴۹

هٰذا کله لاَ یسقط وجوب الحسبة، لاَن هٰــذہٖ زیادات امتنعت، و تسمیــة امتناع حصول الزیادات ضرراً مجاز، و انما الضرر الحقیقی فوات حاصل، ولاَ یستثنیٰ من هٰذا شئی الاّ ما تدعو الیه الحاجة و یکون فی فواته محذور یزید علیٰ محذور السکوت علیٰ المنکر[1]

یہ سب چیزیں احتساب کے وجوب کو ختم نہیں کرتیں۔ کیوں کہ یہ اصل پر زائد چیزیں ہیں جو حاصل نہیں ہوسکی ہیں اور زائد چیزوں کے حاصل نہ ہونے کو ضرر کا نام دینا مجاز ہے۔ حقیقی ضرر تو یہ ہے کہ حاصل شدہ چیز فوت ہو جائے۔ اس قاعدے سے کوئی صورت مستثنٰی نہیں ہوگی۔ الاّ یہ کہ کوئی ضرورت اس کی داعی ہو اور اس کے فوت ہونے میں ایسا خوف ہو جو منکر پر سکوت کے خوف سے بڑا ہو۔

اس استثنائی شکل کی وضاحت بھی امام موصوف نے اوپر ہی کی مثالوں کے ذریعے کی ہے۔ فرماتے ہیں:

"فرض کیجیے کہ ایک شخص دین کی بنیادی باتوں سے واقف ہے اور اس کے حدود میں صرف ایک عالم ہے جس سے وہ دین سیکھ سکتا ہے۔ ایسا شخص اسے منکر کا ارتکاب کرتے دیکھتا ہے، اگر وہ اس پر احتساب کرے تو اسے یقین ہے کہ وہ اسے تعلیم دینے سے منع کردے گا اور اس کے حالات بھی ایسے نہیں ہیں کہ کسی دوسرے سے تعلیم پاسکے۔ اب ایک طرف دین کی بنیادی باتوں سے واقف ہونا بھی ضروری ہے اور دوسری طرف انکارِ منکر بھی ضروری ہے۔ اس حالت میں احتساب کا فرض انجام دینے والا منکر کی نوعیت اور علم کی ضرورت دونوں کو سامنے رکھ کر خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ اسے کون سی راہ اختیار کرنی چاہیے۔ اگر منکر ایسا ہو کہ اس پر تنقید و احتساب کو علمِ دین پر مقدم ہونا چاہیے تو وہ اسے مقدم رکھے گا، ورنہ علمِ دین کو ترجیح دے گا اور منکر پر سکوت اختیار کرے گا۔ یا ایک شخص بیمار ہے اور مرض کی نوعیت ایسی ہے کہ علاج میں تاخیر سے صحت کے زیادہ خراب ہونے، بلکہ جان کے جانے کا خطرہ ہے اور اس وقت جو حکیم فراہم ہوسکتا ہے وہ

---

[1] احیاء علوم الدین: ۲/۳۵۰

کسی منکر کا مرتکب ہو رہا ہے۔ اگر اس پر تنقید کی جائے تو اس بات کا یقین ہے کہ وہ علاج کے لیے آمادہ نہ ہوگا۔ ایسی صورت میں مریض کو حق ہے کہ اس پر نکیر نہ کرے۔ یا ایک شخص اس قدر کم زور ہے کہ نہ کما سکتا ہے اور نہ کسی سے مانگ کر زندگی گزار سکتا ہے اور نہ اس کے اندر اللہ تعالیٰ پر بہت زیادہ توکل ہے۔ اگر وہ کسی ایسے شخص کی غلط روش پر تنقید کرے جو اس کا خرچ برداشت کر رہا ہے تو اس کو یقین ہے کہ وہ خرچ دینا بند کردے گا اور وہ یا تو حرام کھانے پر مجبور ہوگا یا مرجائے گا۔ ایسی صورت میں اسے اجازت ہے کہ اس کی غلط روش پر سکوت اختیار کرے۔ اسی طرح فرض کیجیے، کوئی غنڈہ کسی کے پیچھے لگا ہوا ہے اور اس سے نجات پانے کی سوائے اس کے کوئی صورت نہیں ہے کہ کسی صاحبِ حیثیت آدمی کے ذریعے حاکمِ وقت سے شکایت کی جائے، لیکن صاحبِ حیثیت آدمی منکر میں مبتلا ہے۔ مثال کے طور پر وہ ریشم کا استعمال کرتا ہے۔ اگر اس کے استعمال پر تنقید کی جائے تو معلوم ہے کہ حاکم تک رسائی نہیں ہوسکے گی اور یہ غنڈہ جان لے لے گا۔ ایسی صورت میں آدمی کو اجازت ہے کہ اس پر تنقید نہ کرے اور اپنی جان بچانے کی فکر کرے۔ ان مثالوں کے ذکر کے بعد امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

فهذه الأمور كلها اذا ظهرت و قويت لم يبعد استثناؤها، و لكن الأمر فيها منوط باجتهاد المُحتسب حتى يستفتي فيها قلبه، و يزن احد المَحذورين بالأخر، و يرجع بنظر الدين لاَ بموجب الهوى و الطبع، فان رجع بموجب الدين سمى سكوته مداراة، وان رجع بموجب الهوى

پس یہ تمام امور جب بالکل ظاہر اور قوی ہوں تو ان کا استثنا ہوسکتا ہے۔ لیکن اس میں معاملہ احتساب کرنے والے کے اجتہاد سے متعلق ہے۔ وہ اپنے دل سے اس میں فتویٰ طلب کرے اور دونوں نقصانات کا ایک دوسرے سے موازنہ کرے اور کسی بھی پہلو کو دین کے نقطۂ نظر سے ترجیح دے، نہ کہ خواہش اور رجحان طبع سے۔ اگر وہ دین کے نقطۂ نظر سے سکوت کو ترجیح دے گا تو اس کو مدارات کہا جائے گا اور اگر خواہش کے مطابق اس کو ترجیح دے گا تو یہ مداہنت ہوگی۔

سمى سكوته مداهنة. وهٰذا امر باطن لاَ يطلع عليه الاّ بنظر دقيق، و لٰكن الناقد بصير، فحق على كل متدين فيه ان يراقب قلبه و يعلم ان اللّٰه تعالىٰ مطلع على باعثه و صارفه أنه الدين او الهوى، و ستجد كل نفس ما عملت من سوء اوخير محضرا عند اللّٰه و لو فى فلتة خاطر او لفتة ناظر من غير ظلم وجور فما اللّٰه بظلّام للعبيد[1]

یہ باطن کا معاملہ ہے، اس پر وہ گہری نظر ہی سے واقف ہو سکتا ہے، لیکن چھان بین کرنے والا (خدا) بخوبی جانتا ہے۔ پس ہر دین دار کو چاہیے کہ اپنے دل کو دیکھے اور یہ سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ اس بات سے واقف ہے کہ اس کے اقدام کا باعث اور انکار منکر سے پھیرنے والا سبب دین ہے یا خواہش؟ انسان جو کچھ بھی کرے، خواہ وہ برائی ہو یا بھلائی، اس کا بدلہ بغیر کسی ظلم و جور کے اللہ کے نزدیک پائے گا، خواہ وہ دل کے اندر پیدا ہونے والی کھٹک ہو یا کسی دیکھنے والے کی نگاہ اس سے چوک گئی ہو۔ اللہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

اس کے بعد امام موصوف نے ضرر کی دوسری قسم سے بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں:

اما القسم الثانى وهو فوات الحاصل فهو مكروه ومعتبر فى جواز السكوت فى الأُمور الأَربعة الاّ العلم[2]

دوسری قسم ہے حاصل شدہ چیز کا فوت ہو جانا، پس یہ (ہر ایک کے لیے) ناپسندیدہ ہے اور اوپر چار چیزوں میں اس کا اعتبار کیا جائے گا سوائے علم کے۔

اس قاعدے سے علم کو مستثنیٰ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ کوئی بھی شخص کسی سے اس کے علم کو نہیں چھین سکتا۔ انسان کے علم کو اگر نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے تو اپنی کوتاہی اور غفلت سے ہے، کسی دوسرے میں اس کو نقصان پہنچانے کی طاقت نہیں ہے، اس لیے علم کے بارے میں یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ کوئی اسے ختم کردے گا۔

---

[1] احیاء علوم الدین: ۲/۳۵۰

[1] ایضاً

ہاں آدمی کی صحت کو کوئی چاہے تو نقصان پہنچا سکتا ہے، بلکہ اسے قتل بھی کر سکتا ہے۔ اگر احتساب کے سلسلے میں اس کا خطرہ ہو تو احتساب کا فرض ساقط ہو جاتا ہے، لیکن اس کا استحباب باقی رہتا ہے۔ اسی طرح احتساب سے انسان کے مال کو خطرہ لاحق ہو تو بھی اس کو اجازت ہے کہ احتساب کا فرض انجام نہ دے اور سکوت اختیار کرے، لیکن اس صورت میں بھی اس کے لیے یہی پسندیدہ ہے کہ وہ اپنی دنیا کو قربان کر کے دین کی خدمت انجام دے۔ اس ذیل میں امام غزالیؒ ایک قاعدہ کلیہ یہ بیان کرتے ہیں:

و لکل واحد من الضرب و النهب حد فی القلة لاَ یکترث به کالحبة فی المال و اللطمة الخفیفة المَها فی الضرب، وحد فی الکثرة یتعین اعتباره ووسط یقع فی محل اشتباه، واجتهاد، و علی المتدین ان یجتهد فی ذٰلک و یرجّح جانب الدین ما امکن[1]

مار پیٹ اور لوٹ مار، ان میں سے ہر ایک میں ایک تو کمی کی حد ہے جس کا کوئی اعتبار نہیں کیا جاتا، جیسے کہ مال میں ایک دانے کی کمی آ جائے، یا ایسی تھپڑ لگ جائے جس کی تکلیف بہت ہی معمولی ہو۔ اور ایک حد کثرت کی ہوتی ہے جس کا اعتبار کرنا ضروری ہے۔ اور ایک درمیانی حالت ہے جو شبہ میں ڈالتی ہے اور جہاں اجتہاد کی ضرورت پڑتی ہے تو دین دار آدمی کے لیے ضروری ہے کہ اس میں اجتہاد کرے اور امکان کی حد تک دین کے پہلو کو ترجیح دے۔

مرتبہ وحیثیت کے سلسلے میں دو باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ ایک یہ کہ احتساب سے اگر آدمی کی مروت ہی کے ختم ہونے کا خطرہ ہے تو ضرور اس کو اس بات کی اجازت ہوگی کہ وہ اس فرض کو انجام نہ دے۔ مثلاً یہ کہ اس کا چہرہ کالا کر کے بازار میں گھمایا جائے۔ لیکن اگر اس سے آدمی کے محض اونچے مقام کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہے تو اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص موٹر نشین ہے اور بغیر سواری

---

[1] احیاء علوم الدین: ۲/ ۲۵۰، ۲۵۱

کے گھر سے نکلنے کا عادی نہیں ہے۔ اب اگر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے نتیجے میں اس کو یہ اندیشہ ہے کہ اسے بغیر سواری کے باہر نکلنے اور پیدل چلنے پر مجبور کیا جائے گا تو یہ ایسی مجبوری نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض ساقط ہوجائے۔ اس صورت میں منکر پر لازماً احتساب کرنا چاہیے۔ ان تفصیلات کے بیان کرنے کے بعد امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

قد دلّت العمومات علی تأکّد وجوب الحسبة وعظم الخطر فی السکوت عنها، فلا یقابله الاّ ما عظم فی الدین خطره، والمال والنفس والمرؤة قد ظهر فی الشرع خطرها، فاما مزایا الجاه والحشمة ودرجات التجمل و طلب ثناء الخلق فکل ذلک لاَخطر له[1]	قرآن و حدیث کے الفاظ کا عموم بتاتا ہے کہ احتساب کا وجوب موکد ہے اور اس سے سکوت اختیار کرنے میں بڑا خطرہ ہے۔ پس اس کا مقابلہ وہی چیز کرسکتی ہے جس کا نقصان بھی دین کی نظر میں بڑا ہو۔ جہاں تک مال، جان اور مروّت کا تعلق ہے، اس کا مرتبہ شریعت میں واضح ہے۔ باقی جاہ و حشمت کے فضائل اور زیب و زینت کے درجات اور مخلوق سے تعریف کی طلب تو ان سب چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

ملامت، ضرر نہیں ہے

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے نتیجے میں دوسروں کی تنقید، ناگواری اور ملامت ضرر میں شامل نہیں ہے۔ اس لیے ان سب سے بے نیاز ہوکر مومن کو یہ فرض ادا کرنا ہوگا۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں اور جن سے وہ محبت کرتا ہے، قرآن نے ان کے بارے میں کہا ہے:

یُجَاهِدُوْنَ فِی سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَائِمٍ (المائدۃ:۵۴)	وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں، اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔

---

[1] احیاء علوم الدین ۲/ ۳۵۱

حافظ ابن کثیرؒ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

ای لاَ یردهم عما هم فیه من طاعة الله و اقامة الحدود و قتال اعدائه والاَمر بالمعروف والنهی عن المنکر لاَ یردهم عن ذلک راد ولاَ یصدّهم عنه صاد ولایحیک فیهم لوم لائم و لاَ عذل عاذل[1]

یعنی ان کی حالت یہ ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت کرتے ہیں، اس کے حدود قائم کرتے ہیں، اس کے دشمنوں سے جنگ کرتے ہیں، معروف کا حکم دیتے اور منکر سے روکتے ہیں، اس حالت سے ان کو نہ کوئی پھیرنے والا پھیرتا ہے اور نہ کوئی روکنے والا روکتا ہے، نہ ان پر کسی ملامت گر کی ملامت اثر انداز ہوتی ہے اور نہ کسی غصہ کرنے والے کا غصہ۔

حضرت عبادہ بن صامتؓ کی روایت ہے:

بایعنا رسول الله صلی الله علیه و سلم...علی ان نقول بالحق اینما کنا لاَ نخاف فی الله لومة لائم[2]

ہم نے رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی تھی..... کہ ہم جہاں کہیں بھی ہوں گے حق کہیں گے اور اللہ کے بارے میں کسی ملامت گر کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔

اس روایت کی تائید ایک دوسری حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں:

اوصانی خلیلی ﷺ بخصال من الخیر، أوصانی ان لاَ اخاف فی الله لو مة لائم و اوصانی ان اقول الحق وان کان مرًّا[3]

میرے محبوبؐ نے مجھے چند امورِ خیر کی وصیت کی ہے۔ مجھے تاکید کی کہ اللہ کے بارے میں (کہتے ہوئے) کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈروں اور مجھے تاکید کی کہ حق بات کہوں، خواہ وہ کڑوی ہی کیوں نہ لگے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر: ۳/۱۶۲

[2] بخاری، کتاب الاحکام، باب کیف یبایع الامام الناس۔ مسلم، کتاب الامارۃ، باب وجوب طاعۃ الامراء فی غیر معصیۃ وتحریمہا فی المعصیۃ۔

[3] رواہ ابن حبان فی صحیحہ۔ الترغیب والترہیب: ۳/۱۶۳

علامہ قرطبیؒ نے لکھا ہے:

اجمع المسلمون فی ما ذکر ابن عبدالبر ان المنکر واجب تغییره علی کل من قدر علیه و انه اذا لم یلحقه بتغییره الاّ اللوم الذی لاَ یتعدی الیٰ الاَذی فان ذلک لاَ ینبغی ان یمنعه من تغییره[1]

ابن عبد البر کے بیان کے مطابق مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ تغییر منکر ہر اس شخص پر واجب ہے جو اس کی قدرت رکھتا ہو، جب کہ منکر کی تغییر سے اس کو صرف ملامت لاحق ہو جو تکلیف کی حد تک نہ پہنچ جائے۔ کیوں کہ اتنی سی چیز کو تغییر منکر کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

ولو ترکت الحسبة بلوم لاَئم او باغتیاب فاسق او شتمه او تعنیفه او سقوط المنزلة عن قلبه او قلب امثاله لم یکن للحسبة وجوب اصلاً اذ لاَ تنفکّ الحسبة عنه[2]

کسی ملامت گر کی ملامت یا کسی فاسق کی غیبت یا سب وشتم یا درشت کلامی یا اس کے دل سے یا اس جیسے دوسرے افراد کے دل سے اپنے مرتبے کا گر جانا، یہ سب ایسی چیزیں ہیں کہ اگر ان کی وجہ سے احتساب کو چھوڑ دیا جائے تو کبھی احتساب واجب ہی نہ ہوگا، کیوں کہ احتساب (کے ساتھ یہ لازم ہے، وہ) اس سے جدا نہیں ہوتا ہے۔

دوسروں کو ضرر پہنچنے کا خطرہ

اب تک ضرر کے ان امکانات سے بحث تھی جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض انجام دینے والے کی ذات کو لاحق ہوسکتے ہیں۔ ایک امکان یہ بھی ہے کہ جو شخص یہ فرض انجام دے رہا ہے اس کو تو کسی نقصان کا خطرہ نہ ہو، البتہ اس کی وجہ سے اس کے عزیز و اقارب اور دوست و احباب کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ یہ اندیشہ جانی یا مالی ہے تو اسے احتساب نہیں کرنا چاہیے، کیوں کہ جس طرح منکر

---

[1] الجامع لاحکام القرآن، المجلد الثانی، الجزء ۴، ص ۳۲

[2] احیاء علوم الدین: ۲/۳۵۱

پر خاموش رہنا ممنوع ہے اسی طرح کسی مسلمان کو تکلیف دینا بھی ممنوع ہے۔ لیکن اگر اس سے ان کی جان و مال کو تو خطرہ نہ ہو البتہ ان کے بارے میں بدزبانی اور بدکلامی ہو سکتی ہو تو دیکھا جائے گا کہ منکر کس درجے کا ہے اور بدکلامی سے پہنچنے والی تکلیف کی مقدار کیا ہے۔ پھر اسی کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔[۱]

عدمِ قدرت اور ضرر کا فیصلہ ظنِ غالب سے ہوگا

ان تفصیلات سے واضح ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا وجوب اس وقت باقی نہیں رہتا جب کہ انسان اس کے ادا کرنے سے عاجز ہو یا اس سے کسی ضرر کا خطرہ ہو۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ عجز اور عدم قدرت یا ضرر کا فیصلہ کس بنیاد پر کیا جائے اس کے لیے محض ظنّ غالب کافی ہے یا اس کا قطعی اور یقینی علم ہونا ضروری ہے۔ امام غزالیؒ نے خوفِ ضرر پر گفتگو کرتے ہوئے اس سوال سے بھی بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں:

ان غلب علی الظن انه یصاب لم یجب، وان غلب انه لاَ یصاب وجب، و مجرد التجویز لاَ یسقط الوجوب فان ذٰلک ممکن فی کل حسبة[۲]

اگر کسی کو اس بات کا ظنّ غالب حاصل ہو کہ احتساب کی وجہ سے اس کو تکلیف پہنچائی جائے گی تو اس کے لیے احتساب کرنا ضروری نہیں ہے اور اس کو یہ گمانِ غالب ہو کہ تکلیف نہیں پہنچائی جائے گی تو احتساب ضروری ہوگا، محض رائے اور خیال وجوب کو ساقط نہیں کرتا۔ کیوں کہ اس کا امکان تو ہر احتساب میں موجود ہے۔

اسی بحث میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ احتساب کا وجوب اسی وقت ساقط ہوگا جب کہ آدمی کو ضرر کا 'علم' ہو اور پھر علم کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:

اعنی بالعلم الظن الذی یجوز بمثله ترک استعمال الماء و

علم سے مراد میرے نزدیک ایسا ظن اور قیاس ہے کہ اس جیسے قیاس پر پانی کے استعمال

---

[۱] احیاء علوم الدین: ۲/ ۳۵۱ [۲] حوالہ سابق: ۲/ ۳۴۸

العدول الی التیمم، فاذا انتھی الی ھٰذا الحد لم یبعد ان یرخّص فی الترک الحسبة[1]

کو چھوڑ کر تیمّم کرنا جائز ہوتا ہے۔ جب قیاس اس حد کو پہنچ جائے تو بعید نہیں کہ ترکِ احتساب کی اجازت دی جائے۔

عزیمت کی راہ

ضرر اور عدمِ ضرر کی بیش تر ممکنہ صورتیں اوپر زیرِ بحث چکی ہیں اور یہ بھی ثابت ہے کہ اگر صحیح معنی میں خوفِ ضرر ہے تو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا وجوب ساقط ہو جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اگر کوئی شخص ہر طرح کے خوف اور خطرے سے بے نیاز ہوکر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض انجام دے تو وہ کسی غلطی کا مرتکب ہوگا۔ یہ نہ صرف یہ کہ اس کے لیے جائز ہے، بلکہ اس سے مطلوب بھی ہے۔ جان و مال کے خوف سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو چھوڑ دینا محض ایک اجازت ہے، جو شریعت نے کم زور ایمان والوں کو دی ہے۔ عزیمت اور فضیلت کی راہ یہ ہے کہ آدمی اپنا سب کچھ کھودے، مگر اللہ کے دین کو قائم کرنے اور حق کو حق اور باطل کو باطل کہنے سے باز نہ آئے۔ یہی بات اس حدیث میں کہی گئی ہے جس کی روایت حضرت عمرؓ نے نبی ﷺ سے کی ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

انه تصیب امتی فی اٰخر الزمان من سلطانھم شدائد لاَ ینجو منه الاّ رجل عرف دین اللّٰه فجاھد علیه بلسانه ویده و قلبه، فذٰلک الذی سبقت له السوابق و رجل عرف دین اللّٰه فصدق به ورجل عرف دین

یقیناً آخر زمانہ میں میری امت کو ان کے بادشاہوں کی جانب سے سختیاں لاحق ہوں گی۔ اس سے وہی شخص نجات پائے گا جس نے خدا کے دین کو پہچانا اور اس کے لیے اپنی زبان اور اپنے ہاتھ سے جہاد کیا۔ پس یہی شخص ہے جس کے لیے خدا کی رحمت اور دنیا و آخرت کی سعادت آگے بڑھے گی۔ اس کے بعد اپنے مرتبے کے لحاظ سے وہ شخص ہے، جس نے اللہ کے دین کو پہچانا اور (اپنے دل سے اور زبان سے) اس کی تصدیق کی پھر اس کے بعد وہ شخص ہے،

---

[1] احیاء علوم الدین: ۲/ ۳۵۰

اللّٰہ فسکت علیہ، فان رای من یعمل الخیر احبہ علیہ و ان رای من یعمل بباطل ابغضہ علیہ فذٰلک الذی ینجو علی ابطانہ کلہ[1]	جس نے اللہ کے دین کو پہچانا اور اس کے سلسلے میں خاموش رہا۔ وہ اگر کسی کو نیک کام کرتے دیکھتا ہے تو اس کی وجہ سے اس سے محبت کرتا ہے اور اگر کسی کو باطل کا ارتکاب کرتے دیکھتا ہے تو اس کی بنا پر اس سے نفرت کرتا ہے تو یہ بھی نجات پائے گا، کیوں کہ اس نے بھلائی سے محبت اور باطل سے دشمنی کو اپنے سینے میں چھپائے رکھا۔

اس میں شک نہیں کہ حق کے اظہار و اعلان کے لیے جان و مال کی بازی لگا دینا آسان نہیں ہے۔ اس کے لیے دین کے ساتھ بے پناہ محبت اور خلوص اور بڑے عزم و ہمت کی ضرورت ہے۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اربابِ عزیمت اور اصحابِ اخلاص ہی کا مقام اللہ تعالیٰ کی جناب میں سب سے اونچا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

الاَ لاَ یمنعنّ رجلا مهابة الناس ان یتکلم بالحق اذا علمه الا ان افضل الجهاد کلمة حق عند سلطان جائر[2]	سن لو کہ کسی شخص کو لوگوں کا خوف حق بات کہنے سے نہ روکے جب کہ وہ اس کو جانتا ہو، ہاں سن لو کہ سب سے زیادہ ثواب والا جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے کلمہ حق کہنا ہے۔

حدیث کا یہ فقرہ پہلے بھی گزر چکا ہے کہ ظالم فرماں روا کے سامنے کلمہ حق کا اظہار سب سے بڑا جہاد ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اظہارِ حق کے لیے آدمی جتنا بڑا خطرہ مول لے گا وہ اجر و ثواب کا اتنا ہی زیادہ مستحق ہوگا۔ سلطان جائر کے سامنے اظہارِ حق کو کیوں سب سے بڑا جہاد قرار دیا گیا ہے؟ اس کی وجہ علامہ خطابی نے ان الفاظ میں بیان کی ہے:

انما صار ذٰلک افضل الجهاد،	یہ سب سے زیادہ فضیلت والا جہاد اس لیے

---

1. رواہ البیہقی (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الادب، باب فی الامر بالمعروف والنہی عن المنکر)
2. مسند احمد: ۳/ ۳۹۶۔ وروی الترمذی غیر قولہ الاان افضل الجہاد الخ کتاب الفتن باب ما اخبر النبی اصحابہ بما ھو کائن الیٰ یوم القیٰمۃ

لأن من جاهد العدو وكان متردداً بين رجاء و خوف لاَ یدری هل یَغلِب او یُغلَب، و صاحب السلطان مقهور فی یده فهو اذا قال الحق و امره بالمعروف فقد تعرض للتلف و اهدف نفسه للهلاک فصار ذٰلک من افضل انواع الجهاد من اجل غلبة الخوف[1]

ہے کہ جو شخص دشمن سے جہاد کرتا ہے وہ امید اور خوف کے درمیان متردد ہوتا ہے۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ آیا غالب آئے گا یا مغلوب ہوگا (اس طرح جہاں اس کی زندگی کے ختم ہونے کا اندیشہ ہے وہاں اس کے بچنے کا بھی امکان ہے، اس کے برعکس جو شخص بادشاہ پر تنقید کرتا ہے وہ اس کے ہاتھ میں مجبور ہے۔ جب وہ اس کے سامنے حق کا اظہار کرے گا اور اس کو معروف کا حکم دے گا تو اپنی بربادی کے درپے ہوگا اور اپنے آپ کو ہلاکت کا نشانہ بنائے گا۔ اس طرح غلبۂ خوف کی وجہ سے یہ جہاد کی سب سے برتر قسم قرار پائی۔

یہ امت جس کو اللہ نے آخری بار امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ذمے داری سونپی ہے اور جسے اپنی اصلاح آپ کرنی ہے، حق گوئی و بے باکی کی شان دار تاریخ رکھتی ہے۔ اس میں جہاں اس کی مثالیں ملتی ہیں کہ لوگوں نے ضعفِ ایمان کے باعث منکر کو برداشت کیا اور معروف کا اظہار نہیں کیا، وہاں ایسی مثالیں بھی کم نہیں ہیں کہ اصحابِ عزیمت و اربابِ ہمت نے سینہ تان کر باطل کا مقابلہ کیا اور تلوار کی چھاؤں میں حق کی گواہی دی۔ یہی چیز اب تک اس امت کی زندگی کی ضامن رہی ہے۔ اگر کسی بھی دور میں یہ امت پوری کی پوری حق کے لیے قربانی اور بے خوفی کے جذبے سے خالی ہوجائے تو وہ اس کے انتہائی زوال اور پستی کا دور ہوگا۔ پھر وہ خدا کی رحمت سے دور ہوجائے گی اور کوئی چیز اس کو تباہی سے نہ بچا سکے گی۔ یہی بات نبی ﷺ کے اس ارشاد میں بیان کی گئی ہے:

اذا رأیت امّتی تهاب ان تقول — جب تم دیکھو کہ میری امت ظالم کو ظالم کہنے سے

---

[1] معالم السنن: ۴/ ۳۵۰

للظّالم یا ظالم فقد تودع منهم[1] | ڈر رہی ہے تو سمجھ لو کہ اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے (تاکہ اس کے درمیان معصیت پھیلتی رہے اور وہ اللہ کے عذاب میں گرفتار ہو جائے)۔

جان اور مال کی محبت 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کی راہ میں بالعموم سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوتی ہے۔ جان کس کو عزیز نہیں ہوتی اور مال سے کون بے نیاز ہے؟ آدمی یہ سوچ کر سہم جاتا ہے کہ اگر باطل کو باطل کہوں، خصوصاً اس وقت جب کہ وہ اقتدار کا مالک ہو اور جور و ظلم کے خلاف آواز اٹھاؤں، جب کہ ہر طرف اسی کی حکم رانی ہو، تو مجھے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اگر جسمانی موت سے بچ بھی جاؤں تو ہو سکتا ہے کہ معاشی موت واقع ہو جائے اور معاشی موت بعض پہلوؤں سے جسمانی موت سے بھی زیادہ سخت ہوتی ہے، لیکن یہ خوف اور ہراسانی مومن کی شان سے فروتر اور اس کے ایمان کی کم زوری کی دلیل ہے۔ زندگی اور اسباب زندگی دونوں اللہ کے ہاتھ میں ہیں، کسی انسان کے ہاتھ میں نہیں ہیں۔ حق کے اظہار میں خوف کھانا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ آدمی اپنی زندگی اور معاش کا مالک انسانوں کو سمجھتا ہے، یا کم سے کم اسے اللہ کی ذات پر وہ بھروسہ نہیں ہے جو فی الواقع ہونا چاہیے۔ اسی وجہ سے اللہ کے رسول ﷺ کا حکم ہے کہ جان و مال کے خطرات سے بے نیاز ہو کر معروف کا حکم دو اور منکر سے منع کرو۔ کیوں کہ یہی مومن کے ایمان کا تقاضا ہے:

یآیها الناس مروا بالمعروف وانهو عن المنکر قبل ان تدعوا الله فلا یستجیب لکم و قبل ان تستغفروه ولاَ یغفر لکم، ان الاَمر بالمعروف والنهی عن المنکر لاَ یدفع رزقا ولاَ یقرب اجلاً[2] | اے لوگو! تم معروف کا حکم دو اور منکر سے روکو، اس سے پہلے کہ تم اللہ کو پکارو اور وہ تمھاری پکار کا جواب نہ دے اور اس سے پہلے کہ تم اس سے معافی چاہو اور وہ تمھیں معاف نہ کرے، یقیناً امر بالمعروف و نہی عن المنکر نہ تو رزق کو دور کرتا ہے اور نہ موت کو قریب کرتا ہے۔

---

[1] رواہ الحاکم وقال صحیح الاسناد۔ الترغیب والترہیب: ۴/ ۱۶۳ [2] رواہ الاصبہانی (الترغیب والترہیب: ۳/ ۲۶۱) اسی مفہوم کا ایک خطبہ حضرت علیؓ سے بھی مروی ہے (دیکھئے تفسیر ابن کثیر: ۲/ ۷۴)

کسی دوسری برائی کے پیدا ہونے کا خطرہ

قدرت کے باوجود امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے پہلے آدمی کو اس کے متوقع نتائج پر بھی غور کرنا ہوگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک نیکی کو قائم کرنے کی کوشش میں دوسری نیکی ختم ہو جائے اور کسی چھوٹے سے منکر کو مٹانے کی فکر میں اس سے بڑا منکر وجود میں آجائے۔ علامہ عز الدین عبد الملک فرماتے ہیں: نہی عن المنکر بعض شرائط کے ساتھ واجب ہوتا ہے، ان میں سے ایک شرط ان ہی کے الفاظ میں یہ ہے:

ان یغلب علیٰ ظنه انه ان نهاه لاَ یلحقه مضرة ولاَ یزید المنهی عنه ایضًا فی منکراته متعنّتا لانکار[1]

اس فرض کے انجام دینے والے کو اس بات کا ظنِ غالب حاصل ہو کہ اگر وہ منکر کا ارتکاب کرنے والے کو منکر سے منع کرے گا تو اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور نیز جس کو منع کیا جا رہا ہے وہ اس کی تنقید کی وجہ سے اپنے منکرات میں قصداً آگے نہیں بڑھ جائے گا۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے سلسلے میں کسی غلط ردِ عمل کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں: ایک تو یہ کہ اس فرض کے انجام دینے والے کو کوئی نقصان پہنچے، دوسری صورت یہ کہ وہ خود تو اس سے محفوظ رہے، لیکن کوئی دوسری خرابی پیدا ہو جائے، مثلاً کوئی بے گناہ اور غیر متعلق شخص قتل ہو جائے، یا منکر کا ارتکاب کرنے والا مزید اپنے منکر پر اصرار کرنے لگے وغیرہ۔ جہاں تک ردِ عمل کی دوسری صورت کا تعلق ہے، علماء کا اتفاق ہے کہ اس صورت میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض انجام نہیں دینا چاہیے۔ پہلی صورت کے بارے میں ابھی تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے، البتہ بحث کی مناسبت سے یہاں اس کے ایک خاص پہلو کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ علامہ سعد الدین تفتازانی لکھتے ہیں:

---

[1] مبارق الازہار شرح مشارق الانوار: ۱/۵۰

منها (ای من شرائط الأمر بالمعروف و النهی عن المنکر) انتفاء مضرة و مفسدة اکثر من ذلک المنکر او مثله، وهذا فی حق الوجوب دون الجواز، حتی قالوا یجوزوان ظنّ انه یقتل ولاَ ینکی نکایة بضرب ونحوه لکن یرخص له السکوت[1]

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ جس منکر کو مٹانے کی کوشش کی جا رہی ہے اس سے بڑا یا اس جیسا ضرر اور فساد نہ پیدا ہو، لیکن یہ بات وجوب کے حق میں ہے جواز کے حق میں نہیں ہے۔ علماء نے یہاں تک کہا ہے کہ اگر کسی کو یہ خیال ہو کہ وہ قتل کر دیا جائے گا اور منکر کا ارتکاب کرنے والے کو کوئی معمولی نقصان تک نہیں پہنچا سکے گا جیسے زد و کوب وغیرہ بھی، اس کے لیے اس فرض کو انجام دینا جائز ہے۔ ہاں اس حالت میں اس کو اجازت ہے کہ خاموش رہے۔

امام غزالیؒ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ دعویٰ اتنے عموم کے ساتھ صحیح نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دین کے لیے جان دینا شہادت ہے اور شہادت ایک مسلمان کے لیے سب سے بڑی دولت ہے، لیکن مومن کو بہرحال یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ اپنی جان دے کر دین کو کوئی فائدہ پہنچا بھی رہا ہے یا نہیں؟ بے فائدہ محض جان دے دینا نہ دانش مندی ہے اور نہ کارِ ثواب۔ فرماتے ہیں:

ان یعلم انه یصاب بمکروه و لکن یبطل المنکر بفعله کما یقدر علی ان یرمی زجاجة الفاسق بحجر فیکسرها، و یریق الخمر، او یضرب العود الذی فی یده ضربة مختطفة فیکسره فی الحال، و یتعطل علیه هٰذا المنکر و لٰکن

احتساب کرنے والا اگر یہ جانتا ہو کہ اس کو تکلیف تو پہنچے گی، لیکن وہ اپنے عمل سے منکر کو مٹا سکتا ہے۔ مثلاً اس کو یہ طاقت ہے کہ کسی فاسق کا شراب سے بھرا ہوا گلاس توڑ دے اور اسے بہا دے یا اس کے ہاتھ میں ستار ہے تو اس پر اچانک ایسی ضرب لگائے کہ وہ فی الحال ٹوٹ جائے اور اس کے لیے بے کار ہو جائے، اس کے ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ فاسق اس

---

[1] شرح المقاصد: ۲/۱۸۰

يعلم انـه يرجع اليه فيضرب	پر پلٹ پڑے گا اور اس کے سر پر دے مارے
رأسـه، فهذا ليس بواجب و ليس	گا تو اس صورت میں احتساب نہ واجب ہے
بحرام بل هو مستحب[1]	اور نہ حرام، بلکہ مستحب اور پسندیدہ ہے۔

آگے چل کر امام غزالیؒ نے اس سلسلے میں مزید بحث کی ہے۔ ہم اپنے الفاظ میں ان کے خیالات کا خلاصہ پیش کرتے ہیں:

”اگر احتساب کرنے والے کو اس بات کا خطرہ ہے کہ اس کو مارا پیٹا جائے گا یا ہلاک کر دیا جائے گا تو وہ اپنے آپ کو اس خطرے میں ڈال کر احتساب کا فرض انجام دے سکتا ہے۔ یہ اس کے لیے نہ صرف یہ کہ جائز ہے، بلکہ مستحب ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ اس احتساب کا کوئی فائدہ ہو۔ مثلاً اس سے کوئی منکر مٹے یا منکر کا ارتکاب کرنے والے کا وقار اور حیثیت ختم ہو یا کم سے کم اس سے اہلِ ایمان کو تقویت حاصل ہو، لیکن اگر صورت ایسی ہے کہ ایک شخص شراب پینے کی تیاری کر رہا ہے اور ہاتھ میں تلوار لیے ہوئے ہے۔ حالات صاف بتا رہے ہیں کہ اگر اس پر تنقید کی جائے تو نہ صرف یہ کہ وہ تنقید کرنے والے کو ختم کر دے گا، بلکہ شراب بھی پی جائے گا۔ اس صورت میں احتساب کرنا ہمارے خیال میں صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ یہ محض اپنی ہلاکت ہے اور اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے، حالاں کہ مطلوب یہ ہے کہ دین کا فائدہ ہو اور آدمی قربانی دے کر اس کو بچائے۔ رہا بغیر کسی فائدے کے اپنے آپ کو ہلاکت کے لیے پیش کر دینا تو اس کے جواز کی کوئی وجہ نہیں ہے، بلکہ اسے حرام ہونا چاہیے۔ کسی بھی شخص کے لیے انکارِ منکر اسی

---

[1] احیاء علوم الدین: ۲/ ۳۴۷

وقت مستحب ہے جب کہ وہ منکر کے مٹانے پر قادر ہو یا اس کا کوئی دینی فائدہ متوقع ہو۔ یہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ پہنچنے والی تکلیف صرف احتساب کرنے والے کی ذات تک محدود رہے۔ لیکن اگر اس کو یہ پہلے سے معلوم ہو کہ منکر کا ارتکاب کرنے والا اس کے ساتھ اس کے کسی ساتھی، کسی رشتہ دار اور کسی رفیق کو ایذا پہنچائے گا تو اس کے لیے احتساب ناجائز ہی نہیں، بلکہ حرام ہوگا۔ کیوں کہ قدرت اس کا نام نہیں ہے کہ آدمی ایک منکر کو اس طرح مٹائے کہ اس سے دوسرا منکر وجود میں آجائے۔ اس سے آگے ہم یہ بھی کہیں گے کہ اگر محتسب کو یہ معلوم ہو کہ جس منکر پر وہ احتساب کر رہا ہے وہ تو مٹ جائے گا، لیکن اس کے نتیجے میں ایک دوسرا شخص کسی دوسرے منکر کا ارتکاب کر گزرے گا تو بظاہر صحیح بات یہ ہے کہ اس کو احتساب نہیں کرنا چاہیے۔ کیوں کہ مقصد یہ نہیں ہے کہ کوئی خاص فرد منکر کا ارتکاب نہ کرے، بلکہ یہ ہے کہ مطلقاً منکر وجود میں آئے۔ ..... انسان جس منکر کو مٹانا چاہتا ہے اور وہ منکر جو اس کے نتیجے میں پیدا ہوسکتا ہے، ان دونوں کے درجات میں فرق کے بعد مناسب اقدام کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص کسی کی بکری ذبح کر کے کھانا چاہتا ہے، اگر اس پر احتساب کرنے والے کو یہ معلوم ہو کہ اس کو اس منکر سے روکنے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ کسی انسان کو ذبح کر کے کھا جائے گا تو ظاہر ہے کہ اس وقت احتساب کا فرض انجام دینا بہت ہی نامعقول ہوگا۔ اس کے برعکس ایک شخص کسی انسان کو ذبح کرنے جا رہا ہے یا اس کا کوئی عضو کاٹنا چاہتا ہے، اگر احتساب کرنے والے کو یہ

معلوم ہو کہ احتساب کے نتیجے میں وہ اس کو چھوڑ دے گا اور اس کے مال پر قبضہ کرلے گا تو اس وقت بلاشبہ جواز کی صورت نکل سکتی ہے۔ اس طرح کے تمام معاملات میں محتسب کو اجتہاد سے کام لینا چاہیے، کیوں کہ اس کے لیے کوئی ایک حکم اور لگا بندھا ضابطہ وضع نہیں کیا جاسکتا۔" [1]

امام ابنِ قیم نے اس مسئلہ کا بڑا اچھا تجزیہ کیا ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر بہت نفیس بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے انکارِ منکر کو امت پر اس لیے واجب قرار دیا ہے کہ اس کے ذریعے معروف، جو اللہ اور اس کے رسولؐ کے نزدیک پسندیدہ ہے، حاصل ہوسکے، لیکن اگر کسی منکر پر نکیر کی وجہ سے کوئی ایسا منکر لازم آجائے جو اللہ اور اس کے رسولؐ کے نزدیک اس سے زیادہ مبغوض اور ناپسندیدہ ہو، تو انکارِ منکر کی اجازت نہیں ہے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں:

انکار المنکر اربع درجات: الأُولٰی ان یزول و یخلفه ضده، الثانیة: ان یقلّ وان لم یزل بجملته، الثالثة: ان یخلفه ماهو مثله، الرابعة: ان یخلفه ما هو شر منه، فالدرجتان الاّ ولیان مشروعتان و الثالثة موضع اجتهاد والرابعة محرمة۔

انکارِ منکر کے چار درجے ہیں: پہلا درجہ یہ ہے کہ منکر زائل ہوجائے اور اس کی جگہ معروف قائم ہو جائے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ منکر کم ہو جائے، خواہ وہ پوری طرح زائل نہ ہو۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ وہ منکر تو مٹ جائے جس پر نکیر کی جا رہی ہے، لیکن اس کی جگہ اسی حیثیت کا ایک دوسرا منکر آجائے۔ چوتھا درجہ یہ ہے کہ منکر کے مٹنے کے بعد اس سے بدتر منکر پیدا ہوجائے۔ پہلے دونوں درجے مشروع ہیں۔ تیسرے درجے کے سلسلے میں اجتہاد کرنا ہوگا اور چوتھا درجہ حرام ہے۔

اس کے بعد امام موصوف نے اس کی مزید تفصیل کی ہے۔ فرماتے ہیں:

---

[1] احیاء علوم الدین: ۲/ ۳۴۷، ۳۴۸

"اگر فساق و فجار شطرنج کھیل رہے ہوں یا لہو لعب میں مصروف ہوں یا گانا سن رہے ہوں تو محض اس سے ان کو روک دینا عقل مندی اور سوجھ بوجھ کی بات نہیں ہوگی۔ ہاں اگر آپ ان کو اس کام سے ہٹا کر اس سے بہتر کسی ایسے کام میں لگا سکیں جو خدا اور رسولؐ کو پسندیدہ ہے، جیسے تیر اندازی اور گھڑ دوڑ وغیرہ، تو ان پر نکیر کرنا صحیح ہوگا۔ کیوں کہ اگر وہ خالی ہوں گے تو اس وقت جن منکرات کا ارتکاب کر رہے ہیں ان سے بھی بڑے منکرات کا ارتکاب کریں گے اور موجودہ مصروفیت ان کو اس سے روکے ہوئے ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص فحش اور عریاں کتابوں کا مطالبہ کرتا ہے اور آپ کو ڈر ہے کہ اگر اس کو اس سے منع کیا جائے تو وہ ایسی کتابیں دیکھنے لگے گا جن میں بدعت اور ضلالت بھری ہوئی ہے تو اس پر نکیر نہ کیجیے اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیجیے، کیوں کہ گندی کتابوں سے اس کے صرف اخلاق خراب ہو رہے ہیں، لیکن جن کتابوں میں بدعت اور ضلالت ہے ان سے اس کے ایمان ہی کے بگڑنے کا اندیشہ ہے۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ تاتاریوں کے زمانہ میں میرا اور میرے بعض ساتھیوں کا ایک ایسی جگہ سے گزر ہوا جہاں چند تاتاری شراب پی رہے تھے۔ یہ دیکھ کر میرے ساتھیوں نے ان پر نکیر کی تو میں نے ان کو منع کیا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے شراب کو اس لیے حرام قرار دیا ہے کہ وہ اس کے ذکر اور نماز سے روکتی ہے، لیکن ان لوگوں کے حق میں شراب بہت اچھا کام انجام دے رہی ہے، کیوں کہ وہ ان کو لوگوں کو قتل کرنے، بچوں کو قید کرنے اور مال لوٹنے سے روکتی ہے، اس لیے ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو اور شراب پینے دو۔"[1]

---

[1] اعلام الموقعین: ۳/ ۱۲، ۱۳

عدمِ افادیت کا یقین

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کے نتیجے میں انسان کو نقصان پہنچنے یا کسی دوسرے منکر کے پیدا ہونے کا اندیشہ تو نہیں ہوتا، لیکن وہ اس کی کوئی افادیت نہیں محسوس کرتا۔ اس صورت میں بعض حضرات کا خیال ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر واجب اور ضروری ہے[1] امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ انسان کی ذمے داری صرف یہ ہے کہ معروف کا حکم دے اور منکر سے منع کرے، دوسروں کے قبول کرنے یا نہ کرنے کی ذمے داری اس پر عائد نہیں ہوتی۔ چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

قال العلماء ولاَ یسقط عن المکلف الاَمر بالمعروف و النھی عن المنکر لکونہ لاَ یفید فی ظنہ، بل یجب علیه فعله، فان الذکری تنفع المومنین، و قد قدمنا ان الذی علیہ الاَمر و النھی لاَ القبول کما قال اللّٰہ عز و جل مَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا البَلَاغُ[2]	علماء نے کہا ہے کہ ایسے شخص سے جو مکلف ہو، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا وجوب اس وجہ سے ساقط نہیں ہوتا کہ اس کے خیال میں وہ غیر مفید ہے، بلکہ اس کے لیے (امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو بے فائدہ خیال کرنے کے باوجود) اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔ کیوں کہ نصیحت مومنوں کو فائدہ دیتی ہے۔ ہم (اس سے پہلے) بیان کر چکے ہیں کہ انسان کا فرض صرف امر و نہی ہے، یہ نہیں ہے کہ دوسرا اس کو قبول بھی کرلے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ رسولؐ کی ذمے داری دین کو صرف پہنچانا ہے (اسے منوانا یا اس پر عمل کرانا نہیں ہے)

امام نوویؒ کے بیان سے بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ عدمِ افادیت کے یقین کے باوجود علماء کے نزدیک 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' واجب ہے، لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ کیوں کہ بالعموم علماء نے یہی لکھا ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے نتیجے میں کسی غلط ردِعمل اور نقصان کا اندیشہ نہ بھی ہو تو وہ کسی مسلمان پر اسی وقت

---

[1] التشریع الجنائی الاسلامی: ۱/۴۹۸
[2] شرح مسلم: المجلد الاوّل، الجزء ۲، ص ۲۰

فرض ہوگا جب کہ اس کی افادیت کا اسے یقین ہو۔ اگر وہ اس کو غیر مفید اور عبث خیال کرتا ہے تو اس کا وجوب بھی باقی نہیں رہے گا۔ چناں چہ علامہ عز الدین عبد الملک نے 'نہی عن المنکر' کے وجوب کی جو شرطیں بیان کی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے:

ان يغلب على ظنه ان نهيه مؤثر لاَ عبث[1]

اس کو اس بات کا ظنِ غالب حاصل ہو کہ اس کا منع کرنا موثر ہوگا، عبث نہ ہوگا۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ انسان اگر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کوئی فائدہ نہ محسوس کرتا ہو تو وہ اس پر فرض نہیں ہوگا، البتہ اس کا استحباب اس کے لیے باقی رہے گا۔ کیوں کہ جس شخص کی روش پر وہ احتساب کر رہا ہے وہ اپنی روش سے باز آئے یا نہ آئے، اس کا یہ فائدہ تو بہر حال ہے کہ اس سے دین کا برملا اظہار ہوتا ہے اور دوسروں کو شریعت سے واقفیت بہم پہنچتی ہے۔ امام غزالیؒ کے الفاظ یہ ہیں:

ان يعلم انه لاَ يفيد انكاره لكنه لاَ يخاف مكروها فلا تجب عليه الحسبة لعدم فائدتها، و لٰكن تستحب لإظهار شعائر الاِسلام و تذكير الناس بأمر الدين[2]

احتساب کرنے والا اگر یہ جانتا ہے کہ اس کا احتساب کرنا غیر مفید ہے، لیکن اس کو کسی تکلیف کے پہنچنے کا ڈر نہیں ہے، تو اس کے لیے احتساب ضروری نہیں ہے، کیوں کہ اس کی کوئی افادیت نہیں ہے۔ البتہ شعائر اسلام کے اظہار اور لوگوں کو امور دین کی تذکیر کی غرض سے یہ مستحب اور پسندیدہ ہے۔

جس خاص معاملہ میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض انجام دیا جاتا ہے اس میں اس کی عدم افادیت کے باوجود، چوں کہ اس سے شعائرِ دین کو نمایاں کرنے اور لوگوں کو نصیحت کرنے کا موقع ملتا ہے، اس وجہ سے امام غزالیؒ اور ان کے ہم خیال اصحاب کے نزدیک وہ مستحب ہے۔ لیکن بعض اصحاب اسی دلیل کی بنا پر اس کو واجب قرار دیتے ہیں، کیوں کہ شعائر دین کا اظہار اور تذکیر خود بھی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ایک اہم مقصد ہے اور جب یہ مقصد حاصل ہو رہا ہے تو ہم اسے سعی لا حاصل نہیں

---

[1] مبارق الازہار فی شرح مشارق الانوار: ۱/ ۵۰
[2] احیاء علوم الدین: ۲/ ۳۴۷

کہہ سکتے۔ اس کے جواب میں علامہ سعد الدین تفتازانی فرماتے ہیں کہ اس میں شک نہیں کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے دین کا وقار بلند ہوتا ہے، لیکن کبھی اس سے دین کو نقصان بھی پہنچ سکتا ہے، اس لیے ہر حال میں اس کو واجب کہنا صحیح نہیں ہے۔ چناں چہ علامہ موصوف اس کے وجوب کی شرائط کے ذیل میں لکھتے ہیں:

منها تجويز التاثير بان لاَ يعلم عدم التاثير قطعًا لئلا يكون عبثًا و اشتغالاً بما لاَ يعنى، فان قيل يجب وان لم يوثر اعزازًا للدين قلنا ربما تكون اذلالاً[1]

اس کے وجوب کی ایک شرط یہ ہے کہ اس کے موثر ہونے کا خیال ہو، اس طرح کہ اس کام کے کرنے والے کو اس کے غیر موثر ہونے کا قطعی یقین نہ ہوجائے، تاکہ وہ کارِ عبث اور بے فائدہ مشغولیت ہوکر نہ رہ جائے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ غیر موثر ہونے کے باوجود دین کے اعزاز کی خاطر ضروری ہے تو ہمارا جواب یہ ہے کہ بسا اوقات اس میں دین کی تذلیل بھی ہے۔

افادیت کا ایک امکان

'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کی افادیت و عدمِ افادیت کا جب ذکر کیا جاتا ہے تو بالعموم اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس وقت معروف کا حکم دیا گیا وہ وجود میں آیا نہیں؟ یا جس وقت منکر سے منع کیا گیا وہ ختم ہوا یا نہیں؟ لیکن اس پر ایک اور پہلو سے بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ کوئی مسلمان امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فوری اثر قبول کرے یا نہ کرے، لیکن اس سے وہ غیر شعوری طور پر کسی نہ کسی حد تک متاثر ضرور ہوتا ہے، ہوسکتا ہے کہ یہی تاثر بعد میں اس کے منکر کو ترک کرنے اور معروف پر عمل کرنے کا سبب بن جائے۔ کیوں کہ ترکِ معروف اور ارتکابِ منکر خود اس کے نزدیک بھی کارِ ثواب نہیں ہے، بلکہ اس کو وہ اپنے فکر و عقیدہ کے لحاظ سے غلط سمجھتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے وہ اصلاح کو قبول نہیں کر رہا ہے تو یہ اس کا کوئی سنجیدہ فیصلہ نہیں، بلکہ محض ایک جذباتی اور ہنگامی ردِّ عمل بھی ہوسکتا ہے، اس لیے توقع یہی ہے کہ اس ردِّ عمل

---

[1] شرح المقاصد: ۲/ ۱۸۰

کے کم زور پڑنے پر وہ اپنے رویہ پر نظر ثانی بھی کرسکتا ہے اور اس کی زندگی کے سنور نے کا بھی امکان ہے۔ اس پہلو سے اگر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی افادیت فوری طور پر نہ ظاہر ہو پھر بھی اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ امام محمد نے اسی پہلو سے اس مسئلہ پر غور کیا ہے اور اس کی خوبی یہی ہے کہ اس میں امتِ مسلمہ کی نفسیات کی پوری رعایت کی گئی ہے۔ فرماتے ہیں:

وفی الأمر بالمعروف و النهی عن المنکر یسعه الأقدام وان کان یعلم ان القوم یقتلونه وانه لاَ یتفرق جمعهم بسببه لأن القوم هناک مسلمون معتقدون لما یامرهم به فلا بد من ان فعله ینکئ فی قلوبهم و ان کانوا لاَ یظهرون ذٰلک[1]

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے سلسلے میں ایک مسلمان کو اس حال میں بھی اقدام کی گنجائش ہے، جبکہ وہ جانتا ہو کہ لوگ اس کو قتل کردیں گے اور خود اس کی وجہ سے ان کی جمعیت منتشر نہیں ہوگی۔ کیوں کہ یہاں لوگ مسلمان ہیں اور جن باتوں کا وہ ان کو حکم دے رہا ہے وہ ان پر اعتقاد رکھتے ہیں، اس لیے لازماً اس کا عمل ان کے دلوں پر اثر انداز ہوگا، خواہ وہ اس کا اظہار نہ کرتے ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان کے درمیان 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' کے دو ردِ عمل متوقع ہیں۔ ایک تو وہ ردِ عمل ہے جس کے فوراً ظاہر ہونے کا امکان ہے اور دوسرا وہ ردِ عمل ہے جس کے ظاہر ہونے میں کچھ مدت لگ سکتی ہے۔ فوری ردِ عمل ان مخصوص حالات کا نتیجہ ہوتا ہے جن میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ انجام پاتا ہے۔ ان حالات میں افراد ہوں یا جماعتیں، بالعموم نیکی سے دور ہوتی ہیں اور بدی کی طرف ان کا رجحان بڑھ جاتا ہے۔ ان میں منکر کو چھوڑنے اور معروف کو قبول کرنے کے لیے آمادگی نہیں ہوتی، بلکہ بعض اوقات وہ منکر کے خلاف اور معروف کے حق میں کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ ان حالات میں جہاں اس کا امکان ہے کہ معروف قائم ہو اور منکر مٹ جائے، وہاں اس کا بھی زبردست خطرہ ہے کہ اس فرض کا انجام دینے والا اپنی جان تک دے دے، لیکن اس کے باوجود نہ تو معروف قائم ہو اور نہ منکر مٹے۔ دوسرا

---

[1] شرح السیر الکبیر: ۳/ ۲۳۹-۲۴۰

ردِعمل ان حالات کے ختم ہونے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس وقت اس فرد یا جماعت کو سنجیدگی سے سوچنے کے زیادہ مواقع حاصل ہوتے ہیں، جنھیں معروف کی دعوت دی گئی تھی یا منکر سے منع کیا گیا تھا۔ یہ ردِعمل بالعموم ایک مسلمان فرد یا گروہ پر بہت ہی صالح اور مفید ہوتا ہے۔ اگر کوئی فاسق مسلمان کسی مبلغ دین کی گردن اڑا بھی دے تو اس کا سینہ اس احساس سے خالی نہیں ہوسکتا کہ اس نے اپنے ایک خیر خواہ اور ناصح کے ساتھ وہ سلوک کیا جو کسی دشمن ہی کے ساتھ روا رکھا جاسکتا ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ یہی احساس دین کی طرف اس کی رغبت کا سبب بن جائے۔ اگر وہ خود دین کی طرف راغب نہ بھی ہو تو بہت ممکن ہے کہ تبلیغ و اصلاح کی اس کوشش سے بہت سے وہ لوگ فائدہ اٹھالے جائیں جو گو فسق و معصیت میں اس کے شریک ہیں، لیکن ابھی ان میں قبولِ حق کی صلاحیت موجود ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا ہے کہ کسی دور اور کسی خطہ میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض انجام پایا ہو اور پوری کی پوری قوم اس کے پاکیزہ ثمرات سے محروم رہ گئی ہو۔ اس لیے کسی خاص وقت یا کچھ مخصوص حالات میں اگر اس کی افادیت محسوس نہ ہو تو مستقبل میں بھی اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کیوں کہ آج امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی کوشش بار آور نہیں ہو رہی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آئندہ بھی اس کے نتیجہ خیز ہونے کی توقع نہیں ہے، بلکہ ہوسکتا ہے کہ جو کوشش آج بالکل بے نتیجہ معلوم ہو رہی ہے، ایک لمبی مدت کے بعد اس کے نتائج ظاہر ہوں۔
اس میں شک نہیں کہ ایسے حالات میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض انجام دینا، جب کہ بظاہر اس کے کامیاب ہونے کی توقع بھی نہ کی جاسکے، ہر کس و ناکس کے لیے ممکن نہیں ہے۔ جب ماحول اس قدر ناسازگار ہو کہ لوگوں کو اللہ کے دین پر ثابت قدم رہنا ہی دشوار ہو رہا ہو تو ان کے لیے یہی بہت ہے کہ وہ اپنے دین و ایمان کی حفاظت کریں، ان پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا بوجھ ڈالنا صحیح نہ ہوگا، لیکن اگر خواص بھی اس سے آگے نہ بڑھیں تو یہ ان کا اپنی صلاحیتوں کے ساتھ ظلم ہوگا۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی اہمیت، جبکہ بروقت اس کی افادیت کا امکان نہ ہو

رسولِ اکرم ﷺ کی احادیث سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے، کیوں کہ دو طرح کی حدیثیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ایک طرف تو وہ حدیثیں ہیں جن میں اس بات کی اجازت ہے کہ بگڑے ہوئے حالات میں آدمی گوشہ گیر ہو جائے اور 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کو چھوڑ دے۔ دوسری طرف وہ حدیثیں ہیں جن میں ان لوگوں کی تعریف کی گئی ہے جو معاشرے کے بگاڑ سے گھبرا کر اس سے کٹ نہیں جاتے، بلکہ اس میں رہ کر اصلاح کے فرائض انجام دیتے ہیں، تاکہ جن لوگوں میں قبولِ حق کی صلاحیت ہے، آج نہیں کل ان کی زندگی سنور جائے اور وہ راہِ راست پر آجائیں۔ یہاں پہلے ایسی تین حدیثیں پیش کی جا رہی ہیں، جن میں اس بات کی صراحت ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض اس وقت ساقط ہو جاتا ہے جب کہ اس کی کوئی افادیت نہ محسوس ہو۔

(۱) ائتمروا بالمعروف و تناهوا عن المنكر حتى اذا رايت شحاً مطاعا وهوى متبعًا ودنيا موثرة و اعجاب كل ذى راى برايه فعليك بخاصة نفسك ودع العوام[1]

تم ایک دوسرے کو معروف کا حکم دو اور منکر سے منع کرو، لیکن جب تم دیکھو کہ بخل کی اطاعت کی جاتی ہے، خواہش کی پیروی ہو رہی ہے، دنیا کو آخرت پر ترجیح حاصل ہے اور ہر صاحبِ رائے اپنی رائے میں مست ہے (قطعِ نظر اس سے کہ شریعت کا اس کے بارے میں کیا حکم ہے) تو تم صرف اپنی ذات کی فکر کرو اور عوام کو چھوڑ دو۔

بعض روایات میں ان الفاظ کا اضافہ بھی موجود ہے:

و رأيت امرًا لا يدان لك به[2] یعنی جب حالات ایسے ہو جائیں کہ ان کے مقابلے کی تم میں طاقت نہ رہے تو تم امر بالمعروف ونہی عن المنکر چھوڑ سکتے ہو۔

---

۱ ترمذی، کتاب التفسیر (سورۃ المائدۃ)، ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب الامر والنہی

۲ ابن ماجہ، ابواب الفتن، باب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر

(۲) یوشک ان یاتی زمان یغربل الناس فیه غربلة، تبقی حثالة من الناس قد مرجت عهودهم و اماناتهم واختلفوا فکانوا ھٰکذا، و شبک بین اصابعه، فقالوا کیف بنا یا رسول اللّٰه؟ فقال تاخذون ماتعرفون وتذرون ما تنکرون و تقبلون علیٰ امر خاصتکم و تذرون امر عامتکم[1]

ایک زمانہ جلد ہی آنے والا ہے جس میں انسان چھلنی میں چھان دیے جائیں گے اور ذلیل اور کمینے لوگ رہ جائیں گے۔ ان کے عہد و پیمان بگڑ جائیں گے اور امانتوں میں خیانت ہونے لگے گی (ان کے برے اور بھلے) آپس میں اس طرح مل جائیں گے۔ آپؐ نے اپنی انگلیوں کو آپس میں ملاکر دکھایا (یعنی ان کے درمیان تمیز کرنا دشوار ہوجائے گا) صحابہؓ نے عرض کیا: اس وقت ہم کیا کریں؟ آپؐ نے فرمایا: جس چیز کو تم معروف سمجھتے ہو اسے پکڑے رہو اور جس چیز کو منکر خیال کرتے ہو اسے چھوڑ دو، اپنے خواص کی روش اختیار کرو اور عوام کے معاملات سے نظر پھیر لو۔

(۳) عن انس بن مالک قال قیل یا رسول اللّٰه متی ندع الائتمار بالمعروف و النهی عن المنکر؟ قال اذا ظهر فیکم ما ظهر فی بنی اسرائیل، اذا کانت الفاحشة فی کبارکم و الملک فی صغارکم و العلم فی رذالکم[2]

انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ نبیؐ سے پوچھا گیا کہ کن حالات میں ہم ایک دوسرے کو معروف کا حکم دینا اور منکر سے منع کرنا چھوڑ دیں۔ آپؐ نے جواب دیا: اس وقت جب کہ تمھارے اندر بھی وہ خرابیاں ظاہر ہونے لگیں جو بنی اسرائیل میں ظاہر ہوئی تھیں، یعنی زنا اور بے حیائی تمھارے بڑوں میں، سلطنت اور حکومت تمھارے چھوٹوں میں اور علم تمھارے فاسقوں اور فاجروں میں۔

یہ احادیث اپنے مفہوم میں بہت ہی واضح ہیں، لیکن یہاں ہمیں اس حقیقت کو نہیں بھولنا چاہیے کہ ان میں جو حالات بیان ہوئے ہیں وہ یا اس نوعیت کے حالات جہاں کہیں بھی پیدا ہوں وہاں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض انجام نہ دینا محض جواز

---

[1] ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب الامر والنہی۔ ابن ماجہ، ابواب الفتن، باب التثبت فی الفتنۃ۔ مسند احمد: ۲/ ۲۲۱

[2] مسند احمد: ۴/ ۳۵۔ ابن ماجہ، ابواب الفتن، باب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر

کی حیثیت رکھتا ہے، فرض یا مستحب کی نہیں۔ چناں چہ پہلی حدیث کے سلسلے میں علامہ ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں:

یعنی و اللّٰہ اعلم اذا لم یقبلوا ذٰلک و اتبعوا أھواء ھم واٰراء ھم فانت فی سعۃ من ترکھم[1]	یعنی جب وہ حق کو قبول نہ کریں اور اپنی خواہشات کے پیچھے چلنے لگیں تو تمھارے لیے گنجائش ہے کہ تم ان کو چھوڑ دو۔

دوسری حدیث کے بارے میں ابوداؤد کے ہندستانی شارح مولانا محمد اشرف عظیم آبادی فرماتے ہیں:

ھٰذا رخصۃ فی ترک الاَمر بالمعروف و النھی عن المنکر اذا کثر الاَشرار وضعف الاَخیار[2]	یہ رخصت ہے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو چھوڑ دینے کی، جب کہ بروں کی تعداد بہت بڑھ جائے اور نیک لوگ کم زور ہوجائیں۔

تیسری روایت کے ہم معنی ایک روایت نقل کرنے کے بعد علاّمہ سعد الدین تفتازانی نے لکھا ہے:

الحدیث فلا یدل الاَ علی نفی الوجوب عند فوات الشرط بلزوم المفسدۃ وانتفاء الفائدۃ[3]	حدیث صرف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر اس وقت واجب نہ ہوگا جب کہ اس کی شرط نہ پائی جائے، یعنی اس سے بگاڑ لازم آئے اور کوئی فائدہ نہ رہے۔

جب حالات اس قدر بگڑ جائیں کہ گوشہ گیر ہوئے بغیر آدمی کے لیے اپنے دین و ایمان کی حفاظت دشوار ہو جائے تو اسے اس کی بھی اجازت ہے کہ معاشرے سے تعلقات ختم کر دے اور گوشہ گیر ہوجائے، کیوں کہ ایمان کو بچانا ہر چیز پر مقدم ہے۔ اس کے لیے دنیا کی ہر چیز چھوڑی جاسکتی ہے، لیکن کسی بھی مقصد کے لیے اسے نہیں چھوڑا جاسکتا۔ یہی وہ وقت ہے جب کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض ساقط ہو جاتا ہے۔

---

[1] احکام القرآن: ۲/۴۱ [2] عون المعبود: ۴/۲۱۷

[3] شرح المقاصد: ۳/۱۸۰

لیکن جو افراد قوموں کی اصلاح کے لیے پیدا ہوتے ہیں وہ صرف فرائض و واجبات ہی کی تکمیل پر قانع نہیں ہوتے، بلکہ وہ ان سے آگے کے کام بھی انجام دیتے ہیں۔ وہ اپنی فکر ہی نہیں کرتے، بلکہ دوسروں کو بھی بچانا چاہتے ہیں۔ ان کے لیے گوشہ گیری اور عزلت کی اجازت ہوتی ہے، لیکن وہ اس کو قبول نہیں کرتے۔ کیوں کہ اگر وہ بھی فساد سے گھبرا کر میدان چھوڑ دیں تو دنیا میں نہ کبھی معروف قائم ہوگا اور نہ منکر کے خلاف آواز بلند ہوگی۔ دورِ فتن میں انسان اپنے دین کی حفاظت کے لیے معاشرے سے کٹ جائے تو اس میں شک نہیں کہ یہ اس کے لیے صحیح ہوگا۔ کیوں کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ابھی سینہ میں ایمان کی محبت موجود ہے، لیکن احادیث میں اس سے اونچا مقام یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کیا جائے، تاکہ باطل مٹے اور حق زندہ ہے۔ اس نوعیت کی بھی تین حدیثیں یہاں نقل کی جاتی ہیں، ان میں سے پہلی حدیث ہے:

۱- من خیر معاش الناس رجل ممسک عنان فرسه فی سبیل اللّٰه یطیر علٰی متنه کلما سمع هیعة او فزعة طار علیه یبتغی القتل والموت مظانه، او رجل فی غنیمة فی رأس شعفة من هٰذه الشعف او بطن واد من هٰذه الأودیة یقیم الصلٰوة و یوتی الزکوٰة و یعبد ربه حتی یاتیه الیقین، لیس من الناس الّا فی خیر[۱]

لوگوں کی بہترین حالتِ زندگی یہ ہے کہ آدمی اللہ کے راستے میں اپنے گھوڑے کی لگام کو تھامے ہوئے ہے۔ اس پر سوار ہوکر اڑ جاتا ہے۔ جب کبھی وہ دشمن کی آمد کے وقت لوگوں کی آواز سنتا ہے یا ان میں خوف اور گھبراہٹ محسوس کرتا ہے وہ اس پر اڑتا ہے اور قتل اور موت کو اس کے خاص مواقع پر (یعنی میدان جنگ کے بیچ میں) تلاش کرتا ہے۔ یا وہ شخص جو اپنی چند بکریوں کے ساتھ پہاڑ کی ان چوٹیوں میں سے کسی ایک پر یا ان وادیوں میں سے کسی ایک وادی میں جابسا ہے، وہاں وہ نماز قائم کرتا ہے، زکوٰۃ دیتا ہے اور اپنے رب کی عبادت کرتا ہے، یہاں تک کہ اسی حالت میں اس کی موت آجاتی ہے۔ لوگوں سے اس کے تعلقات بس بھلائی کے ساتھ ہیں۔

---

[۱] مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضل الجهاد والرباط، ابن ماجہ، ابواب الفتن، باب العزلة

اس حدیث کے بارے میں یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ اس میں مجاہد فی سبیل اللہ اور دامنِ کوہ میں گوشہ گیر ہو جانے والے کو ایک حیثیت دے دی گئی ہے۔ ظاہر ہے، یہ خلاف عدل و انصاف ہوگا، جس کی توقع اللہ اور اس کے رسولؐ سے نہیں کی جاسکتی۔ چناں چہ اسی مضمون کی ایک اور حدیث ہے، جو اس سے گو مختصر ہے، لیکن اس میں صراحت ہے کہ افضل اور اعلیٰ مقام جہاد کا ہے اور اس کے بعد ایمان کی حفاظت کے لیے ترک دنیا اور گوشہ نشینی کا:

عن ابی سعید الخدری قال قیل یا رسول اللّٰہ ای الناس افضل؟ فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: مومن یجاھد فی سبیل اللّٰہ بنفسہ و مالہ قالوا ثم من؟ قال: مومن فی شعب من الشعاب یتقی اللّٰہ ویدع الناس من شرہ[1]

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے۔ انھوں نے کہا: رسولؐ اللہ سے پوچھا گیا کہ لوگوں میں کون شخص سب سے زیادہ فضیلت والا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: وہ مومن جو اللہ کی راہ میں اپنی جان اور مال سے جہاد کرتا ہے۔ لوگوں نے پوچھا: اس کے بعد کس کا مقام ہے؟ آپؐ نے فرمایا: وہ مومن جو پہاڑ کی گھاٹیوں میں سے کسی گھاٹی میں ہے، اللہ سے ڈرتا ہے اور لوگوں کو اپنے شر سے دور رکھے ہوئے ہے۔

دوسری حدیث ہے:

المومن القوی خیر و احبّ الی اللّٰہ من المومن الضعیف، وفی کل خیر[2]

طاقت ور مومن زیادہ اچھا اور اللہ کے نزدیک زیادہ محبوب ہے اس مومن کے مقابلے میں جو کم زور ہے، لیکن ہر ایک میں بھلائی ہے۔

اس حدیث کی شرح امام نوویؒ نے ان الفاظ میں کی ہے:

المراد بالقوۃ ھنا عزیمۃ النفس و القریحۃ فی امور الاٰخرۃ، فیکون

قوت سے مراد یہاں آخرت کے معاملات میں عزمِ نفس اور طبیعت کی مضبوطی ہے۔

---

۱ بخاری، کتاب الجہاد، باب افضل الناس مومن مجاہد بنفسہ ومالہ فی سبیل اللّٰہ ورواہ مسلم فی کتاب الامارۃ و ابوداؤد والترمذی والنسائی فی ابواب الجہاد وابن ماجہ فی ابواب الفتن

۲ مسلم، کتاب القدر، باب الایمان بالقدر والاذعان لہ۔ ابن ماجہ، المقدمۃ، باب فی القدر

صاحب هذا الوصف اکثر اقداماً علی العدو فی الجهاد و اسرع خروجا الیه و ذهابًا فی طلبه و اشد عزیمة فی الاَمر بالمعروف و النهی عن المنکر و اصبر علی الاذٰی فی کل ذلک واحتمال المشاق فی ذات اللّٰه تعالیٰ و الراغب فی الصلوٰة و الصوم و الاَذکار و سائر العبادات و انشط طلبا لها ومحافظة علیهـا ونحوذلک، واما قوله صلی اللّٰه علیه وسلم و فی کلٍّ خیر فمعناه فی کلٍّ من القوی و الضعیف خیر لاِشتراکهما فی الاِیمان مع ما یاتی به الضعیف من العبادات[1]

جس کے اندر یہ خوبی ہوگی وہ جہاد میں دشمن کی طرف زیادہ اقدام کرے گا، اس کی طرف نکلنے اور اس کی تلاش میں زیادہ تیز ہوگا، معروف کا حکم دینے اور منکر سے روکنے اور ان سب کے سلسلے میں جو تکلیف پہنچے اس پر صبر کرنے اور اللہ کی راہ میں مشقت کو برداشت کرنے میں زیادہ مضبوط عزم والا ہوگا۔ اسی طرح وہ نماز، روزہ، اذکار اور تمام عبادات کی طرف زیادہ راغب ہوگا، نشاطِ قلب کے ساتھ ان کو ادا کرے گا اور ان کی محافظت کرے گا وغیرہ۔ رہا نبی ﷺ کا یہ فرمانا کہ ہر ایک میں بھلائی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ مومن قوی اور مومن ضعیف دونوں میں بھلائی ہے، کیوں کہ دونوں میں ایمان مشترک ہے۔ اس کے ساتھ ضعیف عبادات بھی انجام دیتا ہے (گو وہ اور کام نہ کرسکے)

اس سلسلے کی تیسری حدیث ہے:

المومن الـذی یخالط الناس و یصبر علٰی اذاهم، اعظم اجـرًا من الـذی لاَ یخالطهم ولاَ یصبر علیٰ اذاهم[2]

وہ مومن جو لوگوں سے ملتا ہے اور ان کی ایذا رسانی پر صبر کرتا ہے اس کا اجر بہت بڑا ہے اس مومن کے اجر سے جو نہ ان سے ملتا ہے اور نہ ان کی ایذا رسانی پر صبر کرتا ہے۔

اس حدیث کی شرح میں علامہ محمد بن اسماعیل الصغانی لکھتے ہیں:

---

[1] شرح مسلم، المجلد الثامن، الجزء ۱۶، ص ۱۷۵-۱۷۶

[2] مسند احمد: ۲/۱۳۵۔ ابن ماجہ، ابواب الفتن، باب الصبر علی البلاء۔ ترمذی، ابواب صفة القیامة

فيه افضلية من يخالط الناس مخالطة يامرهم فيها بالمعروف و ينهاهم عن المنكر و يحسن معاملتهم فانه افضل من الذى يعتزلهم ولاَ يصبر على المخالطة[۱]

اس حدیث میں اس شخص کی فضیلت بیان ہوئی ہے جو لوگوں سے ملا جلا رہتا ہے، ایسا ملنا کہ جس میں وہ ان کو معروف کا حکم دیتا اور منکر سے منع کرتا ہے اور ان کے ساتھ بہتر سلوک کرتا ہے، وہ افضل ہے اس شخص کے مقابلے میں جو ان سے الگ رہتا ہے اور ان کے میل جول سے پہنچنے والی تکلیف پر صبر نہیں کرتا۔

ان حدیثوں اور ان کی تشریحات سے واضح ہے کہ ایک ایسے معاشرے میں جو فی الحال اپنی اصلاح کے لیے آمادہ نہ ہو، امر بالمعروف و نہی عن المنکر فرض تو نہیں ہے، لیکن اس کی اہمیت اور فضیلت برقرار ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اگر معاشرے میں معروف کو قائم کرنے اور منکر کو مٹانے کی کوشش جاری رہی تو ہوسکتا ہے کہ جو لوگ فوراً اصلاح قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں، آئندہ ان کی اصلاح ہوجائے۔ لیکن اگر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی کوشش بالکل ہی چھوڑ دی جائے تو اصلاح کی توقع ہی ختم ہو جائے گی اور پورا معاشرہ تباہ ہو جائے گا۔

قدرتِ مطلقہ

ہم نے اوپر کے صفحات میں تفصیل سے یہ بحث کی ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی عدم افادیت کا یقین ہو یا اس کے نتیجے میں کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو اس کا وجوب باقی نہیں رہتا۔ لیکن اگر یہ دونوں صورتیں نہ ہوں، یعنی نہ تو خوفِ ضرر ہو اور نہ اس کے غیر مفید ہونے کا خیال ہو تو امام غزالیؒ نے اسے 'قدرتِ مطلقہ' سے تعبیر کیا ہے۔ اس صورت میں مومن کو احتساب کا فرض لازماً انجام دینا ہوگا۔ چناں چہ امام موصوف فرماتے ہیں:

۱۔ سبل السلام شرح بلوغ المرام: ۲/۱۸۲

ان يعلم انّ المنكر يزول بقوله وفعله ولاَ يقدر له على مكروه فيجب عليه الاِنكار و هٰذه هى القدرة المطلقة[1]

اگر احتساب کرنے والا یہ جانتا ہو کہ اس کے کہنے یا اقدام کرنے سے منکر زائل ہو جائے گا اور اس کے نتیجہ میں اس کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی تو 'نہی عن المنکر' اس کے لیے واجب ہے، اور یہ 'قدرت مطلقہ' ہے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر قوت سے ہو یا زبان سے، عدمِ قدرت کا امکان ہے

یہاں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض آدمی قوت کے ذریعہ ادا کرنا چاہے یا زبان کے ذریعے، دونوں حالتوں میں عدمِ قدرت کا امکان پایا جاتا ہے۔ اس لیے یہ فرض بھی دونوں ہی حالتوں میں ساقط ہو جاتا ہے۔

علامہ ابوبکر جصاص کہتے ہیں:

و هى علىٰ منازل: اوّلها تغييره باليد اِذَا اَمْكَنَ فَاِنْ لَّمْ يُمْكِنْ وكان فى نفيه خائفا علىٰ نفسه اذا انكره بيده فعليه انكاره بلسانه فان تعذر ذلك لما وصفنا فعليه انكاره بقلبه[2]

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے چند درجات ہیں۔ ان میں سے پہلا درجہ تغییر بالید ہے، بشرطیکہ اس کا امکان ہو۔ لیکن اگر وہ ممکن نہ ہو اور ہاتھ سے منکر کے مٹانے میں اپنی جان کا اس کو خوف ہو تو اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ زبان سے اس پر نکیر کرے۔ لیکن اگر اسی خوف کی وجہ سے یہ بھی اس کے لیے دشوار ہو تو اس کی ذمے داری یہ ہے کہ اپنے دل ہی سے اس پر نکیر کرے۔

قاضی عیاض نے اس سے زیادہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ لکھا ہے:

ان غلب علىٰ ظنه ان تغييره بيده يسبب منكرًا اشدّ من قتله او قتل غيره بسببه كفّ يده و اقتصر

اگر آدمی کو اس بات کا ظنِ غالب ہو کہ ہاتھ سے اس کا منکر کو مٹانا کسی اس سے بڑے منکر کا سبب بن جائے گا مثلاً خود اسی کا قتل یا اس کے بجائے اس کی وجہ سے کسی دوسرے کا قتل تو اپنا ہاتھ روک

---

[1] احیاء علوم الدین: ۲/ ۳۴۷

[2] احکام القرآن: ۲/ ۳۸

علی القول باللسان و الوعظ و التخویف، فان خاف ان یسبب قوله مثل ذلک غیر بقلبه وکان فی سعة[1]

لے گا اور زبان سے وعظ اور تخویف پر اکتفا کرے گا۔ لیکن اگر خوف ہو کہ اس کا قول بھی اسی طرح کے نتائج کا سبب بنے گا تو اپنے دل سے منکر کو بدلے گا اور اس کو اس کی گنجائش ہوگی۔

علامہ مناوی تغییرِ منکر سے متعلق ایک حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

فان لم یستطع الاِنکار بیدہ بان ظن لحوق ضرربه فبلسانه ای بالقول کاستغاثة او توبیخ او اغلاظ بشرطه، فان لم یستطع ذلک لوجود مانع کخوف فتنة او خوف علی نفس او عضو او مال فبقلبه[2]

اگر آدمی کو اپنے ہاتھ سے انکارِ منکر کی استطاعت نہ ہو، مثلاً اسے یہ خیال ہو کہ اس سے اس کو ضرر لاحق ہوگا تو اپنی زبان یعنی قول سے منکر پر نکیر کرے۔ مثلاً منکر کے خلاف مدد کرے یا دھمکی دے یا سختی کرے اس کی شرائط کے ساتھ۔ اگر اس کی بھی کسی رکاوٹ کی وجہ سے استطاعت نہ ہو جیسے فتنہ کا خوف ہو یا کسی عضو، جسم یا مال کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو تو اپنے دل سے منکر پر نکیر کرے۔

دل سے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی اجازت اور اس کا وقت

جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، حدیث میں تغییرِ منکر کی تین صورتیں بیان کی گئی ہیں: تغییر بالید، تغییر باللسان اور تغییر بالقلب۔ پہلی دو صورتوں پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ تغییر بالقلب کے معنی ہیں دل سے منکر کو منکر سمجھنا اور اس سے نفرت کرنا۔ یہ صورت آدمی اسی وقت اختیار کر سکتا ہے جب کہ پہلی دونوں صورتیں اس کے امکان میں نہ ہوں۔ لیکن اگر وہ ہاتھ یا زبان سے منکر کے مٹانے کی طاقت رکھتا ہے تو محض دل سے منکر کو منکر سمجھ کر تغییر منکر کے فرض سے سبک دوش نہیں ہو سکتا۔ علامہ قرطبی نے ابن عبد البر کے حوالے سے اس معاملے میں مسلمانوں کا اجماع نقل کیا ہے:

---

[1] احیاء علوم القرآن: ۲/۳۸

[2] التیسیر شرح الجامع الصغیر: ۲/۴۱۸

اذا انکر بقلبه فقد ادی ما علیه اذالم یستطع علیه سوی ذلک[1]

جب کوئی شخص اپنے دل سے انکارِ منکر کردے تو اس نے اپنی ذمے داری پوری کردی بشرطیکہ وہ اس سلسلے میں اس کے علاوہ کسی دوسری صورت کی طاقت نہ رکھتا ہو۔

حدیث میں تغییر منکر کے جو مراتب بیان ہوئے ہیں ان کے بارے میں ملا ّعلی قاری فرماتے ہیں:

من یغیر المراتب مع القدرة کان من العاصین، ومن ترکھا بلا قدرة اویری مفسدة اکثر من المصلحة و یکون منکرا بقلبه فھو من المومنین[2]

جو شخص قدرت کے باوجود ان کی ترتیب بدل دے وہ گناہ گار ہوگا اور جو شخص عدمِ قدرت کی وجہ سے یا اس وجہ سے کہ اس کے نتیجے میں وہ اصلاح سے زیادہ بگاڑ دیکھتا ہے، ان کو چھوڑ دے اور اپنے دل سے برائی کو ناپسند کرے تو اس کا شمار اہلِ ایمان میں ہوگا۔

اس سے زیادہ صراحت ابن حجر ہیتمی نے کی ہے:

یجب تغییر المنکر بکل طریق امکنه، فلا یکفی الوعظ لمن امکنه ازالته بیده، ولاَ کراھة القلب لمن قدر علی النھی باللّسان[3]

تغییرِ منکر واجب ہے ہر اس طریقہ سے جو انسان کے امکان میں ہے۔ پس وعظ ونصیحت اس شخص کے لیے کافی نہیں ہے جو منکر کو اپنے ہاتھ سے زائل کرسکتا ہو۔ اسی طرح کراہتِ قلب ناکافی ہے اس شخص کے لیے جو زبان سے نہی عن المنکر کی طاقت رکھتا ہو۔

ایک مومن ایسے حالات سے دوچار ہوسکتا ہے جن میں وہ نہ تو عملاً منکر کو مٹا سکے اور نہ اس کے خلاف اپنی زبان استعمال کرسکے، لیکن منکر سے نفرت تو ہر حال میں اس کے اندر ہونی چاہیے۔ تغیر منکر کا یہ بالکل آخری درجہ ہے، اس کے بعد کوئی درجہ نہیں

---

[1] الجامع لاحکام القرآن: ۴/۴۲

[2] المبین المعین لشرح الاربعین، ص ۱۸۹

[3] حوالہ سابق، ص ۲۲۰

ہے۔ اگر کسی دل میں برائی سے نفرت اور بے زاری بھی نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس سے ایمان کی حرارت ختم ہوگئی۔ اسی وجہ سے ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے:

ولیس وراء ذلک من الایمان حبة خردل[1] (تغییر بالقلب بھی نہیں ہے تو) اس کے بعد رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں رہتا۔

جو شخص بدی اور معصیت سے نفرت کرے گا اور یہ نفرت رسمی نہیں، بلکہ حقیقی ہوگی تو وہ ان لوگوں سے دور بھی رہے گا جو اس میں آلودہ ہیں۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ آدمی کے دل میں کسی کی روش کے خلاف شدید جذبات موجود ہوں اور اس کا اظہار تعلقات میں نہ ہونے پائے، اس لیے تغییر بالقلب کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ صحبت بد سے دوری اختیار کی جائے۔ علامہ ابوبکر جصاص لکھتے ہیں:

وسعهٔ السکوت عنهم بعد ان یجانبهم و یظهر هجرانهم[2] (اگر وہ تغییرِ منکر پر قادر نہیں ہے تو) غلط کاروں سے دور رہنے اور اپنی دوری کا اظہار کرنے کے بعد اس کے لیے سکوت کی گنجائش ہے۔

یہی نہیں، بلکہ مومن کے ایمان کا تقاضا ہے کہ اگر وہ کسی منکر کے مٹانے پر قادر نہیں ہے تو اپنی اس بے بسی پر مطمئن نہ ہو جائے، بلکہ اس کے دل میں یہ تمنا اور آرزو پرورش پاتی رہے کہ کاش مجھے طاقت حاصل ہوتی اور یہ منکر میرے ہاتھوں ختم ہوتا۔ مجبور ہوکر منکر کو برداشت کرنے کا جذبہ اس کے اندر نہ ابھرے، بلکہ اس کے سینے میں یہ عزم اور ارادہ جاگتا رہے کہ جب بھی اسے اس منکر کو مٹانے کی طاقت حاصل ہوگی وہ اس کو مٹا کے رہے گا۔ تغییر بالقلب کے بارے میں علامہ مناوی کہتے ہیں:

یکرهه به ویعزم انه لو قدر فعل[3] منکر کو اپنے دل سے ناپسند کرے اور یہ عزم کرے کہ اگر وہ تغییر منکر پر قادر ہوگا تو ضرور اس کو مٹائے گا۔

---

[1] مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کون النہی عن المنکر من الایمان الخ

[2] احکام القرآن: ۲/ ۴۱ [3] التیسیر بشرح الجامع الصغیر: ۲/ ۴۱۸

ابن حجر ہیتمی کہتے ہیں:

یکرہ ذلک بہ و یعزم انہ لو قدر علیہ بقول او فعل أزالہ[1]

منکر کو اپنے دل سے ناپسند کرے اور یہ عزم کرے کہ اگر وہ زبان سے یا عمل سے تغییر منکر پر قادر ہوتا تو اس کو مٹا ہی دیتا۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے شرائط کو ایک صاحبِ ایمان ضرور اپنے پیش نظر رکھے گا لیکن کسی بھی حال میں اس کا سینہ قیامِ معروف اور انکارِ منکر کے جذبہ سے خالی نہ ہوگا۔ یہ اسے ہمیشہ بے تاب رکھے گا۔

---

[1] فتح المبین لشرح الاربعین، ص: ۲۲۰



وسائل و ذرائع

دفعِ منکر کے وسائل یا درجاتِ احتساب

امت کے درمیان امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض انجام دینے کے سلسلے میں ذرائع و وسائل کا سوال بہت اہم ہے۔ یعنی یہ کہ ایک ایسی سوسائٹی کے اندر، جو اللہ اور اس کے رسولؐ کو مانتی اور آخرت پر ایمان رکھتی ہے، معروف کے قائم کرنے اور منکر کے مٹانے کے لیے آدمی کن ذرائع کو اختیار کرسکتا ہے اور کن ذرائع کے اختیار کرنے کی اس کو اجازت نہیں ہے؟ امام غزالیؒ نے اس سوال سے بڑی تفصیلی بحث کی ہے، لیکن وہ ان ذرائع کو احتساب کے مختلف درجات سے تعبیر کرتے ہیں اور علامہ عبد القادر عودہ نے ان کو دفعِ منکر کے وسائل کا نام دیا ہے[1] یہاں ہم امام غزالیؒ کی بحث کو بہت ہی اختصار کے ساتھ پیش کریں گے۔ فرماتے ہیں: احتساب کے حسبِ ذیل آٹھ درجات ہیں:

پہلا درجہ: احتساب کرنے والے کو اس بات کا علم ہو کہ فلاں شخص منکر کا ارتکاب کر رہا ہے، لیکن اس کے لیے تجسس کرنا اور کسی کی ٹوہ میں لگے رہنا صحیح نہیں ہے، ہاں اگر کسی کو ازخود اس کا علم ہو جائے تو وہ اس کے سلسلے میں اقدام کرسکتا ہے۔

دوسرا درجہ: بعض اوقات انسان منکر کو منکر نہیں تصور کرتا، بلکہ معروف سمجھنے لگتا ہے اور اپنی اسی ناواقفیت کی وجہ سے اس کا ارتکاب بھی کر گزرتا ہے۔ اگر اسے معلوم

---

[1] التشریع الجنائی الاسلامی: ۱/ ۵۰۵-۵۰۹

ہو جائے کہ جو کام وہ کر رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ اور اس کے عتاب کا مستوجب ہے تو وہ یقیناً اس سے دست کش ہو جائے گا۔ ایسی صورت میں اس کو یہ بتانا کافی ہے کہ اس کا عمل غلط ہے اور اسے اس سے باز رہنا چاہیے۔

تیسرا درجہ: اگر کوئی شخص منکر کو منکر سمجھنے کے باوجود اس کا ارتکاب کر رہا ہے، یا معروف کو معروف سمجھنے کے باوجود اس کی مخالفت کر رہا ہے تو اسے خدا کا خوف دلایا جائے، آخرت کی باز پرس سے ڈرایا جائے اور بہترین اسلوب میں اس کے سامنے سلف صالحین کی سیرت پیش کی جائے، تاکہ وہ ان چیزوں کا اثر قبول کرے اور معصیت کا ارادہ ترک کردے۔

چوتھا درجہ: اگر لطف و محبت سے سمجھانے اور نصیحت کرنے کے باوجود کوئی شخص منکر سے باز نہ آئے تو اسے سخت سست کہا جائے اور اس کی ملامت کی جائے، لیکن اس میں اس بات کی احتیاط ہونی چاہیے کہ بد زبانی اور گالم گلوج نہ ہونے پائے۔

پانچواں درجہ: وعظ و نصیحت اور سخت کلامی کارگر نہ ہو تو منکر کو قوت سے مٹایا جائے۔ مثال کے طور پر گانے بجانے کا سامان توڑ دیا جائے، یا کوئی مرد ریشم کا کپڑا پہنے ہوئے ہو تو اسے پھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ لیکن اس پر عمل ہر منکر کے سلسلے میں ممکن نہیں ہے۔ جن منکرات کا ابھی ذکر ہوا ہے وہ یا اس نوعیت کے دوسرے منکرات کو تو قوت سے مٹایا جاسکتا ہے، لیکن جن منکرات کا تعلق محض زبان یا دل سے ہے، یا جو منکر کا ارتکاب کرنے والے کی ذات تک محدود ہوتے ہیں ان کے سلسلے میں اس پر عمل ممکن نہیں ہے۔

چھٹا درجہ: منکر کا ارتکاب کرنے والے کو ڈرایا اور دھمکایا جائے، لیکن اس میں یہ بات ملحوظ رہے کہ دھمکی ایسی نہ دی جائے جس پر عمل کرنا شرعاً حرام ہو۔ مثال کے طور پر یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ منکر سے باز آؤ ورنہ تمھارا سر توڑ دوں گا، لیکن یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ منکر سے باز آؤ ورنہ میں تمھارا گھر لوٹ لوں گا، یا تمھارے بچے کو قتل کر دوں گا۔

ساتواں درجہ: منکر کا ارتکاب کرنے والے کو مارا پیٹا جائے اور اس کے

خلاف ہتھیار نہ استعمال کیے جائیں۔ لیکن اگر ہتھیار اٹھائے بغیر منکر کے مٹانے کی کوئی صورت نہ ہو تو ہتھیار اٹھائے جائیں اور ضرورت کی حد تک ان کو استعمال کیا جائے۔

آٹھواں درجہ: کوئی شخص تنہا منکر کے مٹانے پر قادر نہ ہو اور اس کے لیے وہ دوسروں سے تعاون حاصل کرے۔[1]

اصلاح بذریعہ نصیحت

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ان مختلف ذرائع کو ہم دو عنوانوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ ایک اصلاح بذریعہ نصیحت اور دوسرا اصلاح بذریعہ قوت۔ ان دونوں قسم کے ذرائع پر عمل بھی مذکورہ ترتیب ہی سے ہوگا۔ یعنی پہلے وعظ و نصیحت اور لطف و محبت سے اصلاح کی کوشش کی جائے گی، اگر یہ کوشش بے سود ثابت ہو تو قوت اور زور سے اصلاح کا نفاذ ہوگا۔ جب تک پہلے ذریعے کی عدمِ افادیت کا یقین نہ ہوجائے دوسرے ذریعے کو اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن مجید میں ہے:

وَ اِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰى تَفِیْٓءَ اِلٰۤى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَ اَقْسِطُوا اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ○ (الحجرات:۹)

اور اگر مومنوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں تو تم ان کے درمیان صلح کرادو۔ پھر اگر ان میں سے ایک دوسری پر زیادتی کرے تو تم سب مل کر اس جماعت سے لڑو جو زیادتی کرتی ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرے۔ پس اگر وہ رجوع کرے تو تم ان کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کرادو اور انصاف کرو۔ یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

اس آیت میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر ان میں کے دو گروہ کسی وجہ سے آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان عدل و انصاف کے ساتھ اصلاح کی کوشش کی جائے، لیکن اگر کوئی فریق عدل و انصاف کے سامنے سر جھکانے کے لیے تیار نہ ہو تو

---

[1] احیاء علوم الدین: ۲/۳۵۷-۳۶۱

مظلوم کی حمایت میں اس سے جنگ کی جائے۔ گویا پہلے سعیِ اصلاح کی ہدایت کی گئی ہے، اگر یہ کوشش ناکام ہوجائے تو قتال کا حکم ہے۔ اسی وجہ سے علماء نے بالاتفاق یہ بات کہی ہے کہ اگر وعظ ونصیحت کے ذریعے اصلاح ہوسکتی ہے تو طاقت کا استعمال صحیح نہیں ہے۔ چند علماء کی تصریحات یہاں پیش کی جارہی ہیں:

ابوبکر جصاص:

امر اللہ تعالٰی بالدعاء الی الحق قبل القتال ثم ان ابت الرجوع قوتلت[1]

اللہ تعالٰی نے قتال سے پہلے حق کی طرف بلانے کا حکم دیا ہے۔ اس کے بعد جو فریق حق کی طرف رجوع سے انکار کردے اس سے جنگ کی جائے گی۔

زمخشری:

یبتدی بالسھل فان لم ینفع ترقی الی الصعب[2]

آسان طریقہ سے ابتدا کی جائے گی۔ اگر وہ غیر مفید ثابت ہو تو اگلا مرحلہ یہ ہے کہ مشکل طریقہ اختیار کیا جائے گا۔

ابن عربی مالکی:

ان اللہ سبحانہ امر بالصلح قبل القتال وعین القتال عندالبغی[3]

اللہ تعالٰی نے قتال سے پہلے صلح کا حکم دیا ہے اور قتال کا تعین اس وقت کیا ہے جب کہ اس سے بغاوت ہو۔

ابوعبداللہ قرطبی:

فالمنکر اذا امکنت ازالتہ باللسان للناھی فلیفعل وان لم یمکنہ الاّ بالعقوبۃ او القتل

منکر کا ازالہ جب اس کے منع کرنے والے کے لیے زبان کے ذریعے ممکن ہو تو اسی کو اختیار کرے اور اگر اس کا ازالہ سزا یا قتل ہی کے

---

[1] احکام القرآن: ۳/ ۵۳۳

[2] الکشاف عن حقائق التنزیل: ۱/ ۳۹۰

[3] احکام القرآن: ۴/ ۱۷۱

فلیفعل فان زال بدون القتل لم یجز القتل[1]

ذریعے ہوسکتا ہو تو اسے بھی اختیار کرسکتا ہے، لیکن قتل کے بجائے اس سے کم تر کسی طریقہ سے ازالہ منکر ہوسکے تو قتل کرنا جائز نہیں ہے۔

کیا عوام کو طاقت کے ذریعہ اصلاح کا حق ہے

ان تصریحات سے واضح ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے سلسلے میں طاقت کو کام میں لانے سے پہلے اصلاح کی کوشش کی جائے گی۔ اس کا حق ہر مسلمان کو حاصل ہے، بلکہ یہ اس کی شرعی ذمے داری ہے کہ معروف کی تبلیغ کرے اور منکر کے خلاف آواز اٹھائے، البتہ طاقت کے استعمال کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس کی اجازت شریعت نے ہر اس شخص کو دے رکھی ہے جس کے پاس طاقت ہو یا یہ صرف حکومت کا حق ہے۔ اس سوال پر علماء نے بڑی لمبی بحثیں کی ہیں۔ ہم ان کے خیالات کو یہاں بہت ہی اختصار کے ساتھ پیش کریں گے، علامہ قرطبی کہتے ہیں:

قال العلماء: الأمر بالمعروف بالید علی الأمراء و باللسان علی العلماء و بالقلب علی الضعفاء یعنی عوام الناس[2]

علماء نے کہا ہے کہ امر بالمعروف کا فرض قوت کے ذریعہ انجام دینا حکام کی، زبان کے ذریعے انجام دینا علماء کی اور دل کے ذریعے انجام دینا کم زوروں یعنی عوام کی ذمے داری ہے۔

علامہ قرطبی نے علماء کی جو رائے نقل کی ہے اس میں بالکل ایک اصولی بات کہی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چوں کہ حکومت کے پاس طاقت ہوتی ہے اس لیے اس کا فرض ہے کہ قوت کے ذریعے معروف کو قائم کرے اور منکر مٹائے۔ اسی طرح جو افراد دین کا علم رکھتے ہیں اور تبلیغ و اصلاح کا فرض انجام دے سکتے ہیں ان کی ذمے داری ہے کہ لوگوں کو معروف پر عمل کی ترغیب دیں اور ان پر منکر کی خرابیاں واضح کریں۔ رہے

---

[1] الجامع لاحکام القرآن، المجلد الثانی، الجزء ۴، ص ۳۲

[2] ایضاً

وہ لوگ جو یہ کام بھی بہ حسن وخوبی انجام نہیں دے سکتے ان کی ذمے داری بس اتنی ہے کہ نیکی سے محبت کریں اور برائی سے خوش نہ ہوں، بلکہ دل سے اس کو ناپسند کریں۔ علماء کے مذکورہ بالا قول کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اگر کہیں معصیت کا ارتکاب ہو رہا ہو تو جس شخص کے پاس اقتدار اور حکومت نہیں ہے وہ بالکل سکوت اختیار کرے اور اس کو ختم کرنے کی اپنی حد تک بھی کوشش نہ کرے۔ کیوں کہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ جو شخص بھی منکر کو دیکھے اسے نرمی اور محبت سے ختم کرنے کی سعی کرے، اس میں کامیاب نہ ہو اور قوت سے اس کو مٹا سکتا ہو تو قوت ہی سے مٹائے۔

شے منکر کی تغییر کے لیے طاقت کا استعمال

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے سلسلے میں طاقت کے استعمال کی دو صورتیں ہیں: ایک تو یہ کہ کسی شئے منکر کو ہم مٹانا چاہیں اور اس کے خلاف طاقت کو کام میں لائیں، مثلاً شراب بہادی جائے یا گانے بجانے کا سامان توڑ دیا جائے۔ دوسری صورت یہ کہ طاقت کا استعمال شئے منکر کے خلاف نہیں، بلکہ منکر کا ارتکاب کرنے والے کے خلاف کیا جائے، مثلاً ایک شخص زنا کرنے جا رہا ہے، اسے مار پیٹ کر اس سے باز رکھنے کی کوشش کی جائے، اگر اس سے بھی وہ باز نہ آئے تو اسے قتل کر دیا جائے۔

پہلی صورت کے بارے میں امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

كسر الملاهي و إراقة الخُمور فانهٗ تعاطي مَا يعرف كونه حقًّا من غير اجتِهاد فلم يفتَقر الَى الاِمام[1]

رہا آلاتِ لہو و لعب کا توڑ دینا اور شراب کا بہا دینا تو یہ ایسی چیز ہے کہ جس کا حق ہونا بغیر کسی اجتہاد کے معروف ہے، اس لیے یہ کام امام کی اجازت کا محتاج نہیں ہے۔

قاضی عیاض کہتے ہیں:

---

[1] احیاء علوم الدین: ۲/ ۳۴۳

حق المغيران يغيره بكل وجـه امكنـه زوالـه بـهٖ قـولاً كان او فعلاً، فيكسر الاَت البَاطل و يـريق المسكـر بنفسه او يأمـر من يفعله و ينـزع الغصوب و يردّها إلى اصحـابهٖ بنفسـهٖ او بـأمرهٖ اذا أمكنه[1]

تغییرِ منکر کرنے والے کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ منکر کو ہر اس طریقے سے مٹا دے جس سے اس کا مٹانا ممکن ہو، خواہ وہ قول کے ذریعہ ہو یا عمل کے ذریعہ۔ پس وہ یا تو خود ہی آلات باطل کو توڑے گا اور شراب بہائے گا، یا کسی ایسے شخص کو حکم دے گا، جو اس کام کو انجام دے۔ اسی طرح وہ غصب شدہ چیز کو چھین کر اس کے مالک کے حوالے یا تو خود ہی کرے گا یا اس کے حکم سے کوئی دوسرا یہ کام کرے گا۔ جب کہ یہ سب کچھ اس کے امکان میں ہو۔

حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں:

لاَ ضمان في كسر أواني الخمر و شقّ زقاقة[2]

شراب کے برتنوں اور اس کے مٹکوں کو توڑنے میں کوئی تاوان نہیں ہے۔

امام غزالیؒ اور قاضی عیاض شافعی المسلک ہیں اور حافظ ابن قیم امام احمدؒ کے متبع ہیں، اس لیے ان تینوں حضرات نے شافعی اور حنبلی فقہ کی ترجمانی کی ہے۔ لیکن احناف اس مسئلے میں غیر مسلم کی ملکیت اور مسلمان کی ملکیت میں فرق کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جس شئے منکر کو تلف کیا گیا ہے اس کا مالک مسلمان ہے تو یقیناً اس کا کوئی تاوان اسے نہیں دلوایا جائے گا، خواہ اس کا تلف کرنے والا کوئی کافر ہو یا مسلمان، کیوں کہ ایک مسلمان کے نزدیک کسی ناجائز چیز کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس تلف شدہ چیز کا مالک غیر مسلم ہے تو اس کو لازماً اس کا تاوان دلوایا جائے گا، قطعِ نظر اس سے کہ اس کا تلف کرنے والا مسلمان ہے یا غیر مسلم۔ کیوں کہ اس کے نقطۂ نظر سے اس کی با قیمت چیز تلف کی گئی ہے۔ علاّمہ کاسانی فرماتے ہیں:

---

[1] شرح مسلم للنووی، المجلد الاول، الجزء ۲، ص ۲۳

[2] الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ، ص ۲۵۶

لاَ يجب الضمان باتلاف الخمر والخنزير على المسلم سواء كان المتلف مسلمًا او ذميًا لسقوط تقوم الخمر و الخنزير فى حق المسلم، و لو اتلف مسلم او ذمى على ذمى خمرا او خنزيرا يضمن عندنا خلافًا للشافعی[1]

(کسی مسلمان کی) شراب اور سور کو کوئی تلف کردے تو اسے تاوان نہیں ملے گا، خواہ تلف کرنے والا مسلمان ہو یا ذمّی، کیوں کہ مسلمان کے حق میں شراب اور سور کی قیمت ساقط ہو جاتی ہے، لیکن اگر کوئی مسلمان یا ذمّی کسی ذمّی کی شراب یا سور کو تلف کردے تو وہ ہمارے (حنفیہ) کے نزدیک تاوان دے گا۔ امام شافعی کو اس سے اختلاف ہے (وہ اس دوسری صورت میں بھی تاوان کے قائل نہیں ہیں)۔

مرتکبِ منکر کے خلاف طاقت کا استعمال

یہ گفتگو کسی شے منکر کے خلاف طاقت کے استعمال سے متعلق تھی۔ اب ہمیں منکر کا ارتکاب کرنے والے کے خلاف طاقت کے استعمال کے سلسلے میں غور کرنا ہے۔ کسی شخص کو جرم کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھنے سے انسان پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی جو ذمے داری عائد ہوتی ہے اس کو بیان کرتے ہوئے علامہ عبد القادر عودہ شہیدؒ لکھتے ہیں:

اذا شوهد الجانی و هو يرتكب الجناية كان لأی شخص ان يمنعه من القوة عن ارتكاب الجريمة و ان يستعمل القوة اللازمة لمنعه سواء كانت الجريمة اعتداءً علىٰ حقوق الأفراد كالسرقة او اعتداءً علىٰ حقوق الجماعة كشرب الخمر و الزنا، و هٰذا ما يسمّٰى بحق الدفاع الشرعی العام[2]

جب مجرم اس حال میں دیکھا جائے کہ وہ جرم کا ارتکاب کر رہا ہے تو ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ اسے جرم کے ارتکاب سے بزور روک دے اور اس کو روکنے کے لیے جو ضروری قوت درکار ہے اسے استعمال کرے، خواہ جرم کی نوعیت افراد کے حقوق پر زیادتی کی ہو جیسے چوری، یا جماعت کے حقوق پر زیادتی کی ہو، جیسے شراب نوشی اور زنا۔ یہ وہ چیز ہے جسے شریعت کے عمومی دفاع کا حق کہا جاتا ہے۔

---

[1] بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع: ۷/ ۱۶۷

[2] التشریع الجنائی الاسلامی: ۱/ ۸۶

علّامہ ابوبکر جصاص نے اس موضوع پر بڑی مدلل اور تفصیلی بحث کی ہے۔ ہم یہاں اس کے ضروری حصے تھوڑی سی ترتیب بدل کر نقل کرتے ہیں:

"امر بالمعروف و نہی عن المنکر جن حالات میں انجام دیا جاتا ہے وہ دو طرح کے ہوسکتے ہیں: ایک حالت تو یہ کہ اس میں تغییرِ منکر ممکن ہی نہ ہو اور دوسری حالت یہ کہ اس میں منکر کو بدلنا اور اسے دور کرنا ممکن ہوگا اس صورت میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ جو شخص اس کو اپنے ہاتھ سے دور کرنے کی طاقت رکھتا ہو اس کا فرض ہے کہ اسے اپنے ہاتھ سے دور کردے۔ اس کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں: ایک صورت یہ ہے کہ منکر کا ازالہ بغیر تلوار اٹھائے اور منکر کا ارتکاب کرنے والے کو ختم کیے بغیر ناممکن ہوجائے۔ ایسی صورت میں اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی یہ دیکھے کہ ایک شخص اس کے یا کسی دوسرے کے قتل کا ارادہ کر رہا ہے، یا اس کا مال چھیننا چاہتا ہے، یا کسی عورت کے ساتھ زنا کرنے یا اسی طرح کی اور کوئی سنگین حرکت کرنے جا رہا ہے اور ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اگر اس کو زبان سے سمجھایا جائے یا بغیر ہتھیار کے اس کی مزاحمت کی جائے تو وہ باز نہیں آئے گا، تو لازماً اسے اس بدکار کو قتل کر ہی دینا چاہیے۔ کیوں کہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ "تم میں سے جو بھی شخص منکر کو دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے،" پس جب تغییرِ منکر کی کوئی صورت سوائے اس کے نہ رہ جائے کہ منکر کا ارتکاب کرنے والے کو ختم کر دیا جائے تو ضروری ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی کا مال غصب کرلے تو آپ کو اجازت ہے کہ اسے قتل کردیں اور سامان اس کے مالک کے حوالے کردیں۔ اسی طرح امام ابوحنیفہؒ نقب زن کے بارے میں فرماتے ہیں کہ آپ اس کو قتل کرسکتے ہیں۔ اس سے آگے یہ بھی ان کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص تمہارا دانت توڑنا چاہے تو تم اس کی جان لے سکتے ہو، بشرطے کہ تم ایسے حالات میں گھر جاؤ کہ اس کے خلاف کوئی تمہاری مدد کرنے والا نہ ہو۔

یہی بات ہم ان افراد کے بارے میں بھی کہیں گے جو لوگوں سے غیر قانونی ٹیکس وصول کرتے ہیں، یعنی یہ کہ وہ مباح الدّم ہیں اور مسلمانوں پر ان کا قتل کرنا واجب ہے۔ ہر فرد کو اس کی اجازت ہے کہ ان میں سے جس کسی کے قتل پر بھی وہ قادر ہو، اسے قتل کردے۔ اس کے لیے ان کو پہلے سے نہ تو سمجھانے بجھانے کی ضرورت ہے اور نہ تنبیہ کرنے کی۔ کیوں کہ وہ اسے ناجائز سمجھنے کے باوجود کیے جا رہے ہیں، اس لیے ان کو نصیحت کرنا بے فائدہ ہے، وہ کبھی اس کو قبول نہیں کریں گے۔ اسی طرح انھیں تنبیہ کرنے کی ضرورت اس لیے بھی نہیں ہے کہ جو شخص ان کے منکر کو ختم کرنا چاہتا ہے وہ اگر ان کو پہلے سے ڈرائے اور اپنے ارادے سے آگاہ کردے تو وہ اس سے بچنے لگیں گے، اس طرح اس کے لیے ان کے منکر کو مٹانا ناممکن ہو جائے گا۔

یہی حکم ہے ان تمام لوگوں کے بارے میں جو بڑے بڑے اور تباہ کن معاصی پر جمے ہوئے ہوں اور علی الاعلان ان کا ارتکاب کرتے ہوں، یعنی امکان کی حد تک ان پر نکیر کرنا اور طاقت ہو تو ان کے عمل کو روکنا واجب ہے۔

اوپر جو کچھ ہم نے کہا ہے اس کی دلیل قرآن کی یہ آیت ہے:

فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتّٰى تَفِيْٓئَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ	تم ان سے لڑو، یہاں تک کہ بغاوت کرنے والا فریق اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرلے۔ (الحجرات:۹)

اس میں اللہ نے باغی فریق سے اس وقت تک جنگ کرنے کا حکم دیا ہے جب تک کہ وہ اس کے حکم کی طرف لوٹ نہ جائے اور اپنی بغاوت اور منکر کو چھوڑ نہ دے۔''[۱]

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اس سے معلوم ہوا کہ تغییرِ منکر کے لیے انسان وقتِ ضرورت کسی شخص کی جان بھی لے سکتا ہے، خواہ وہ یہ فرض اپنی ذات کی مدافعت میں انجام دے یا کسی دوسرے کی

---

[۱] احکام القرآن: ۲/ ۳۷، ۳۸

مدافعت میں، فرد کی حمایت میں انجام دے یا معاشرہ کی حمایت میں۔ لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ انسان کو شریعت نے اپنی اور دوسروں کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کا حق دیا ہے۔ اس حق کے تحت وہ اپنے آپ پر اور دوسروں پر ہونے والے ہر حملہ کا دفاع کرسکتا ہے۔ اس حقِ دفاع اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ فرق ہے اور یقیناً ہے۔ وہ یہ کہ اپنے اور دوسروں کے حقوق کے لیے دفاع کرنا ایک محدود کام ہے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا دائرہ اس سے بہت وسیع ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کسی کو قتل کرنا چاہے اور آپ اس کا مقابلہ کریں تو گویا آپ اس حق کو استعمال کریں گے جو دوسروں کی جان کی حفاظت کا شریعت نے آپ کو دیا ہے۔ یہ ایک مظلوم کا دفاع بھی ہے اور تغییرِ منکر بھی، لیکن اگر کسی خودکشی کرنے والے کو خودکشی سے آپ روک دیں تو گو اس میں کسی کے دفاع کا سوال نہیں پیدا ہوتا، لیکن یہ تغییرِ منکر ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی عورت کی عصمت دری کرنا چاہے اور آپ اسے روک دیں تو یقیناً یہ اس عورت کی طرف سے دفاع بھی ہے اور ایک منکر کی تغییر بھی، لیکن اگر کوئی مرد اور عورت اپنی مرضی سے زنا کرنا چاہیں اور آپ ان کو روک دیں تو یہ عورت کی طرف سے دفاع نہیں ہے، بلکہ محض تغییرِ منکر ہے[1] غرض یہ کہ شریعت کے خلاف ہر وہ عمل، جس کا مٹانا ممکن ہو، تغییرِ منکر ہے، خواہ اس کا تعلق دفاع سے ہو یا نہ ہو۔

عوام کے لیے طاقت کے استعمال کی شرائط

اس تفصیل سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ قوت کے ذریعے تغییرِ منکر کا حق ہر شخص کو حاصل ہے، لیکن بغیر کسی شرط کے مطلق نہیں ہے، بلکہ اس کے کچھ شرائط ہیں۔ یہاں ان شرائط کا ذکر ضروری ہے۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے التشریع الجنائی الاسلامی، ص ۵۱۱، ۵۱۲

۱- منکر کا ارتکاب ہو رہا ہو

تغییر منکر کے لیے عام افراد قوت کا استعمال صرف اسی وقت کر سکتے ہیں جب کہ عملاً منکر کا ارتکاب ہو رہا ہو۔ اگر کسی جگہ مستقبل میں ارتکاب منکر کا خطرہ ہو تو عوام کے لیے طاقت کا استعمال صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح منکر کے وجود میں آچکنے کے بعد وہ مجرم کو نصیحت تو کر سکتے ہیں، لیکن اس کے خلاف طاقت کو کام میں نہیں لا سکتے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں۔

> "معصیت کے تین احوال ہیں: ایک تو یہ کہ معصیت واقعی ہو چکی ہو، اس پر حد جاری کرنا یا تعزیر کرنا حکام کا کام ہے، عام افراد کا نہیں۔ دوسری حالت یہ کہ معصیت فی الحال موجود ہو اور اس کا ارتکاب کرنے والا اس میں ملوث ہو۔ اس حالت میں بہر طور معصیت کا مٹانا واجب ہے، بشرطے کہ اس کی وجہ سے اس سے بڑی یا اس جیسی کوئی معصیت نہ پیدا ہو جائے۔ اس کا حق عام افراد کو حاصل ہے۔ تیسری صورت یہ کہ منکر متوقع ہو، جیسے کوئی شخص مے نوشی کے لیے مجلس آراستہ کر رہا ہو، لیکن ابھی وہاں شراب موجود نہ ہو۔ اس میں اس بات کا بھی امکان ہے کہ کوئی ایسی رکاوٹ پیدا ہو جائے کہ وہ شراب استعمال نہ کر سکے۔ اس حالت میں اسے صرف نصیحت کی جا سکتی ہے، طاقت کے استعمال کا حق نہ عوام کو ہے اور نہ حکومت کو۔ الاّ یہ کہ کوئی شخص عادی مجرم ہو اور وہ اسباب کی فراہمی کے بعد ارتکابِ جرم کے لیے محض وقت اور موقع کے انتظار میں ہو تو اس پر سختی سے احتساب جائز ہے۔"[۱]

---

۱ تفصیل کے لیے دیکھیے التشریع الجنائی الاسلامی: ۲/ ۳۵۲

علامہ ابن نجیم تعزیر کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قالوا لکل مسلم اقامتہ حال مباشرة المعصیة و اما بعد الفراغ منھا فلیس ذٰلک لغیر الحاکم[1]

فقہاء نے کہا ہے کہ معصیت کے ارتکاب کے وقت مسلمان کو تعزیر کا حق ہے، لیکن معصیت سے فارغ ہونے کے بعد سوائے حاکم کے کسی کو یہ حق نہیں ہے۔

اس کی جو توجیہ فقہ میں کی گئی ہے وہ یہ ہے:

لو عزرہ حال کونہ مشغولاً بالفاحشة فلہ ذلک و انہ حسن، لأن ذلک نھی عن المنکر وکل واحد مأمور بہ، و بعد الفراغ لیس ینھی عن المنکر لأن النھی عما مضی لاَ یتصور فیتمحض تعزیرًا وذٰلک الی الإمام[2]

گناہ کا ارتکاب کرنے والے کی تعزیر اگر کوئی شخص اس وقت کرے جب کہ وہ اس میں مشغول ہے تو اس کا اسے حق ہے، بلکہ یہ پسندیدہ ہے۔ کیوں کہ یہ نہی عن المنکر ہے، جس کا ہر ایک کو حکم ہے۔ باقی رہا گناہ سے فارغ ہونے کے بعد تو اس وقت منکر سے منع نہیں کیا جاتا۔ کیوں کہ جو چیز گزر چکی اس سے روکنے کا کوئی تصور نہیں کیا جاسکتا۔ یہ خالص تعزیر ہوگی جو امام سے متعلق ہوگی۔

فقہاء نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ کسی شخص کے ارتکابِ منکر کے بعد اس کے خلاف طاقت کا استعمال قابلِ مواخذہ جرم ہے:

للمحتسب ان یعزر المعزران عزرہ بعد الفراغ منھا[3]

حکومت کی طرف سے جو شخص احتساب پر مامور ہے اسے یہ حق ہے کہ تعزیر کرنے والے کو سزا دے، اگر وہ کسی شخص کے معصیت سے فارغ ہونے کے بعد اس کی تعزیر کرے۔

ایک مثال کے ذریعہ اس کی وضاحت ہوسکتی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی پر حملہ

---

[1] احیاء علوم الدین: ۲/ ۳۵۲

[2] البحر الرائق شرح کنز الدقائق: ۵/ ۴۲

[3] حوالہ سابق

کرے اور وہ اپنی جان کے تحفظ میں یا کوئی دوسرا شخص اس کی مدافعت میں حملہ آور کو قتل کردے تو شریعت ان میں سے کسی سے مواخذہ نہیں کرے گی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تغییرِ منکر کے لیے قوت کا استعمال اس وقت جائز ہے جب کہ منکر کا ارتکاب ہو رہا ہو۔ اب ایک دوسری صورت فرض کیجیے، وہ یہ کہ حملہ آور حملہ کے بعد اس طرح پلٹ جاتا ہے کہ بظاہر اس کا ارادہ دوبارہ حملہ کا نہیں ہے۔ اس حالت میں اگر حملہ آور کو قتل کر دیا جائے تو قاتل سے قصاص لیا جائے گا[1] یہ اس دعویٰ کا ثبوت ہے کہ ارتکابِ منکر کے بعد طاقت کے استعمال کی اجازت نہیں ہے۔

۲۔ ضرورت کی حد تک طاقت کا استعمال کیا جائے

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے عام افراد بالکل ناگزیر حد تک طاقت کا استعمال کر سکتے ہیں، اس سے زیادہ کی انھیں اجازت نہیں ہے۔ امام غزالیؒ تغییر بالید کا ایک ادب یہ بیان کرتے ہیں:

ان يقتصر فى طريق التغيير على القدر المحتاج إليه

تغییرِ منکر کے طریقے میں اسی مقدار پر اکتفا کرے جس کا وہ محتاج ہے۔

مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کسی کی زمین پر غاصبانہ قبضہ جمائے بیٹھا ہے اور اسے ہاتھ پکڑ کر وہاں سے نکالا جاسکتا ہے تو ڈاڑھی یا ٹانگ پکڑ کر گھسیٹنا صحیح نہیں ہے۔[2]

ضرورت سے زیادہ طاقت کا استعمال ایک جرم ہے جس پر شریعت کی طرف سے احتساب ہوگا۔ فرض کیجیے، اگر کوئی شخص شراب کے بہانے کے لیے اس کا ظرف توڑ دے تو اسے تاوان ادا کرنا ہوگا۔ کیوں کہ شراب کے بہانے کے لیے ظرف کا توڑنا ضروری نہیں ہے۔ ہاں اگر شراب کا برتن توڑے بغیر اس کا بہانا ممکن نہ ہو تو اس شکست و ریخت کی بھی اسے اجازت ہے۔[3]

---

[1] تکملہ البحر الرائق، ص:۳۰۲
[2] احیاء علوم الدین:۲/ ۳۵۹
[3] ایضاً:۲/ ۳۵۹، ۳۶۰

اسی طرح اگر چور کسی مکان میں گھس جائے، اور صاحب مکان یہ جانتے ہوئے کہ چیخ پکار سے وہ بھاگ کھڑا ہوگا اسے قتل کردے تو اس پر قصاص واجب ہوگا، لیکن اگر اسے یقین ہو کہ وہ چیخ پکار سے نہیں بھاگے گا تو اسے قتل کرسکتا ہے[۱]

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلے میں اصولی بات یہ فرمائی ہے:

ليس الٰى اٰحاد الرعية الاّ الدفع و هو إعدام المنكر، فما زاد على قدر الاعدام فهو إمّا عقوبة على جريمة سابقة او زجر عن لاَحق و ذٰلك الى الولاَة لاَ إلى الرعية[۲]	عام رعایا کو صرف منکر کے مٹانے کا حق ہے، جو چیز اس سے زیادہ ہو وہ یا تو کسی سابق جرم کی سزا ہوگی یا ہونے والے جرم پر زجر و توبیخ ہوگی۔ اس کا حق حکام کو ہے، رعایا کو نہیں۔

۳- فتنہ کا خطرہ نہ ہو

قوت کے ذریعے معروف کا قائم کرنا اور منکر کا مٹانا اسی وقت صحیح ہوگا جب کہ اس سے فی الواقع منکر کے مٹنے اور معروف کے قائم کرنے کی توقع ہو اور ساتھ ہی کسی فتنہ کے پیدا ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔ عام حالات میں تغییرِ منکر کے لیے قوت کے تھوڑے بہت استعمال سے فتنہ و فساد کا کوئی خاص خطرہ نہیں ہوتا، لیکن اس مقصد کے لیے ہتھیار اٹھانے میں ضرور اس کا خطرہ ہے۔ اسی وجہ سے امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ عام افراد کو اس کا تو حق ہے کہ منکر کا ارتکاب کرنے والے کو وقتِ ضرورت زد و کوب کریں، لیکن اس کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی اجازت اسی وقت ہوگی جب کہ اس سے کسی فتنہ کے پیدا ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔ اس بحث کی ابتدا میں ذکر آچکا ہے کہ امام غزالیؒ نے احتساب کے آٹھ درجات بیان کیے ہیں، ان میں سے ساتویں درجہ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

الـدرجة السابعـة مباشـرة	احتساب کا ساتواں درجہ یہ ہے کہ منکر کا

۱؎ تکملہ البحر الرائق، ص ۳۰۹

۲؎ احیاء علوم الدین: ۲/۳۵۹

الضرب باليد و الرجل وغير ذٰلک مما ليس فيه شهر سلاح، و ذٰلک جائز للاٰحاد بشرط الضرورة و الاِقتصار علیٰ قدر الحاجة فی الدفع، فاذا اندفع المنکر فينبغي ان يکفّ ... فان احتاج الی شهر سلاح و کان يقدر علی دفع المنکر بشهر السلاح وبالجرح فله ان يتعاطی ذلک مالم تثر فتنة[1]

ارتکاب کرنے والے کو ہاتھ اور پیر سے مارا جائے، یا کوئی ایسی سزا دی جائے جس میں ہتھیار کا استعمال نہ ہو۔ یہ عام افراد کے لیے جائز ہے، اس شرط کے ساتھ کہ ضرورت کے وقت یہ اقدام کیا جائے اور منکر کو دفع کرنے کے لیے جس قدر اقدام کی حاجت ہے اسی پر اکتفا کیا جائے۔ جب منکر دفع ہو جائے تو رک جانا چاہیے۔ اگر احتساب کرنے والا ہتھیار نکالنے کی ضرورت محسوس کرے اور وہ اس کو استعمال کر کے اور منکر کا ارتکاب کرنے والے کو زخمی کر کے منکر کو دفع کرنے کی طاقت رکھتا ہو تو اس پر عمل کی اس کو اجازت ہے۔ بشرطے کہ اس سے کوئی فتنہ نہ پیدا ہو۔

منکر کا ارتکاب کرنے والی جماعت کے خلاف طاقت کا استعمال

اب تک ہم نے اس سوال سے بحث کی تھی کہ منکر کا ارتکاب کرنے والے فرد کے خلاف اسلامی ریاست کا کوئی شہری قوت کا استعمال کرسکتا ہے یا نہیں؟ اس کے بعد دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر منکر کا ارتکاب کوئی جماعت کر رہی ہو یا کوئی ایسا شخص کر رہا ہو جس کا مقابلہ تنہا کوئی فرد نہ کر سکے تو کیا وہ اپنے ہم خیال لوگوں کو جمع کر کے اس کے منکر کو مٹانے کی کوشش کرسکتا ہے؟ یہ سوال اہم بھی ہے اور پیچیدہ بھی۔ کیوں کہ اس طرح کے کسی اقدام میں جہاں منکر کے مٹنے اور معروف کے قائم ہونے کا امکان ہے وہاں فتنہ وفساد کا زبردست خطرہ بھی ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

اما جمع الأعوان و شهر الأسلحة فذٰلک قد يجرّ الی فتنة عامة ففيه نظر[2]

مدد کرنے والوں کو جمع کرنا اور ہتھیار نکال لینا، یہ ایسا اقدام ہے جو کبھی عمومی فتنہ کا سبب بن سکتا ہے، اس لیے یہ قابلِ غور مسئلہ ہے۔

---

[1] احیاء علوم الدین: ۲/۳۶۰ [2] ایضاً: ۲/۳۴۳

خود امام غزالیؒ کی رائے اس مسئلے میں یہ ہے کہ تغییرِ منکر کے لیے انسان کو اپنے اعوان و انصار کو جمع کرنے اور جنگ کرنے کی ضرورت کم ہی پڑ سکتی ہے، لیکن اگر ضرورت پڑے تو وہ اپنے اعوان و انصار کے ساتھ منکر کو مٹانے کے لیے جنگ بھی کرسکتا ہے۔ انھوں نے احتساب کے جو آٹھ درجات بیان کیے ہیں ان میں آٹھواں اور سب سے آخری درجہ یہ ہے کہ ”آدمی تغییرِ منکر پر خود قادر نہ ہو اور اس کے لیے ایسے معاونین کا محتاج ہو جو ہتھیار استعمال کرسکتے ہوں۔ اس صورت میں جس فاسق سے مقابلہ ہے، بسا اوقات وہ بھی اپنے اعوان و انصار سے مدد طلب کرسکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ دونوں گروہ صف آرا ہوجائیں اور ایک دوسرے سے جنگ کریں۔ اس صورت کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا اس کے لیے امام کی اجازت کی ضرورت ہے یا نہیں؟ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عام افراد اس کو اپنے طور پر نہیں کرسکتے، کیوں کہ اس سے فتنوں کو تحریک ملے گی، فساد پھیلے گا اور ملک برباد ہوگا۔ اس کے برعکس بعض دوسرے اصحاب کا خیال ہے کہ اس کے لیے امام کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی بات قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ عام افراد کو جب امر بالمعروف کی اجازت ہے اور اس کا پہلا درجہ دوسرے درجے کی طرف اور دوسرا درجہ تیسرے درجے کی طرف لے جاتا ہے تو یہ لامحالہ آٹھویں درجے تک بھی پہنچا سکتا ہے اور مار پیٹ کی نوبت بھی آسکتی ہے۔ مار پیٹ میں اس کا بھی امکان ہے کہ دوسروں سے مدد حاصل کرنی پڑے۔ پس جب امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض انجام دینا ہی ہے تو اس راہ کے فطری لوازم کی، خواہ وہ کتنے ہی سنگین کیوں نہ ہوں، پروا نہیں کرنی چاہیے۔ اس کی آخری حد اللہ کی راہ میں صف آرائی اور اس کے معاصی کو مٹانا ہے۔ جب ہم عام سپاہیوں کو اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ وہ خود آپس میں متحد ہوکر اہلِ کفر کے مختلف فرقوں کے قلع قمع کے لیے جنگ کریں تو اسی طرح اہلِ فساد کی بیخ کنی بھی عام افراد کے لیے جائز ہونی چاہیے۔ مختصر یہ کہ احتساب کے سلسلے میں معاملہ کا اس حد تک پہنچنا شاذ و نادر ہی ہے،

لیکن اس سے قیاس کو بدلا نہیں جاسکتا۔"[۱]

امام غزالیؒ کی اس رائے سے پوری طرح اتفاق کرنا دشوار ہے۔ اگر کسی ریاست کے شہری ایک دوسرے کے خلاف طاقت کو اس وسیع پیمانے پر استعمال کرنے لگیں جس کی امام موصوف نے اجازت دی ہے تو امن و امان کبھی باقی نہیں رہ سکتا، بلکہ ایسا انتشار پھیلے گا کہ خود حکومت بھی اس پر قابو نہیں پا سکے گی۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تغییرِ منکر کے لیے جب ایک فرد دوسرے فرد کو قتل کرسکتا ہے تو اسی مقصد کے لیے کسی جماعت کو دوسری جماعت کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی اجازت کیوں نہیں ہے؟

اس سوال کو حل کرنے کے لیے ہمیں دو باتوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا:

پہلی بات یہ کہ ــــ جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا ــــ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے سلسلے میں کوئی بھی فرد کسی شخص کے قتل کا اقدام اسی وقت کرسکتا ہے جب کہ اس سے کسی فتنے کے پیدا ہونے کا خطرہ نہ ہو۔ اگر فتنے کا خطرہ موجود ہو تو یہ اجازت ختم ہو جائے گی اور اس کے لیے اقدامِ قتل ناجائز ہوگا۔

یہاں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ جماعت کا معاملہ افراد کے معاملے سے مختلف ہے۔ تغییرِ منکر کے لیے اگر ایک فرد دوسرے فرد کے خلاف قوت کا استعمال کرتا ہے تو اس میں فتنہ کا اتنا خطرہ نہیں ہے جتنا کہ ایک جماعت کے دوسری جماعت کے خلاف ہتھیار اٹھانے میں ہے، بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ افراد کے معاملے میں فتنہ و فساد کا خطرہ اگر ایک درجہ کا ہے تو جماعتوں کے معاملے میں یہ بڑھ کر سو درجہ کا ہو جاتا ہے۔ اس لیے جماعتوں کو بعینہٖ افراد پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔

دوسری بات یہ کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے سلسلے میں بلاشبہ افراد کو وقتِ ضرورت کسی کی جان لینے کی بھی اجازت ہے، لیکن یہ اجازت بہت ہی ناگزیر

۱۔ احیاء علوم الدین: ۲/۳٦۱

حالات میں دی گئی ہے۔ ورنہ عام حالات میں تو علماء نے صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ اس کام میں جہاں جنگ اور قتال کی نوبت آئے وہاں اسے حکومت کے حوالے کر دینا چاہیے۔ ذیل میں دو تین علماء کی تصریحات پیش کی جارہی ہیں:

اگر کوئی فرد تغییرِ منکر کے لیے ہتھیار اٹھائے تو ابن عربی مالکی اس کی مخالفت کرتے ہیں، الاّ یہ کہ منکر کی نوعیت ایسی ہو کہ اس کے خلاف ہتھیار اٹھانا ضروری ہو جائے، اور نہ اٹھانے میں کسی بڑے منکر کے وجود میں آنے کا اندیشہ ہو۔ مثال کے طور پر کوئی شخص کسی کی جان لینے کے درپے ہو تو اس کو بچانے کے لیے ظالم کا مقابلہ کیا جائے۔ اس طرح کے مخصوص حالات سے ہٹ کر عام حالات میں ان کا فتویٰ یہ ہے کہ:

فان لم يقدر الاّ بمقاتلة وسلاح فليتركه و ذٰلک انما هُوَ اِلي السلطان لأن شهر السلاح بين الناس قد يكون مخرجا الي الفتنة و ايلا الىٰ الفساد اكثر من الأمر بالمعروف و النهي عن المنكر[1]

اگر کوئی شخص تغییرِ منکر پر سوائے اس کے کسی دوسری صورت سے قادر نہ ہو کہ جنگ کرے اور ہتھیار اٹھائے تو اس کو ترک کر دے، کیونکہ یہ اس کا کام نہیں، بلکہ حاکم کا کام ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام لوگوں کے درمیان ہتھیار کا نکل آنا بعض اوقات فتنے کا سبب بن جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں ایسا فساد پیدا ہوتا ہے جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فائدے کے مقابلے میں بہت بڑا ہوتا ہے۔

امام الحرمین فرماتے ہیں:

يسوغ الاُحاد الرعية ان يصدّ مرتكب الكبيرة ان لم يندفع عنها بقولهٖ ما لم ينته الأمر الى نصب قتال و شهر سلاح، فان انتهىٰ الأمر الىٰ ذٰلک الأمر الىٰ ذٰلک ربط الاَمر بالسلطان[2]

(اسلامی سلطنت کی) رعایا میں سے ہر فرد کے لیے جائز ہے کہ وہ معصیت کبیرہ کا ارتکاب کرنے والے کی مزاحمت کرے اور اسے اس سے روکے، اگر وہ نصیحت اور بات چیت کے بعد بھی معصیت سے دور نہ رہے۔ لیکن یہ اجازت اسی وقت ہے جبکہ نوبت دونوں کے درمیان جنگ کی نہ آجائے۔ اگر معاملہ اس حد کو پہنچ جائے تو وہ حاکم سے متعلق ہو جائے گا۔

---

[1] احکام القرآن: ۱۷۲۰/۴ [2] شرح مسلم للنووی، المجلد الاول، الجزء ۲، ص ۲۳

علّامہ جار اللہ زمخشری کہتے ہیں:

الإنكار الّذى بالقتال، فالإمام و خلفاءهٗ اولٰى لِانّهم اعلم بالسياسة وَمعهم عدتها[1]

جنگ کے ذریعہ نہی عن المنکر کا حق امام اور اس کے خلفاء کو ہے (نہ کو عوام کو)، کیوں کہ وہ سیاست سے زیادہ واقف ہیں اور ان کے پاس اس کا ساز و سامان بھی ہوتا ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے سلسلے میں جب افراد کے لیے بھی، اگر اندیشۂ فساد ہو تو ہتھیار اٹھانے کی مخالفت کی گئی ہے تو جماعتوں کے لیے اس کی اجازت کیسے ہو سکتی ہے؟ ہاں جس طرح ناگزیر حالات میں افراد کو قوت کے ذریعے تغییرِ منکر کا حق ہے اسی طرح یہ حق جماعتوں کو بھی دیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ڈاکوؤں کا کوئی گروہ کسی گاؤں پر حملہ کر دے تو اس گاؤں کے سب ہی لوگوں کی ذمے داری ہے کہ اس کا مقابلہ کریں اور بھگانے کی کوشش کریں، بلکہ اگر ضرورت پڑے تو انھیں اس کی بھی اجازت ہے کہ ڈاکوؤں کو ختم کر دیں۔

ان تفصیلات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ منکر کا ارتکاب کرنے والے کسی گروہ کے خلاف کوئی جماعت اس وقت ہتھیار اٹھا سکتی ہے جب کہ وہ:

۱- اس کام کو حکومت کے حوالے کرنے کی پوزیشن میں نہ ہو۔

۲- اس سے کسی فتنہ و فساد اور امن و امان کے بگڑنے کا اندیشہ نہ ہو۔

۳- ہتھیار نہ اٹھانے میں کسی بڑے منکر کے وجود میں آنے کا ڈر ہو۔

اس کے باوجود اس طرح کے ہر اقدام کی حیثیت ایک استثناء کی ہوگی۔ عام حالات میں صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ کسی بھی جماعت کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے کسی فرد یا گروہ کے خلاف طاقت کے استعمال کی اجازت نہیں ہے۔

---

[1] الکشاف عن حقائق التنزیل: ۱/۳۹۰

❀❀

حدود و آداب

مسلمانوں کی اصلاح و تربیت اور ان کو معروف کا حکم دینا اور منکر سے منع کرنا جتنا اہم کام ہے، اس میں اتنی نزاکت بھی ہے۔ اس کے خاص حدود و آداب ہیں۔ ان کی رعایت کے بغیر اس کا ٹھیک انجام دینا بہت دشوار ہے، بلکہ ان حدود کو توڑنے اور ان آداب کو نظر انداز کرنے کے بعد اس کا بھی امکان ہے کہ معروف کو قائم کرنے کی فکر میں منکر کا ارتکاب ہونے لگے اور تغییرِ منکر کی کوشش میں معروف مٹنے لگے۔ ذیل میں ان حدود و آداب کو کسی قدر تفصیل سے پیش کرنے کی کوشش ہوگی۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرق

امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں اصلاً کوئی فرق نہیں ہے۔ معروف کا حکم دینا حقیقت میں منکر سے روکنا ہے اور منکر سے روکنا معروف کا حکم دینا۔ لیکن اگر ان اصطلاحات کے محض الفاظ پر غور کیا جائے تو ان میں فرق ضرور محسوس ہوتا ہے۔ اس فرق کو ہم اس طرح تعبیر کر سکتے ہیں کہ امر بالمعروف مثبت کام ہے اور نہی عن المنکر منفی کام۔ مثال کے طور پر مسلمانوں کے ساتھ نصح و خیر خواہی، ان کی تعلیم و تربیت، مہماتِ دین میں ان کی ہدایت و راہ نمائی، ان کے ساتھ لطف و محبت کا سلوک، مشکلات میں ان کی دست گیری اور تعاون، یہ اور اس نوعیت کے تمام کام امر بالمعروف کے تحت آتے

ہیں۔ نہی عن المنکر یہ ہے کہ مسلمانوں کو ان تمام عقائد و اعمال سے بچانے کی کوشش کی جائے جو دنیا و آخرت میں ان کے لیے ضرر رساں ہیں[1]

امر بالمعروف کا وجوب اور استحباب

امر بالمعروف ہو یا نہی عن المنکر، ان میں سے ہر ایک کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی مسلمان پر کب وہ واجب ہوتا ہے اور کب اس کی حیثیت محض جواز اور استحباب کی رہ جاتی ہے۔ امر بالمعروف کے بارے میں علماء نے لکھا ہے:

الأمر بالمعروف تابع للمامور به، فان كان واجبًا فالأمر به واجب، وان كان ندبًا فندب[2]

امر بالمعروف (کا وجوب و عدمِ وجوب) اس چیز کے تابع ہے جس کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اگر وہ واجب ہے تو اس کا حکم دینا بھی واجب ہے، اگر وہ مندوب ہے تو اس کا حکم دینا بھی مندوب ہے۔

---

[1] یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے، وہ یہ کہ بعض لوگ منکر اور معصیت کو ایک سمجھتے ہیں، لیکن ان دونوں میں فرق ہے۔ امام غزالیؒ نے اس فرق کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں:
"منکر کا مفہوم بہت وسیع ہے، اس میں جو وسعت ہے وہ معصیت کے لفظ میں نہیں ہے۔ منکر ہر ناپسندیدہ عمل کو کہا جائے گا، قطعِ نظر اس سے کہ وہ کسی مکلف سے صادر ہوا ہے یا غیر مکلف سے، لیکن معصیت کا اطلاق کسی عمل پر اس وقت ہوگا جب کہ اس کا ارتکاب کرنے والا شریعت کی نظر میں گنہ گار قرار پائے۔ فرض کیجیے، کوئی بچہ شراب پی رہا ہے تو وہ قطعاً معصیت کا ارتکاب نہیں کر رہا ہے، کیوں کہ اس پر اس کا کوئی گناہ نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود وہ منکر کا مرتکب ہے، اس لیے اس سے منع کرنا ضروری ہے۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے، وہ یہ کہ کوئی پاگل کسی پاگل عورت سے یا کسی جانور سے زنا کرے تو اس سے بھی منع کیا جائے گا۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس عمل کی ہیئت ناپسندیدہ ہے اور وہ کھلے عام ہو رہا ہے، بلکہ فی نفسہٖ اس کا وقوع ناپسندیدہ ہے۔ اس لیے اگر وہ تنہائی میں ہو تو بھی اس سے منع کرنا ضروری ہے، اسی طرح نہی عن المنکر کے سلسلے میں چھوٹے اور بڑے منکر کے درمیان بھی فرق نہیں کیا جائے گا، بلکہ ہر ایک منکر سے منع کیا جائے گا۔ زنا بہت بڑا منکر ہے اس کے مقابلے میں اجنبی عورت کو دیکھنا اور تنہائی میں اس سے بات چیت کرنا چھوٹا منکر ہے، لیکن اس کے باوجود دونوں سے منع کرنا ضروری ہے۔" (احیاء علوم الدین: ۲/ ۸۵۳)

[2] مبارق الازہار شرح مشارق الانوار: ۱/ ۵۰

نہی عن المنکر کا وجوب اور استحباب

نہی عن المنکر کے بارے میں علامہ ابو السعود کہتے ہیں:

اما النھی عن المنکر فواجب کلہٗ فان جمیع ما انکرہ الشرع حرام[1]

رہا نہی عن المنکر تو (اس کا حکم یہ ہے کہ) ہر منکر سے منع کرنا واجب ہے، کیوں کہ وہ تمام چیزیں جو شریعت کے لیے اجنبی ہیں وہ سب حرام ہیں۔

علامہ موصوف کا یہ خیال درست نہیں ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر دونوں کا ایک حکم ہے، جس طرح معروف کے مختلف درجات ہیں اور ان ہی درجات کے لحاظ سے معروف کا حکم دینا فرض یا مستحب قرار پاتا ہے، اسی طرح منکر کے بھی مختلف مراتب ہیں اور ان ہی مراتب کی بنیاد پر نہی عن المنکر کے وجوب اور عدمِ وجوب کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اسی بات کو ملّا علی قاری نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

اذا کان المنکر حرامًا فانہ حینئذ وجب الزجر عنہ اذ لو کان مکروھًا لم یجب بل یندب، و کذا الاَمر بالمعروف تبع لما یؤمر بہ فان وجب فواجب، وان ندب فمندوب[2]

منکر حرام ہے تو اس پر زجر و توبیخ واجب ہے، لیکن اگر وہ مکروہ ہے تو زجر و توبیخ واجب نہیں، مندوب ہے۔ اسی طرح امر بالمعروف بھی اس چیز کے تابع ہے جس کا حکم دیا جاتا ہے۔ اگر وہ واجب ہے تو امر بالمعروف واجب ہوگا اور اگر مندوب ہے تو امر بالمعروف بھی مندوب ہوگا۔

عدمِ تجسس

شریعت نے تجسس سے منع کیا ہے، اس لیے کسی کی برائیوں کی ٹوہ میں رہنا صحیح نہیں ہے۔ قرآن میں ہے:

وَ لَا تَجَسَّسُوْا (الحجرات:۱۲) ایک دوسرے کے بھید کو نہ ٹٹولو۔

---

۱ ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم: ۲/ ۴۸۹

۲ المبین المعین لفہم الاربعین ص ۱۸۹

رسولِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

ان الأمير اذا ابتغى الريبة فى الناس افسد هم[1]	جب امیر لوگوں میں شکوک تلاش کرے (یعنی شک کی بنیاد پر ان سے بدگمانی کرے) تو ان کو بگاڑ دے گا۔

ایک دوسری روایت میں ہے:

انک ان اتبعتَ عورات الناس افسد تهم[2]	اگر تم لوگوں کے عیوب کا پیچھا کروگے تو ان کو خراب کر دو گے۔

منکر پر گرفت کا حق کسی کو اس وقت حاصل ہوتا ہے، جب کہ کوئی فرد علانیہ کھلم کھلا برائی کا ارتکاب کر رہا ہو۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے کہا گیا کہ فلاں شخص کی داڑھی سے شراب ٹپک رہی ہے تو انھوں نے جواب دیا:

انا قد نهينا عن التجسس ولكن ان يظهر لنا شئ نأخذ به[3]	ہم کو تجسس سے منع کیا گیا ہے، ہاں اگر کوئی ہمارے سامنے آئے تو ہم اس پر گرفت کریں گے۔

شریعت کا حکم ہے کہ کسی سے معصیت کا صدور ہو جائے تو اس کا اعلان نہ کرتا پھرے، بلکہ اس کو چھپادے، تاکہ پورے ماحول میں اس کے چرچے نہ ہوں اور برائی جن حدود میں ہے ان سے آگے نہ پھیلے۔ چناں چہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

من اصاب من هٰذه القاذورات شيئًا فليستتر بستر الله فانه من يبدلنا صفحته نقم عليه كتاب الله[4]	جو شخص ان گندگیوں میں سے کسی گندگی میں ملوث ہوجائے تو اللہ نے اس پر جو پردہ ڈال رکھا ہے اسے ڈالے رہے۔ کیوں کہ اگر کوئی شخص اپنے جرم کو ہمارے سامنے ظاہر کرے گا تو ہم اللہ کا قانون اس پر نافذ کریں گے۔

---

[1] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی التجسس

[2] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی التجسس و رواه البيهقى فى شعب الأيمان، مشکوٰة المصابيح، كتاب الإمارة والقضاء

[3] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی التجسس

[4] موطا امام مالک، کتاب الحدود، باب ماجاء فی من اعترف علىٰ نفسه بالزنا

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنے جرم کو چھپا رہا ہے وہ شریعت کی ہدایت پر عمل کر رہا ہے اور جو اسے نمایاں کرنے اور کھولنے کی فکر میں ہے وہ ایک دوسری برائی کا ارتکاب کر رہا ہے۔ اسی لیے علماء نے لکھا ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی غرض سے یہ جاننے کی کوشش کرنا کہ لوگوں کی پرائیویٹ صحبتوں میں کیا ہو رہا ہے، صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح کسی کی معصیت کی تلاش میں اس کے مکان میں اچانک گھس پڑنا، یا باہر سے تاک جھانک کرنا، یا اس کے ہم سایوں سے معلومات حاصل کرنا غلط ہے۔ کیوں کہ اگر فی الواقع کوئی شخص اپنے مکان میں کوئی غلط کام کر بھی رہا ہے تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کے لیے جواب دہ ہوگا۔ جب تک اس کی معصیت گھر کی چہار دیواری میں محصور ہے، کسی کو اس سے تعرض کرنے کا حق نہیں ہے۔ اس سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ ایک مکان میں جھانک کر دیکھا تو صاحبِ مکان کو کسی منکر کا ارتکاب کرتے پایا۔ حضرت عمرؓ نے اس پر تنقید کی تو اس نے جواب دیا: ”امیر المومنین! میں نے تو اللہ کی ایک نافرمانی کی تھی اور آپ نے اس کی تین نافرمانیاں کی ہیں۔“ حضرت عمرؓ نے پوچھا۔ وہ کیسے؟ اس نے جواب دیا: ”اللہ کا حکم ہے کہ تجسس نہ کرو، آپ نے تجسس کیا۔ اللہ کا حکم ہے کہ گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہو اور آپ نے چھت سے جھانک کر دیکھا۔ اسی طرح اس کا فرمان ہے کہ کسی کے گھر میں اس وقت تک داخل نہ ہو جب تک کہ اس سے اجازت نہ حاصل کر لو اور سلام کر کے داخل ہو، آپ بغیر اجازت داخل بھی ہوئے اور سلام بھی نہیں کیا۔“ اس کا یہ جواب سن کر حضرت عمرؓ نے اسے چھوڑ دیا اور توبہ کا حکم دیا۔[1]

اگر منکر کی علامات بہت ہی واضح ہوں، اس کی ایک مثال یہ ہوسکتی ہے کہ کسی مکان سے گانے بجانے کی آواز آ رہی ہے، یا شرابیوں کا شور و غل سنائی دے رہا ہے، اس صورت میں بھی علامہ ابو الحسن ماوردی کہتے ہیں کہ مکان میں داخل نہیں ہونا چاہیے،

---

[1] احیاء علوم الدین: ۲/ ۳۵۲، ۳۵۳

بلکہ باہر سے اس پر نکیر کرنا چاہیے۔ کیوں کہ ایک برائی تو صاف ظاہر ہوچکی ہے اور اندر جانے میں جو برائیاں چھپی ہوئی ہیں ان کے بھی سامنے آنے کا امکان ہے۔ نہی عن المنکر کے لیے پوشیدہ خرابیوں کا اظہار و اعلان صحیح نہیں ہے۔[1]

امام غزالیؒ کو اس سے اختلاف ہے۔ ان کے نزدیک مذکورہ بالا صورت میں گھر میں داخل ہونے اور لہو ولعب کے سامان کو توڑنے اور شراب کے بہا دینے کی اجازت ہے۔ اسی سلسلے میں مزید وہ فرماتے ہیں کہ کسی کے کپڑوں کی تلاشی لینا کہ کہیں اس میں شراب کی بوتل یا گانے بجانے کا سامان تو نہیں ہے، ناجائز ہے، خواہ وہ شخص فاسق ہی کیوں نہ ہو، لیکن اگر کوئی شخص کھلے بازار میں ستار یا شراب اس طرح لیے جا رہا ہے کہ پتلا سا کپڑا اس پر پڑا ہوا ہے اور وہ پوشیدہ ہونے کے باوجود نمایاں ہے تو نہی عن المنکر کا فرض انجام دینا چاہیے۔[2]

اس معاملہ میں امام غزالیؒ ہی کی رائے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کسی کی نجی زندگی میں مداخلت صحیح نہیں ہے، لیکن جب کوئی عمل اپنی واضح علامات کے ذریعے نجی نہ رہے اور عوام کے علم و اطلاع میں آجائے تو اس پر اقدام کرنا ضروری ہے، ورنہ تغییرِ منکر کا فرض پوری طرح ادا نہ ہوسکے گا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے نظام کے باوجود بہت سے منکرات پرورش پاتے رہیں گے۔

اگر منکر کی نوعیت ایسی ہو کہ بعد میں اس کی تلافی ممکن نہ ہو تو علامہ ماوردی تجسس، چھان بین اور فوری اقدام کی اجازت دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی قابلِ اعتماد آدمی یہ اطلاع دے کہ ایک شخص زنا کرنے جا رہا ہے یا فلاں آدمی فلاں آدمی کو قتل کے ارادے سے آبادی سے باہر لے جا رہا ہے[3] تو یہ ایسی صورت ہے کہ اس میں

---

[1] الاحکام السلطانیۃ، ص: ۲۴۳

[2] احیاء علوم الدین: ۲/ ۳۵۳

[3] الاحکام السلطانیۃ، ص: ۲۴۳

غفلت نہیں کی جاسکتی، کیوں کہ اس میں زنا، عصمت دری اور خونِ ناحق کا اندیشہ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ عدمِ تجسس امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے سلسلے کی ایک اہم شرط ہے۔ البتہ بعض ناگزیر حالات میں تجسس کی بھی اجازت ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

و قد امرنا بأن نستر ما ستر الله و ننكر على من أبدى لنا صفحته

ہم کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ جس چیز کو اللہ نے پوشیدہ رکھا ہے اسے پوشیدہ ہی رکھیں اور جو شخص ہمارے سامنے اپنے جرم کا اظہار کرے اس پر نکیر کریں۔

اسی سلسلے میں مزید فرماتے ہیں:

معنى التجسُّس طلب الأمارات المعرفة فالأمارة المعرفة ان حصلت وأورثت المعرفة جاز العمل بمقتضاها، فاما طلب الأمارة المعرفة فلا رخصة فيه أصلاً[1]

تجسس کے معنی ہیں علم عطا کرنے والی علامات کی تلاش۔ اگر یہ علامات خود بخود حاصل ہوں اور ان سے (منکر کا) علم ہو جائے تو اس کے مطابق عمل کرنا جائز ہے، لیکن ان علامتوں کو تلاش کرنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔

امام غزالیؒ کے ان الفاظ کو اس باب میں قاعدہ کلیہ کی حیثیت دی جاسکتی ہے۔

غیر اختلافی منکرات پر احتساب

صرف اسی منکر پر احتساب ہو جس کا منکر ہونا غیر اختلافی اور متفق علیہ ہو۔ اجتہادی امور میں احتساب کرنا صحیح نہیں ہے۔ امام غزالیؒ احتساب کے شرائط میں سے ایک شرط یہ بیان کرتے ہیں:

ان يكون كونه منكرا معلوما بغير اجتهاد، فكل ما هو محل الاجتهاد فلا حسبة[2]

اس کا منکر ہونا اجتہاد کے بغیر معلوم ہو۔ پس ہر وہ چیز جس کے لیے اجتہاد کی ضرورت پڑے اس پر احتساب نہیں ہوگا۔

---

۱ احیاء علوم الدین: ۲/ ۳۵۳
۲ ایضاً: ۲/ ۳۵۳

اس سلسلے میں امام موصوف نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

"کوئی حنفی کسی شافعی پر اس لیے تنقید نہیں کرسکتا کہ وہ امام شافعیؒ کی پیروی کر رہا ہے اور نہ کسی شافعی کو یہ حق ہے کہ وہ حنفی پر اس لیے احتساب کرے کہ وہ امام ابوحنیفہؒ کا اتباع کر رہا ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص اپنے مسلک ہی کے خلاف عمل کر رہا ہو تو اس پر اس پہلو سے احتساب کیا جاسکتا ہے کہ اس نے اپنی تسلیم شدہ فقہ کی خلاف ورزی کی۔ اس نوعیت کے احتساب کا حق ہر شخص کو حاصل ہے، خواہ وہ خود اس مسلک پر عمل کر رہا ہو یا نہ کر رہا ہو۔ کیوں کہ کسی مقلد کے لیے یہ بات صحیح نہیں ہے کہ وہ وقتِ ضرورت محض سہولت کی خاطر اپنے امام کی پیروی چھوڑ دے اور دوسرے امام کی تقلید شروع کر دے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص مجتہد ہے اور وہ اپنے اجتہاد کے خلاف عمل کر رہا ہے تو اس پر بھی احتساب کیا جائے گا۔ کیوں کہ مجتہد کو اپنے اجتہاد ہی پر عمل کرنا چاہیے، اپنے اجتہاد کو چھوڑ کر دوسرے کے اجتہاد پر عمل کرنا اس کے لیے صحیح نہیں ہے[1]"

جو شخص حکومت کی طرف سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فرض پر مامور ہو اس کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اختلافی امور میں کیا وہ دوسروں کو اپنی رائے اور اجتہاد پر عمل کے لیے مجبور کرسکتا ہے یا نہیں؟ اس معاملے میں اس کی حیثیت احتساب کرنے والے عام افراد ہی کی ہے یا اس سے مختلف؟ علامہ ابوالحسن ماوردی کہتے ہیں کہ شافعی فقہاء نے اس سلسلے میں دونوں طرح کی رائیں ظاہر کی ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ وہ اپنی رائے اور اجتہاد پر عمل کے لیے دوسروں کو مجبور کرسکتا ہے، لیکن بعض دوسرے اصحاب کی رائے ہے کہ اختلافی امور میں اجتہاد کرنے کا حق سب کو حاصل ہے، اس لیے احتساب کرنے والا اپنے اجتہاد پر دوسروں کو مجبور نہیں کرسکتا[2]

ہمارے خیال میں یہی دوسری رائے زیادہ صحیح اور معقول ہے۔ اجتہادی امور

---

[1] احیاء علوم الدین: ۲/ ۳۵۳، ۳۵۴

[2] الاحکام السلطانیۃ، ص ۲۳۰-۲۳۱

میں ایک سے زیادہ رایوں کی گنجائش شریعت نے دی ہے۔ ان میں سے جس رائے کو جو شخص صحیح سمجھے اس پر خود تو عمل کرسکتا ہے، لیکن دوسروں کو مجبور نہیں کرسکتا۔ اس طرح کے معاملات میں کسی ایک رائے کو دوسروں پر مسلط کرنے کے یہ معنی ہوں گے کہ شریعت نے ان میں جو وسعت اور گنجائش رکھی ہے وہ ختم ہوجائے اور افراد غیر ضروری تنگی میں مبتلا ہوجائیں۔ ملاّ علی قاری نے اس سلسلے میں بہت ہی معقول اور روحِ شریعت سے قریب تر بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں:

لاَ انکار فی المختلف فیه بناء علی ان کل مجتهد مصیب او المصیب واحد الاّ ان المخطی غیر متعین لنا مع ان الاِثم موضوع عنه و عمن تبعه.

اختلافی امور میں احتساب نہیں ہوگا، اس بنیاد پر کہ ہر مجتہد راہِ راست پر ہے، یا یہ کہا جاسکتا ہے کہ راہِ راست پر تو ایک ہی ہے، لیکن غلطی کرنے والا ہمارے لیے غیر متعین ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ گناہ اس سے اور اس کی اتباع کرنے والوں سے ساقط ہے۔

اسی سلسلے میں مزید لکھتے ہیں:

لیس له علی الاَصح ان یحمل الناس علی مذهبه، سواء کان مجتهدًا او مقلدًا، فلم یزل الخلاف بین الصحابة و التابعین[1]

زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ محتسب کو اس کا حق نہیں کہ لوگوں کو اپنے مسلک پر مجبور کرے، خواہ وہ مجتہد ہو یا مقلد، (بلکہ ان کو اپنے اپنے مسلک پر عمل کرنے دے، اس لیے کہ) صحابہ اور تابعین کے درمیان بھی اختلاف رہا ہے۔

بدعت پر احتساب ضروری ہے

اجتہاد کا تعلق شریعت کے تفصیلی احکام سے ہے۔ اصولِ دین اور اساساتِ شرع میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص دین کے بنیادی عقائد ہی کو چیلنج کرے تو اسے اجتہادی معاملہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اس پر لازماً احتساب کرنا ہوگا۔ اس طرح کے اصولی اور بنیادی اختلاف کو امام غزالیؒ بدعت سے تعبیر کرتے ہیں اور

---

[1] المبین المعین لفهم الاربعین، ص ۱۹۰

ان کے بارے میں فرماتے ہیں:

البدع کلها ینبغی ان تحسم ابوابها و تنکر علی المبتد عین بدعهم و ان اعتقدوا انها الحق[1]	تمام بدعتوں کے دروازوں کو بند کرنا اور بدعتیوں کی بدعت پر نکیر کرنا چاہیے، خواہ وہ ان کے حق ہونے ہی کا عقیدہ کیوں نہ رکھتے ہوں۔

مخالفِ شرع کتابوں کا احتساب

امام ابن قیم فرماتے ہیں کہ کسی ایسی کتاب کا لکھنا جو قرآن و سنت کے مخالف ہو اور اسے مسلمانوں کے درمیان پھیلانا جائز نہیں ہے۔ اس طرح کی جو کتابیں تصنیف ہوں، شریعت کی طرف سے اجازت ہے کہ ان کو مٹایا اور تلف کر دیا جائے:

الکتب المتضمنة لمخالفة السنة غیر مأذون فیها بل ماذون فی محقها و اتلافها وما علٰی الأمة اضر منها[2]	ایسی کتابیں جو سنت کی مخالفت پر مشتمل ہوں ان کا کوئی جواز نہیں ہے، بلکہ ان کو مٹانے اور ان کے تلف کرنے کی اجازت ہے۔ کیوں کہ امت کے لیے ان سے زیادہ نقصان دہ کوئی چیز نہیں ہے۔

اس سے آگے وہ فرماتے ہیں:

الکتب المشملة علی الکذب و البدعة یجب إتلافها و إعدامها، وهی أولٰی بذٰلک من إتلاف الاَت اللهود والمعازف و إتلاف انیة الخمر، فإن ضررها أعظم من هٰذه[3]	وہ کتابیں جو جھوٹ اور بدعت پر مشتمل ہوں ان کا تلف کرنا اور مٹانا ضروری ہے۔ وہ اس کی زیادہ مستحق ہیں اس کے مقابلے میں کہ لہو ولعب اور گانے بجانے کے آلات اور شراب کے برتن تلف کیے جائیں، کیوں کہ ان کا نقصان ان سب چیزوں سے زیادہ بڑا ہے۔

---

[1] احیاء علوم الدین: ۳۵۵/۲

[2] الطرق الحکمیة فی السیاسة الشرعیة، ص ۲۵۴

[3] حوالہ سابق

مزید فرماتے ہیں کہ ان کتابوں کو تلف کرنے سے کوئی تاوان واجب نہیں ہوتا:

لاَ ضمان فی تحریق الکتب المضلّة و إتلا فها۱ — گم راہ کن کتابوں کے جلانے اور تلف کرنے پر کوئی تاوان نہیں ہے۔

آج کل فکری آزادی کا جو تصور ہے اس کے لحاظ سے کتابوں کے بارے میں یہ رویہ سخت متعصّبانہ معلوم ہوگا، لیکن امتِ مسلمہ کے مفاد کے پہلو سے اس پر غور کیا جائے تو اسے غلط نہیں قرار دیا جاسکتا۔ امتِ مسلمہ ایک متحد الفکر گروہ کا نام ہے۔ اسلام اس امت سے جو کام لینا چاہتا ہے وہ اتحاد کے بغیر ممکن نہیں ہے، اس لیے وہ نہیں چاہتا کہ امت کا فکری اتحاد ختم ہو اور وہ کسی ذہنی ارتداد اور انتشارِ فکر میں گرفتار ہوجائے۔ کیوں کہ جب تک امت کو اپنے فلسفۂ حیات پر پختہ یقین نہ ہو اور اس کی فکری بنیادیں مستحکم نہ ہوں، علم وفن میں وہ مخالف قوتوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی، بلکہ تاریخ کا تجربہ ہے کہ جب بھی اس کا اساسی فکر متزلزل ہوا، غیر اسلامی فلسفوں نے اس کو اپنے اندر جذب کرنا شروع کر دیا اور وہ امت، جس میں اللہ اور رسولؐ کے داعی پیدا ہونے تھے، کفر و الحاد کے علم بردار پیدا ہونے لگے۔

جو کتابیں قرآن وسنت سے ٹکرا رہی ہوں ان کے بارے میں سخت رویہ اختیار کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ امت کے اندر جب بھی فکری اختلاف رونما ہو، تو اسے افہام وتفہیم کے بجائے سختی سے ختم کر دیا جائے، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ امت کو حتی الوسع اپنے دین وایمان پر ثابت قدم رکھنے کی کوشش کی جائے، تاکہ اس میں اپنے اصول ونظریات سے بغاوت نہ پیدا ہونے پائے۔ اس میں اس بات کی ممانعت نہیں ہے کہ فکر کا مقابلہ فکر سے کیا جائے اور علمی وفکری مباحث کا اسی رنگ میں جواب دیا جائے۔ جو کتابیں قرآن وسنت کے خلاف ہوں ان کے بارے میں امام ابن قیم کے نقطۂ نظر کا ابھی ذکر آچکا ہے، وہ بھی ان کی علمی تردید کو نہ صرف مباح، بلکہ حسبِ

---

۱ الطرق الحکمیة فی السیاسة الشرعیة، ص ۲۵۴

ضرورت مستحب اور واجب قرار دیتے ہیں:

اما كتب ابطال الأراء والمذاهب المخالفة لهما فلا بأس بها و قد تكون واجبة و مستحبة و مباحة بحسب اقتضاء حال[1]	ایسی کتابیں جو کتاب وسنت کے مخالف مذاہب و آراء کے ابطال میں ہوں تو ان میں کوئی حرج نہیں ہے۔ وہ کبھی واجب، کبھی مستحب اور کبھی مباح، حالات کے تقاضے کے تحت ہوتی ہیں۔

رشتہ داروں کا احتساب

رشتہ داروں کو معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا ضروری بھی ہے اور اہم بھی، لیکن اس کے کچھ حدود و آداب ہیں۔ ان حدود کی رعایت کے بغیر یہ فرض صحیح طریقے سے انجام نہیں پاسکتا۔ یہاں صرف والدین اور اولاد اور میاں اور بیوی کے درمیان امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے حدود و آداب بیان کیے جا رہے ہیں، کیوں کہ ان رشتوں میں جو نزاکت پائی جاتی ہے وہ دوسرے رشتوں میں نہیں ہے۔

نابالغ اولاد کا احتساب

اولاد دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک بالغ اولاد اور دوسری نابالغ اولاد۔ شریعت نے ان دونوں میں فرق کیا ہے۔ ان پر والدین کے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی نوعیت ایک دوسرے سے کسی قدر مختلف ہے۔

نابالغ اولاد کو معروف کا حکم دینے اور منکر سے منع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو صحیح تعلیم و تربیت دی جائے اور ان کو اس قابل بنایا جائے کہ ہوش سنبھالنے کے بعد وہ اسلام کے مطابق اپنی زندگی بسر کرسکیں۔ حدیثوں میں بچوں کی تعلیم و تربیت کی بڑی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

لأن يؤدب الرجل ولده خير من	آدمی اپنے بچے کو ایک ادب سکھائے اس

---

[1] الطرق الحكمية فی السياسة الشرعية، ص ۲۵۶

ان یتصدق بصاع[۱]	سے بہتر ہے کہ ایک صاع صدقہ کرے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے:

ما نحل والد ولدا من نحل أفضل من أدب حسن[۲]	کسی باپ نے اپنے بچے کو اچھے ادب سے بہتر کوئی عطیہ نہیں دیا۔

بچوں کی تعلیم و تربیت محض کارِ ثواب نہیں ہے، بلکہ یہ والدین کی شرعی ذمے داری ہے۔ اس ذمے داری سے سبکدوش ہونے کے لیے شریعت نے ان کو وقتِ ضرورت اولاد کی تعزیر کا بھی حق دیا ہے۔ چناں چہ ایک حدیث میں ہے:

مروا اولاَدکم بالصلوٰة و هم ابناء سبع سنین و اضربوهم علیها و هم ابناء عشر[۳]	اپنی اولاد کو نماز کا حکم دو جب کہ وہ سات سال کے ہوں اور جب وہ دس سال کے ہوجائیں تو نماز سے غفلت اور کوتاہی پر ان کو مارو۔

حدیث میں صرف نماز کے سلسلے میں سختی کا ذکر ہے، لیکن یہ حکم روزے کا بھی ہے[۴] والدین پر اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت فرض ہے، اس لیے فقہاء نے لکھا ہے کہ وہ ان کو قرآن کے پڑھنے، علمِ دین حاصل کرنے اور اسلامی آداب سیکھنے پر مجبور کرسکتے ہیں[۵]

بچوں کا سرپرست باپ ہے، اس لیے ان کی تعلیم و تربیت کی ذمے داری اصلاً اسی پر عائد ہوتی ہے، لیکن ماں کو بھی اس معاملے میں ایک طرح کی سرپرستی حاصل ہے۔ حضرت مریم کی والدہ نے دعا کی تھی:

رَبِّ اِنِّی نَذَرْتُ لَکَ مَا فِی بَطْنِی مُحَـرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّی اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ○ (آل عمران:۳۵)	اے میرے رب میں اس بچے کو جو میرے پیٹ میں ہے دنیا کے تمام کاموں سے آزاد کر کے تیری نذر کرتی ہوں، تو میری یہ نذر قبول فرما۔ یقیناً تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔

---

[۱] ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی أدب الولد [۲] حوالہ سابق

[۳] ابوداؤد، کتاب الصلوٰة، باب متی یؤمر الغلام بالصلوٰة

[۴] رد المحتار علی الدر المختار: ۲۶۱/۳ [۵] البحر الرائق شرح کنز الدقائق: ۵/ ۹۴

علامہ ابوبکر جصاصؒ اس واقعہ کے ذکر کے بعد کہتے ہیں:

يدلّ على ان للامّ ضربًا من الولاَية على الولد فى تأديبه و تعليمهٔ و إمساكه و تربيته، لولاَ انها تملك ذٰلك لما نذرته فى ولدها[1]

اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ بچے کی تعلیم، تادیب، اسے وقف کرنے اور تربیت کے معاملے میں ماں کو بھی ایک طرح کی سرپرستی حاصل ہے، اگر وہ اس کی حق دار نہ ہوتیں تو اپنے بچے کے سلسلے میں اس کی نذر نہ مانتیں۔

اس لیے جس طرح باپ بچے کی تادیب اور تعزیر کا حق رکھتا ہے۔ اسی طرح ماں کو بھی یہ حق حاصل ہے[2]

بالغ اولاد کا احتساب

کم سن اور نابالغ اولاد کی تادیب اور تعزیر کا والدین کو حق ہے، لیکن جب اولاد بالغ ہوجائے تو والدین کا یہ حق باقی نہیں رہتا، کیوں کہ بالغ اولاد کی حیثیت ایک طرح سے اجنبی کی ہو جاتی ہے۔ چناں چہ ابن عابدین کہتے ہیں:

اما الكبير فكالأجنبي[3]

لیکن لڑکا جو بڑا ہو جائے تو اجنبی کی مانند ہے۔

بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ بچے کے بالغ ہونے کے بعد بھی والدین کو اس کی تادیب کا حق ہے۔ چناں چہ البحر الرائق میں ہے:

ذكر الاَسبيجانى أن للأب أن يؤدب ولده البالغ اذا وقع منه شئ[4]

اسبیجانی نے بیان کیا ہے کہ باپ کو اپنی بالغ اولاد کی تادیب کا حق ہے، اگر اس سے کوئی غلط حرکت سرزد ہو۔

---

[1] احکام القرآن: ۲/ ۱۴

[2] رد المحتار على الدر المختار: ۳/ ۲۶۱

[3] ایضاً

[4] البحر الرائق: ۴/ ۱۷۱

ان دونوں باتوں میں بظاہر تضاد ہے، لیکن حقیقت میں تضاد نہیں ہے، اس کو سمجھنے کے لیے آپ کو نابالغ اور بالغ اولاد کے درمیان فرق کی اس نوعیت کو سامنے رکھنا ہوگا، جو شریعت نے قائم کی ہے۔ وہ یہ کہ نابالغ اولاد غیر مکلّف اور والدین کے تابع ہوتی ہے، اس کے برعکس بالغ اولاد اپنی ایک آزاد اور مستقل حیثیت رکھتی ہے اور اپنے تمام اقوال و افعال کی شرعاً مکلّف اور ذمے دار ہے۔ اس لیے اصولی طور پر یہ بات بالکل صحیح ہے کہ اولاد جب تک نابالغ اور والدین کے تابع ہے اس کی تادیب کا والدین کو حق بھی ہے، لیکن جب اولاد عاقل و بالغ ہوجائے اور والدین کی تابع نہ رہے تو اس کی تادیب کا حق بھی والدین کو نہیں ہے۔ اس اصولی حقیقت کو ماننے کے بعد عملی نقطۂ نظر سے اگر آپ اس مسئلے پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ہر بچہ بالغ ہوتے ہی تمام ذمے داریوں کے اٹھانے کے قابل نہیں ہو جاتا، بلکہ بعض اوقات وہ والدین کی سرپرستی اور تعاون کا مزید ایک عرصے تک محتاج رہتا ہے۔ مثال کے طور پر کوئی باپ عاقل و بالغ اور صاحب الرائے لڑکے کو اپنے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کرسکتا، لیکن اگر لڑکے کے اخلاق و عادات کی طرف سے اطمینان نہ ہو تو باپ کو حق ہے کہ اسے کسی الگ مکان میں رہنے کی اجازت نہ دے اور اپنے ساتھ رکھے[1] یہی نہیں، بلکہ ان حالات میں وہ وقتِ ضرورت اس کی تادیب بھی کرسکتا ہے۔ چناں چہ درمختار میں ہے:

(والغلام اذا عقل واستغنی برأیه لیس للأب ضمه الیٰ نفسه) الاّ اذا لم یکن مأمون علیٰ نفسهٖ فله ضمّه لدفع فتنة أو عار و تأدیبه اذا وقع منه شئ[2]

لڑکا جب سوجھ بوجھ والا اور صاحب الرائے ہوجائے اور دوسروں کی رائے کا محتاج نہ رہے تو باپ کو اسے اپنے ساتھ رکھنے کا حق نہیں ہے، الاّ یہ کہ اس کے بارے میں اطمینان نہ ہو تو فتنہ یا شرمندگی سے بچنے کے لیے باپ اس کو اپنے ساتھ رکھ سکتا ہے اور اگر اس سے کوئی غلط حرکت سرزد ہو تو باپ کو اس کی تادیب کا بھی حق ہے۔

---

[1] البحرالرائق: ۴/ ۱۷۱
[2] الدرالمختار شرح تنویر الابصار: ۲/ ۸۸۳

جن حالات میں باپ کو یہ حق ہے کہ لڑکے کو بالغ ہونے کے باوجود اپنے ساتھ رکھے، علامہ ابن عابدین کہتے ہیں کہ ان حالات میں باپ نہ ہو تو لڑکے کا جو بھی سرپرست ہو اسے یہ حق ملنا چاہیے، کیوں کہ یہ سب سے بڑی صلہ رحمی اور دفعِ منکر ہے اور شریعت نے ان دونوں کا حکم دیا ہے:

و الظاهر ان الجدّ كذلك بل غيره من العصبات كالأخ و العم....فان دفع المنكر واجب علىٰ كل من قدر عليه لاسيما من يلحقه عاره وذلك ايضًا من أعظم صلة الرحم والشرع امر بصلتها وبدفع المنكر ما امكن[1]

بظاہر دادا بھی باپ ہی کی طرح ہے، بلکہ دادا کے علاوہ دوسرے عصبات جیسے بھائی اور چچا بھی اسی حکم میں ہیں ... کیوں کہ منکر کا دفع کرنا ہر اس شخص پر واجب ہے جو اس کی قدرت رکھتا ہو۔ خاص طور پر اس شخص کے لیے جس کو اس کی وجہ سے شرمندگی لاحق ہوتی ہو۔ علاوہ ازیں یہ بہت بڑی صلہ رحمی ہے اور شریعت نے صلہ رحمی اور امکان کی حد تک دفع منکر کا حکم دیا ہے۔

جس طرح بعض حالات میں والدین کو بالغ اولاد کی تعزیر کا حق ہے اسی طرح بعض حالات میں ان پر کچھ ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ اس کی ایک مثال یہاں پیش کی جا رہی ہے۔ لڑکے کے بالغ اور کسب کے قابل ہونے کے بعد باپ پر اس کی معاشی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، لیکن لڑکا اگر اس وجہ سے کمانے کی پوزیشن میں نہیں ہے کہ وہ علمِ دین حاصل کر رہا ہے تو باپ کے لیے اس کا خرچ برداشت کرنا ضروری ہے[2]

اولاد کو فتنہ میں پڑنے سے بچانا نہی عن المنکر ہے تو اس کی تعلیم میں مدد دینا امر بالمعروف ہے گویا، اولاد کے بالغ ہونے کے باوجود والدین کو وقتِ ضرورت ان پر امر بالمعروف بھی کرنا پڑتا ہے اور نہی عن المنکر بھی۔

---

[1] رد المُحتار: ۲/ ۸۸۳

[2] البحر الرائق: ۴/ ۲۰۰

والدین کا احتساب

اولاد کے لیے ماں باپ پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض انجام دینا بہت نازک کام ہے اور اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اگر کسی کے والدین ناواقفیت کی بنا پر ترکِ معروف یا ارتکابِ منکر کر رہے ہوں تو اس کی ذمے داری ہے کہ ان کو احکامِ شریعت بتائے اور نصیحت کرے۔ اس سے آگے ڈانٹ ڈپٹ یا زد وکوب یا قتل تو اس کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔ قرآن میں ہے:

وَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ وَّ لَا تَنْهَرْ هُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا۝ (بنی اسرائیل:۲۳)

انھیں اف تک نہ کہو، انھیں جھڑکو نہیں اور ان سے ادب و احترام سے بات کرو۔

والدین کا اولاد پر یہاں تک حق ہے کہ اگر وہ اولاد کو قتل بھی کردیں تو ان سے قصاص نہیں لیا جائے گا:

لاَ یقاد الوالد لولد[1] اولاد کے عوض باپ کو قتل نہیں کیا جائے گا۔

اسی طرح خود لڑکا بھی باپ سے قصاص نہیں لے سکتا۔ مثال کے طور پر کوئی شخص اپنے لڑکے کی ماں کو قتل کردے تو قصاص لینے کا حق لڑکے سے خود بخود ساقط ہوجائے گا۔[2]

کافر ماں باپ جنگ میں اگر اولاد کے سامنے آجائیں تو حکم ہے کہ اولاد انھیں اپنے ہاتھ سے قتل کرنے سے حتی الوسع بچے، الاّ یہ کہ وہ اس پر حملہ آور ہوں اور اسے اپنی جان بچانے کے لیے اقدامِ قتل کرنا پڑے۔[3]

فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر والدین پر حد واجب ہوجائے تو اولاد ان پر حد نہیں جاری کرے گی۔

---

۱ ترمذی، ابواب الدیات، باب ماجاء فی الرجل یقتل ابنہ یقادام لا

۲ الہدایۃ مع شرحہ العنایۃ علی ہامش فتح القدیر:۸/۲۶۰

۳ جصاص، احکام القرآن: ۲/۳۳۶۔ البحر الرائق:۵/۷۸

اس طرح کی تفصیلات پیش کرنے کے بعد امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

فاذا لم یجز لہ ایذاءہ بعقوبۃ ھی حق علی جنایۃ سابقۃ فلا یجوز لہ ایذاءہ بعقوبۃ ھی منع من جنایۃ مستقبلۃ متوقعۃ بل اولیٰ[۱]

جب لڑکے کے لیے باپ کو ایک ایسی سزا کے ذریعے تکلیف دینا جائز نہیں ہے جو اس کے سابق جرم کی وجہ سے اس پر واجب ہوئی ہے تو اس کے لیے ایک ایسے جرم پر باپ کو سزا دینا، جو آئندہ ہونے والا ہے، بدرجہ اولیٰ ناجائز ہوگا۔

علامہ ابن عابدین نے 'فصول العلامی' کے حوالے سے لکھا ہے کہ آدمی اپنے ماں باپ کو منکر کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھے تو ایک مرتبہ انھیں منع کرے اگر وہ باز آجائیں تو ٹھیک ہے، لیکن یہ بھی ان کو ناگوار گزرے تو خاموش ہوجائے اور دعا کرتا رہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دے اور ان کی غلطیوں سے درگزر فرمائے[۲]

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ والدین اگر کسی منکر کا ارتکاب کر رہے ہوں تو ان کو ہاتھ لگائے بغیر اس منکر کو مٹا دینا چاہیے جس کا وہ ارتکاب کر رہے ہیں[۳] مثال کے طور پر شراب پی رہے ہوں تو ان سے تعرض نہ کیا جائے اور شراب بہادی جائے۔

بیوی کا احتساب

اب آیئے اس سوال پر غور کیا جائے کہ شوہر کے بیوی کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے کیا حدود ہیں؟ اور بیوی کن حدود میں شوہر پر یہ فرض انجام دے سکتی ہے؟ قرآن میں ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَی النِّسَاۤءِ (النساء: ۳۴) مرد عورتوں پر قوام ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام نے خاندان کا جو نظام مقرر کیا ہے اس میں

---

۱ احیاء علوم الدین: ۲/۳۴۶

۲ رد المحتار علی الدر المختار: ۳/۲۶۱

۳ التشریع الجنائی الاسلامی: ۱/ ۵۰۹

شوہر قوام ہے اور بیوی اس کی تابع اور فرماں بردار۔ شوہر کے قوام ہونے کا تقاضا محض یہ نہیں ہے کہ وہ بیوی کا معاشی بوجھ اٹھائے اور گھر کے انتظامی معاملات کی نگرانی کرتا رہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ شوہر بیوی کے دین و دنیا کی فلاح کی سعی کرے اور اس کے اخلاق و سیرت میں جو خامیاں ہوں ان کی اس طرح اصلاح کرے جس طرح کوئی سرپرست اپنے سے چھوٹے کی خامیوں کی اصلاح کرتا ہے۔ علامہ ابن کثیر 'قوام' کی تشریح میں فرماتے ہیں:

الرجل قيّم على المرأة، وَ هو رئيسها و كبيرها و الحاكم عليها ومؤدبها اذا اعوجت[1]

مرد عورت پر قیم ہے، یعنی وہ اس کا سردار، اس کا بزرگ، اس پر حکومت کرنے والا اور جب وہ راہِ راست سے منحرف ہوجائے تو اس کی تادیب کرنے والا ہے۔

جصاص کہتے ہیں:

تضمن قوله الرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ قيامهم عليهن بالتأديب و التدبير و الحفظ و الصيانة[2]

'مرد عورتوں پر قوام ہیں' اللہ تعالیٰ کے اس قول میں مردوں کا اپنی عورتوں کی تادیب، ان کا انتظام اور ان کی حفاظت و نگرانی کرنا بھی شامل ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر فرض کفایہ ہے، لیکن اگر کوئی خاص شخص ہی کسی کے ترکِ معروف یا ارتکابِ منکر سے واقف ہو اور وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی قدرت بھی رکھتا ہو تو یہ کام اس کے لیے فرض کفایہ نہیں، بلکہ فرض عین ہو جاتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی بھی شخص اپنے بیوی بچوں کی خوبیوں اور خامیوں سے جس قدر واقف ہوسکتا ہے، اتنی واقفیت کسی دوسرے کے لیے ممکن نہیں ہے اور پھر ان کی اصلاح کی طاقت اور حقوق بھی شرعاً اسے حاصل ہیں۔ ان دونوں باتوں کو سامنے

---

1. تفسیر ابن کثیر: ۲/ ۳۲۴

2. احکام القرآن: ۲/۲۳۶

رکھ کر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ آدمی کے لیے اپنے بیوی بچوں کی اصلاح ان بے شمار معاملات میں فرضِ عین ہوجائے گی جن سے دوسرے نہ تو واقف ہوسکتے ہیں اور نہ اصلاح کرسکتے ہیں۔ امام نووی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ثم انه قد یتعیّن کما اذا کان فی موضع لاَ یعلم به الاّ هو او لاَ یتمکن من ازالته الاّ هو، وکمن یری زوجته او ولده او غلامه علی منکر او تقصیر فی المعروف[1]

امر بالمعروف و نہی عن المنکر بعض حالات میں فرضِ عین ہو جاتا ہے، جیسے آدمی کسی ایسی جگہ ہو کہ منکر کے ارتکاب سے صرف وہی واقف ہو یا اس کا ازالہ صرف وہی کرسکتا ہو۔ مثلاً جو شخص اپنی بیوی یا اپنی اولاد یا اپنے غلام کو منکر کا ارتکاب کرتے دیکھے یا معروف میں کوتاہی کرتے دیکھے (تو اس پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر واجب ہے)

عورت اگر شوہر کے حقوق ادا نہ کرے اور اس کے حکم کی خلاف ورزی کرے تو شوہر کو اس کی تعزیر کا حق ہے۔ چناں چہ قرآن میں ہے:

وَ الّٰتِي تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَ اهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَ اضْرِبُوْهُنَّ (النساء:۳۴)

جن عورتوں کی سرکشی کا تمھیں ڈر ہو انھیں سمجھاؤ، خواب گاہوں میں ان سے الگ رہو اور انھیں مارو۔

شریعت نے بیوی کی تعزیر کا شوہر کو جو حق دیا ہے اس سے وہ بیوی کو معروف پر عمل کرانے اور منکر سے باز رکھنے میں مدد لے سکتا ہے۔ لیکن یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس حق کے استعمال کے کچھ حدود ہیں۔ ان ہی حدود میں شوہر بیوی کی تعزیر کا مجاز ہے:

(ا) شوہر کو اس وقت بیوی کی تعزیر کا حق ہے جب کہ وہ بغیر کسی عذر شرعی کے اس کی جنسی خواہش پوری کرنے سے انکار کردے یا اس کی حکم عدولی اور اس کے مقابلے میں ترفع اور استکبار کی روش اختیار کرے۔ مثال کے طور پر اس کے ساتھ بدزبانی

---

[1] شرح مسلم: المجلد الاول، الجزء ۲، ص ۲۰

اور جھگڑا کرے، اس کی داڑھی نوچے، اس کے کپڑے پھاڑ دے، اس کے حکم اور استطاعت کے باوجود جائز زیب و زینت ترک کردے، اس کی مرضی کے خلاف گھر کا سازو سامان کسی کو دے دے وغیرہ۔ یا اس سے کوئی غیر اخلاقی حرکت سرزد ہو، جیسے وہ کسی کو گالی دے، اجنبیوں کے سامنے اپنا چہرہ کھول دے، یا ان سے بات چیت کرے، شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے نکل جائے۔ وغیرہ[1]

(۲) عورت اگر اپنے نان و نفقہ کے لیے اصرار اور تقاضا کر رہی ہے تو شوہر اسے سزا نہیں دے سکتا، کیوں کہ یہ اس کا حق ہے اور اپنے حق کے لیے وہ اصرار کرسکتی ہے۔[2]

(۳) شوہر ناحق اور بلا وجہ بیوی کو مار پیٹ کرے تو خود شوہر کی تعزیر کی جائے گی۔[3]

(۴) تعزیر صرف ان ہی منکرات کے ارتکاب پر ہوتی ہے جن کے ارتکاب پر شریعت نے کوئی حد مقرر نہیں کی ہے۔ جن منکرات کے ارتکاب پر شریعت نے حد مقرر کردی ہے ان پر حد جاری ہوگی، تعزیر نہیں ہوگی۔ یہ طے شدہ ہے کہ حد جاری کرنا عوام کا کام نہیں، بلکہ حکام کا فرض ہے، اس لیے شوہر صرف ان ہی منکرات کے ارتکاب پر عورت کی تعزیر کرسکتا ہے جن میں شریعت نے کوئی حد مقرر نہیں کی ہے۔ علامہ کاشانی کہتے ہیں:

اذا ارتکبت معصیة سوی النشوز لیس فیه حدّ مقدّر فللزّوج ان یؤد بها تعزیرًا لها لِاَن للزوج ان	عورت شوہر کی نافرمانی کے علاوہ (بھی) کسی ایسی معصیت کا ارتکاب کرے جس پر کوئی متعین حد نہیں ہے تو شوہر کو بطور تعزیر اس کی تادیب کی اجازت ہے۔ کیوں کہ شوہر کو اپنی

---

[1] کنز الدقائق مع شرحہ البحر الرائق: ۵/ ۴۸، ۴۹

[2] البحر الرائق شرح کنز الدقائق: ۵/ ۴۹

[3] حوالہ سابق

یعزر زوجته کما للمولیٰ ان یعزر مملوکه[1]	بیوی کی تعزیر کا اسی طرح حق ہے جس طرح آقا کو اپنے غلام کی تعزیر کا۔

(۵) بیوی کی تعزیر کی ایک حد ہے، جسے حدیث میں ضربًا غیر مبرّح[2] (ایسی مار جو سخت نہ ہو) کہا گیا ہے۔ اس حد سے آگے بڑھنا شوہر کے لیے ناجائز ہے ضربًا غیر مبرح کی تشریح میں عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں، مسواک یا اس جیسی کسی چیز سے مارنا۔ ایک دوسری روایت میں فرماتے ہیں کہ ایسی ضرب نہیں جس سے اس کی ہڈی ٹوٹ جائے۔ قتادہؒ کہتے ہیں: "ایسی ضرب جس سے اس کے جسم میں کوئی عیب نہ پیدا ہو[3]
اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو بری طرح مار پیٹ دے تو خود اس کی تعزیر کی جائے گی:

ادّعت علیٰ زوجها ضربًا فاحشًا و ثبت ذٰلک علیه عزر[4]	اگر عورت اپنے شوہر کے خلاف بری طرح مار پیٹ کا دعویٰ کرے اور یہ ثابت ہو جائے تو اس کی تعزیر کی جائے گی۔

فقہاء احناف نے یہ بھی لکھا ہے کہ تعزیر کی وجہ سے عورت کی جان چلی جائے تو شوہر پر دیت واجب ہوگی۔[5]

(٦) بیوی اگر شوہر کے حقوق ادا نہیں کر رہی ہے تو شوہر کو اسے نصیحت کرنا چاہیے اور اگر نصیحت کارگر نہ ہو تو قرآن کی ہدایت ہے کہ وہ اپنا بستر اس کے بستر سے الگ کر لے۔ اگر اس سے بھی راہِ راست پر نہ آئے تو شوہر اس کی تعزیر کر سکتا ہے۔ بیوی کی نافرمانی کے ساتھ پہلے ہی قدم پر اس کی تعزیر کا شوہر کو حق نہیں ہے۔[6]

---

[1] بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع: ۲/ ۳۳۴
[2] مسلم، کتاب الحج، باب حجۃ النبیؐ
[3] جامع البیان فی تفسیر القرآن (ابن جریر): ۵/ ۴۱
[4] تنویر الابصار: ۳/ ۲۶۲
[5] ہدایہ مع فتح القدیر: ۴/ ۲۱۷
[6] بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع: ۲/ ۳۳۴

(۷) بعض فقہاء کا خیال ہے کہ عورت کی تعزیر اسی وقت صحیح ہے جب کہ اس سے اس کی اصلاح کی توقع ہو۔ اگر اصلاح کی توقع نہ ہو، یا شوہر یہ سمجھتا ہو کہ بغیر سخت قسم کی سزا کے اس کی اصلاح نہیں ہوسکتی تو تعزیر کی اجازت نہیں ہے۔ ان دونوں صورتوں میں تعزیر شوہر کی زیادتی سمجھی جائے گی[1]

امر بالمعروف و نہی عن المنکر بہت وسیع کام ہے۔ اس میں پوری زندگی کی اصلاح شامل ہے۔ عقیدہ وعبادات کی بھی اور اخلاق و معاملات کی بھی۔ اس کے مقابلے میں شریعت نے شوہر کو بیوی کی تعزیر کا جو حق دیا ہے وہ محدود ہے۔ اس سے وہ چند خاص شعبوں ہی میں بیوی کی اصلاح کر سکتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ بیوی اگر اس حد تک بگڑ جائے کہ وہ نہ صرف شوہر کو تکلیف دے اور اس کے حقوق ادا نہ کرے، بلکہ حقوق اللہ کو بھی نظر انداز کر جائے اور احکامِ شرع کی خلاف ورزی کرنے لگے تو شوہر کو کیا کرنا چاہیے؟ اس کا مختصر سا جواب یہ ہے کہ ایسی بیوی کو طلاق دے دینا چاہیے۔ کیوں کہ بے دین بیوی کے ساتھ زندگی گزارنے سے بہتر ہے کہ اس سے علیحدگی اختیار کرلی جائے۔ چناں چہ البحر الرائق میں غایۃ البیان کے حوالے سے لکھا ہے:

يستحب طلاقها اذا كانت سليطة موذية أو تاركة للصلوٰة لاَ تقيم حدود الله تعالیٰ[2]	اس کا طلاق دینا پسندیدہ ہے جب کہ وہ ہنگامہ کرتی اور تکلیف دیتی ہو، نماز چھوڑ دے اور حدود اللہ کو قائم نہ کرے۔

علامہ ابن عابدین نے اس پر اتنا اضافہ اور کیا ہے:

الظاهر ان ترک الفرائض غير الصلوٰة كالصلوٰة[3]	بظاہر نماز کے علاوہ دوسرے فرائض کا چھوڑنا بھی نماز ہی کے چھوڑنے کے مانند ہے۔

---

[1] التشریع الجنائی الاسلامی: ۱/ ۵۱۶، ۵۱۷

[2] البحر الرائق شرح کنز الدقائق: ۳/ ۲۳۷

[3] رد المحتار علی الدر المختار: ۲/ ۵۷۲

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ ”اللہ تعالیٰ سے میرا اس حال میں ملنا کہ بیوی کا مہر میرے ذمہ ہو، اس سے بہتر ہے کہ میں ایسی عورت کے ساتھ زندگی گزاروں جو نماز نہ پڑھتی ہو۔“[1]

شوہر کا احتساب

عورت شوہر کی تابع اور محکوم ہے۔ بقول امام غزالیؒ شوہر کے مقابلے میں بیوی کی حیثیت ایسی ہے جیسی کہ باپ کے مقابلے میں بچے کی۔ اس لیے شوہر نادانستہ کسی منکر کا ارتکاب کرے تو بیوی اسے شریعت کا حکم بتائے گی اور جانتے بوجھتے وہ منکر کا ارتکاب کر رہا ہو تو اسے نصیحت کرے گی، اس سے آگے ڈانٹ ڈپٹ یا مار پیٹ کا اس کو حق نہیں ہے۔[2]

---

[1] رد المحتار علی الدر المختار: ۲/ ۵۷۲۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی مناسب ہوگا کہ فقہائے احناف کے نزدیک راجح قول یہ ہے کہ نماز کے چھوڑنے پر شوہر بیوی کی تعزیر بھی کرسکتا ہے۔ دیکھئے البحر الرائق: ۵/ ۴۹

[2] احیاء علوم الدین: ۲/ ۳۴۶

ജ്ജ

اوصاف

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کچھ خاص قسم کے اوصاف چاہتا ہے۔ جس شخص میں یہ اوصاف ہوں وہ اس فرض کو ٹھیک ٹھیک اپنے تمام حدود و شرائط کے ساتھ انجام دے سکتا ہے اور جو ان اوصاف سے خالی ہو اس کے لیے اس فرض کا حق ادا کرنا ممکن نہیں ہے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے جو اوصاف مطلوب ہیں ان میں سے بعض کا ذکر گزشتہ مباحث میں ضمناً آچکا ہے۔ یہاں مزید چند اہم صفات کا ذکر کیا جارہا ہے۔

نماز

بندۂ مومن دنیا میں معروف کا قائم کرنے والا اور منکر کا مٹانے والا ہے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ نے انسان کو جس بات کا بھی حکم دیا ہے وہ معروف ہے اور جس چیز سے بھی منع کیا ہے وہ منکر ہے۔ یہ دو لفظ پورے دین کا احاطہ کرتے ہیں۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر حقیقت میں اقامتِ دین کا دوسرا نام ہے۔ اتنا بڑا کام وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں جن کی زندگیاں برائی سے پاک ہوں اور جو اپنے اوپر 'معروف' کو قائم کر چکے ہوں۔ جو شخص خود 'منکر' میں آلودہ ہو وہ دوسروں کو اس سے کیا روک سکتا ہے اور جس کی زندگی میں 'معروف' نہ ہو وہ کس منہ سے دوسروں پر 'معروف' کی تبلیغ کر سکتا ہے؟ دنیا میں انقلاب بے عمل واعظ نہیں لاتے، بلکہ اس کے لیے ایسے باکردار لوگ مطلوب ہیں، جو اپنی بات کے آپ نمونہ ہیں اور جو دوسروں کو کہنے سے پہلے خود عمل کر کے

دکھائیں۔ نماز مومن کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ بہ حسن وخوبی انجام دے سکے، دنیا کو بھلائی کا حکم دے سکے اور برائی سے روک سکے۔ حضرت لقمان علیہ السلام کی نصیحت میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

يَا بُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ اصْبِرْ عَلٰى مَا اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ○ (لقمان:۱۷)	اے میرے بیٹے! نماز قائم کر اور بھلائی کا حکم دے اور برائی سے منع کر اور اس راہ میں جو تکلیف پہنچے اس پر صبر کر۔ یقیناً یہ بڑی عزیمت کا کام ہے۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو 'اقامت صلوٰۃ' کی جو نصیحت کی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کی تکمیل کرے، اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو اور اپنے اندر تقویٰ اور انابت کی کیفیت پیدا کرے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ وہ دوسروں کو دین کی دعوت دے اور ان کی اصلاح و تربیت کی کوشش کرے۔[1] یہ دو الگ الگ کام ہیں، لیکن ان کے درمیان بہت گہرا ربط ہے۔ نماز گو اصطلاحی معنی میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے شرط نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ نماز ہی سے آدمی اس قابل ہوتا ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا بوجھ اٹھا سکے۔ جس شخص کو نماز سے تعلق نہیں ہے اس کے لیے امر بالمعروف و نہی المنکر کی ذمہ داری ادا کرنا اور مستقل ادا کرتے رہنا آسان نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے جن اعلیٰ صفات اور بہترین خوبیوں کی ضرورت ہے وہ نماز ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ جو شخص دنیا کو عیش و تفریح کی جگہ سمجھ کر اس میں گم نہ ہو جائے، بلکہ اسے ایک امتحان گاہ تصور کرے اور اس طرح زندگی گزارے کہ اسے اپنے ایک ایک عمل کی اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہی کرنی ہے، جو اپنے ہر کام میں آخرت کی کام یابی چاہے اور اسی کے لیے اپنی تمام کوششیں صرف

---

[1] ملاحظہ ہو اسی کتاب کی بحث 'وجوب اور اہمیت'۔

کردے، جس کی رَگ رَگ میں اللہ کی یاد اتر جائے اور جو ان تمام کاموں سے کنارہ کش ہوجائے جن میں اللہ تعالیٰ سے غافل انسان دلچسپی لیتے ہیں اور جس کی زندگی فواحش اور منکرات سے بالکل پاک ہو، وہی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے عظیم کام کا حق ادا کرسکتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان اعلیٰ صفات اور بہترین خوبیوں کا سرچشمہ نماز ہے۔ نماز سے زندگی میں اسلامی نقوش ابھرتے ہیں اور اعلیٰ اخلاقیات کی تعمیر ہوتی ہے۔ نماز سے انسان کو ایسی زندگی ملتی ہے جو فحش و منکر سے خالی، اللہ کی یاد سے معمور اور بندگی کے جذبے سے سرشار ہوتی ہے۔ یہی بات قرآن کی اس آیت میں کہی گئی ہے:

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ	نماز قائم کرو، یقیناً نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے۔ (العنکبوت: ۴۵)

اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جو شخص فحش اور منکر کے خلاف جنگ کرنے اور خیر اور معروف کو پھیلانے کے عزم سے میدان میں آئے اس کے لیے نماز کتنی اہمیت رکھتی ہے۔

صبر

حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ساتھ صبر کی نصیحت کی ہے۔ یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر صبر چاہتا ہے۔ بے صبر انسان اس کا اہل نہیں ہوسکتا۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں:

من یأمر بالمعروف و ینھٰی عن المنکر یؤذی فأمرہ بالصَّبر[1]	جو شخص معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے اسے (لوگوں کی طرف سے) تکلیف پہنچائی جاتی ہے۔ اس لیے حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو صبر کا حکم دیا۔

یہی بات سورۂ عصر میں بیان ہوئی ہے۔ وہاں بھی 'تواصی بالحق' کے ساتھ

---

[1] مفاتیح الغیب (التفسیر الکبیر) المجلّد الثالث عشر، الجزء ۲۵، ص ۱۳۱

'تواصی بالصبر' کا حکم ہے۔ تواصی بالحق یہ ہے کہ اہلِ ایمان ایک دوسرے کو اللہ کے دین کی نصیحت کریں۔ یہ دین کو ماننے والوں کے درمیان امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ تواصی بالصبر یہ ہے کہ دین پر قائم رہنے اور اسے فروغ کی راہ میں جو بھی تکلیف آئے اسے جھیلنے کی باہم ترغیب دی جاتی رہے۔ اس سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے صبر کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے صبر کی ضرورت اور اہمیت کا اندازہ امام ابن تیمیہؒ کے اس بیان سے کرسکتے ہیں کہ:

امر اللّٰہ الرسل وھم ائمۃ الآمر بالمعروف والنھی عن المنکر بالصبر[1]	اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو، جو کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے معاملے میں دوسروں کے امام ہیں، صبر کا حکم دیا ہے۔

جب اللہ کے پیغمبروں کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے صبر کی ضرورت تھی تو عام افراد بغیر صبر کے اسے کیسے انجام دے سکتے ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ایک دشوار عمل ہے۔ یہ آدمی کی بہترین صلاحیتوں کو نچوڑ لیتا ہے۔ اس میں قدم قدم پر انسان کی قوتِ برداشت کا امتحان لیا جاتا ہے اور اسے سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ نازک مراحل وہی شخص طے سکتا ہے جس میں مصائب کو جھیلنے کی طاقت ہو، جو چوٹ پر چوٹ کھانے کے باوجود دین پر جمنے کی استطاعت رکھتا ہو، جسے شاہانِ وقت کے سامنے کلمۂ حق کہنے میں باک نہ ہو، جس کے عزم و حوصلہ کا یہ عالم ہو کہ دنیا کی کوئی بھی طاقت اسے سچائی کے اظہار سے باز نہ رکھ سکے اور جس میں اتنی جرأت اور ہمت ہو کہ بڑے سے بڑے جبّار اور ظالم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرسکے۔ اسی طرح امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ انسان پہلے اپنی خواہشاتِ نفس پر غلبہ پائے اور احکامِ الٰہی کا

---

[1] الحسبۃ فی الاسلام، ص ۷۱

تابع ہوجائے، کیوں کہ جس شخص میں اپنے نفس کی خواہشات پر غلبہ پانے کی صلاحیت نہیں ہے وہ دوسروں کو خواہشات کے اتباع سے باز نہیں رکھ سکتا۔ صبر کا وصف ان تمام خوبیوں کا جامع ہے۔ صبر کا وصف ہو تو آدمی اس قابل ہوگا کہ سخت ترین حالات میں بھی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض انجام دے سکے اور مسلسل انجام دیتا رہے، لیکن جو شخص اس وصف سے محروم ہے وہ اس کام کو اس کے شایانِ شان انجام نہیں دے سکتا اور اگر کبھی اس کی ہمت کر بھی گزرے تو ثابت قدم نہیں رہ سکتا۔

عفو و اعراض

قرآن مجید نے عفو، امر بالمعروف اور اعراض کا ایک ساتھ ذکر کیا ہے۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

خُذِ الْعَفْوَ وَ أْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ ○ (الاعراف:۱۹۹)

عفو کی روش اختیار کرو، معروف کا حکم دو اور جاہلوں سے اعراض کرو۔

اس سے واضح ہے کہ امر بالمعروف سے عفو و اعراض کا بہت گہرا تعلق ہے۔ مفسرین نے آیت کے پہلے ٹکڑے 'خُذِ الْعَفْوَ' کے تین معنی بیان کیے ہیں: ایک یہ کہ لوگوں کے ساتھ عفو و درگزر کا برتاؤ کیا جائے، دوسرے یہ کہ ان سے اونچے کردار و عمل کی نہ توقع رکھی جائے اور نہ اس کا تقاضا کیا جائے، بلکہ وہ بغیر کسی زحمت کے جس حد تک عمل کر سکتے ہوں اسے گوارا کیا جائے اور انھیں مشقت میں نہ ڈالا جائے۔ تیسرے یہ کہ مالی مطالبات میں ان پر سختی نہ کی جائے، بلکہ وہ بہ آسانی جو بھی دے سکتے ہوں اسے قبول کرلیا جائے[۱]۔ ظاہر ہے، ان تینوں چیزوں کا تعلق اخلاق سے ہے۔

قرآن نے امر بالمعروف کی ہدایت سے پہلے عفو کی روش اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان امر بالمعروف کے قابل اسی وقت ہوتا ہے جب کہ وہ اخلاقی حیثیت سے بہت بلند ہو۔ جو شخص حلم اور بردباری کا پیکر ہو، جو لوگوں کی

---

۱ ملاحظہ ہو روح المعانی، المجلد الخامس، الجزء ۹، ص ۱۳۷

غلطیوں کو معاف کردے اور جوان کی ظلم و زیادتی اور طعن و تشنیع کو برداشت کرے، اسی کے لیے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی راہ آسان ہوگی۔ پست اخلاق اور جذباتی انسان یہ دشوار گزار گھاٹی طے نہیں کرسکتا۔

عفو اور امر بالمعروف کی ہدایت کے بعد قرآن نے اعراض کا حکم دیا ہے۔ یہ ترتیب ظاہر کرتی ہے کہ انتہائی شرافت اور حسنِ اخلاق کے ساتھ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض انجام دینے کے باوجود مخاطب کی طرف سے جہالت کا مظاہرہ ہو تو آدمی کو اس سے اپنا رخ پھیر لینا چاہیے، کیوں کہ جاہلوں سے اُلجھنا اس شخص کی شان سے فروتر ہے جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر جیسا عظیم مقصد لے کر انسانوں کے درمیان کھڑا ہو۔

قرآن اس کی مخالفت نہیں کرتا کہ کسی مسئلہ پر معقولیت سے بحث کی جائے، لیکن جہاں بات کو سمجھنے کا جذبہ نہ ہو اور محض کٹ حجتی اور ہٹ دھرمی سے معقول سے معقول دلیل کو رد کیا جا رہا ہو، وہاں اس کی ہدایت یہ ہے کہ آدمی جوابی کارروائی میں اپنا وقت نہ ضائع کرے اور سکوت اختیار کرے۔

عفو اور اعراض کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص اللہ اور رسولؐ سے بغاوت کردے تو اس کے ساتھ مداہنت برتی جائے، یا جن اعمال کی ادائیگی سے کوئی بھی فرد مستثنیٰ نہیں ہے ان میں ڈھیل دی جائے اور جن حقوق کا ادا کرنا ہر ایک کے لیے ضروری ہے ان میں نرمی کی جائے، کیوں کہ اس قسم کے معاملات میں نرمی یا غفلت سے شریعت کا سارا نظام ہی درہم برہم ہو کر رہ جائے گا اور ہر شخص من مانی کرنے لگے گا۔ عفو اور اعراض کا تعلق عام اخلاقیات اور انسانی سلوک سے ہے، حقوق اور واجبات سے نہیں ہے۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ عفو اور امر بالمعروف کے احکام کی نوعیت سے بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

الحقوق التی تستوفی من الناس و توخذ منهم اما ان یجوز ادخال	وہ حقوق جو انسانوں سے حاصل کیے جاتے ہیں ان کی دو قسمیں ہیں: یا تو ان میں ڈھیل

المساهلة و المسامحة فيها و اما ان لاّ يجوز، اما القســم الْاَول فهو المراد بقوله خُذِ العَفوَ و يدخل فيه ترک التشدّد فی کل ما یتعلق بالحقوق المالية، و يدخل فيه ايضا التخلق مع الناس بالخلق الطیب و ترک الغلظة والفضاضة...... و من هذا الباب ان يدعو الخلق الی الدين الحق بالرفق و اللطف ...... و اما القسم الثانی و هو الذی لاَ يجوز دخول المساهلة و المسامحة فيه فالحكم فيه ان يأمر بالمعروف، و العرف و العارفة و المعروف هو کل أمرعرف انه لاَبد من الاتيان به وان وجود ہ خير من عدمه، و ذٰلک لأن فی هــذا القسم لو اقتصر علی الأخــذ بالعفو و لم يأمــر بالعــرف ولم يكشف عــن حقيقة الحــال لكان ذٰلک سعيًا فی تغيير الــدين و ابطال الحق و انه لاَ يجوز[1]

دی جاسکتی ہے اور صرفِ نظر ممکن ہے یا یہ بات ممکن نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمانا کہ ’درگزر کی روش اختیار کرو‘ پہلی قسم سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی میں یہ بات بھی شامل ہے کہ مالی حقوق میں سختی نہ کی جائے، لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق کا برتاؤ کیا جائے اور تحقیر اور درشتی کا سلوک نہ کیا جائے... اسی کے تحت یہ بات بھی آتی ہے کہ لوگوں کو نرمی اور ملاطفت کے ساتھ دینِ حق کی دعوت دی جائے... دوسری قسم وہ ہے جس میں درگزر کرنا اور نظرانداز کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس کے بارے میں ’امر بالمعروف‘ کا حکم ہے۔ ’عرف، عارفہ اور معروف ہر اس کام کو کہتے ہیں جو اس حیثیت سے جانا پہچانا جائے کہ اس کا ادا کرنا ضروری ہے اور اس کے موجود نہ ہونے سے اس کا موجود ہونا بہتر ہے۔ اگر اس دوسری قسم میں بھی درگزر سے کام لیا جائے، معروف کا حکم نہ دیا جائے اور حقیقت حال کھولی نہ جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ دین کو بدلنے اور حق کو مٹانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ظاہر ہے یہ رویہّ صحیح نہیں ہے۔

ابن جریر طبریؒ اعراض کے بارے میں فرماتے ہیں:

---

[1] مفاتیح الغیب (التفسیر الکبیر)، المجلد الثامن، الجزء ۱۵، ص۷۸

ذٰلک و ان کان امرًا من اللّٰہ نبیه به فانه تادیب منه عز ذکره لخلقه باحتمال من ظلمهم او اعتدی علیهم لاَ بالاَعراض عمن جهل الواجب علیه من حق اللّٰه ولاَ بالصفح عمن کفر باللّٰہ و جهل وحدانیته و هو للمسلمین حرب[1]

یہ گوکہ اللہ کی طرف سے اپنے نبی کو اعراض کا حکم ہے، لیکن اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو یہ ادب سکھایا ہے کہ جوان پر ظلم و زیادتی کرے اسے وہ برداشت کریں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو شخص اللہ کے لازمی حق کے مقابلہ میں سرکشی کا رویہ اختیار کرے اس سے بھی اعراض کیا جائے اور نہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اللہ کے ساتھ کفر اور اس کی وحدانیت کا انکار کرے اس سے درگزر کیا جائے، کیوں کہ ایسا شخص مسلمانوں کا محارب ہے۔

اخلاص

اخلاص ہر کام کی جان ہے۔ دنیا جن کاموں کو عظیم سمجھتی ہے وہ بھی اللہ کے نزدیک بے وزن ہیں اگر ان سے روحِ اخلاص نکل جائے۔ اس لیے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض انجام دیتے وقت آدمی کو اپنی نیت کا بار بار جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ کہیں اس میں کوئی کھوٹ تو نہیں ہے، اس کے اخلاص کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچ رہا ہے اور وہ اللہ کی رضا کے علاوہ کوئی دوسری چیز تو نہیں چاہ رہا ہے؟

امر بالمعروف و نہی عن المنکر دین کی خدمت اور انسان کے لیے بہت بڑی سعادت ہے۔ اتنی بڑی سعادت کہ اس سے بڑی سعادت کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ یہ سعادت ان لوگوں کو ملتی ہے جو سراپا اخلاص ہوں اور جو اپنی شخصیت کو رضائے الٰہی کی طلب میں گم کردیں اور جو آخرت کی کامیابی کے سوا کوئی دوسری چیز نہ چاہتے ہوں۔ لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے کام میں اخلاص کا باقی رہنا بہت مشکل ہے۔ جب آدمی بڑے بڑے مجمعوں میں حق کی ترجمانی کے لیے کھڑا ہو،

---

[1] جامع البیان فی تفسیر القرآن: ۹/ ۹۸

جب اس کی تحریریں بے شمار انسان پڑھتے ہوں، جب وہ بے خوف ہوکر باطل کو چیلنج کر رہا ہو، جب اس کی خدمتِ دین، اس کی استقامت اور اس کی قربانیوں کا ہر طرف چرچا ہو اور جب تعریف کرنے والی زبانیں اس کی مدح سرائی میں مصروف ہوں تو اس بات کا سخت خطرہ ہے کہ اس کے اندر شہرت، نام آوری اور ریا کا جذبہ ابھر آئے۔ اس جذبے کے ابھر آنے کے بعد امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے خواہ مخاطب کو فائدہ پہنچ جائے، لیکن اس فرض کا انجام دینے والا یقیناً اس کے نفع سے محروم ہی رہے گا، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ آدمی میں خلوص اور للّٰہیت نہیں ہے تو وہ اپنی تبلیغ و نصیحت سے دوسروں کو بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ امر بالمعروف و نہی المنکر کے نتیجہ خیز ہونے اور اس راہ میں اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اخلاص کے ساتھ یہ فرض انجام دے رہا ہو۔ چناں چہ ان کے الفاظ ہیں:

من اهم شروط الأمر بالمعروف و النهى عن المنكر ان يكون صاحبه مخلصًا فى فعله طالبًا إظهار دين الله و إعلاء كلمته و إطاعة أمره فى بريته دون الرياء و السمعة و الحمية لنفسه و طبيعته فانما ينصر و يزول به المنكر اذا كان صادقًا و فى مقام الإخلاص موافقًا، قال الله تعالىٰ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَ يُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ[1]	امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ایک اہم شرط یہ ہے کہ اس کام کا کرنے والا اپنے کام میں مخلص ہو اور اس سے اس کا مقصد یہ ہو کہ اللہ کا دین غالب اور اس کا کلمہ بلند ہو اور اس کی مخلوق اس کے احکام کی تابع ہوجائے، ساتھ ہی اس میں ریا اور شہرت کا اور اپنے نفس اور مزاج کی حمیت کا جذبہ نہ ہو۔ اگر وہ اپنے عمل میں سچا ہے اور اخلاص کے مقام پر کھڑا ہے تو یقیناً اس کی مدد ہوگی اور منکر زائل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ”اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا اور تمھیں ثابت قدم رکھے گا۔“

جو شخص امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض انجام دے اسے اس حقیقت کو

---

[1] المبین المعین لفہم الاربعین، ص ۱۹۳، ۱۹۴

نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ ایک ایسا مقدس عمل انجام دے رہا ہے جس کے لیے اللہ کے پیغمبروں کی بعثت ہوئی تھی اور جسے محمد ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ نے انجام دیا تھا۔ اس لیے اگر اس کے اندر پیغمبروں اور ان کے ساتھیوں کے اخلاص کی معمولی سی جھلک بھی نہیں ہے تو وہ کسی طرح ان کا جانشین نہیں ہوسکتا۔ اخلاص کے بغیر جو شخص امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض انجام دیتا ہے گو بظاہر وہ پیغمبرانہ کام انجام دیتا ہے، لیکن یہ کام اس روح سے خالی ہے جو پیغمبروں کے کام میں ہوتی ہے۔ نظام الدین نیشا پوری امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے بعض حدود وآداب بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

كل ذٰلك ايمانًا و احتسابًا لاَ سمعة ولاَ رياءاً ولاَ لغرض من الاَغراض النفسانية و الجسمانية، وذٰلك ان هٰذه الدعوة منصب النبىؐ وخلفائه الراشدين بعده[1]	یہ سب کچھ ایمان کے جذبے اور ثواب کی نیت سے ہو، نہ کہ شہرت، ریا اور نفس و جسم کی کسی غرض کی تکمیل کے لیے، اس لیے کہ یہ دعوت نبیؐ اور آپؐ کے بعد خلفائے راشدین کا منصب ہے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض ایک بڑے مقصد کے لیے انجام دیا جاتا ہے، وہ یہ کہ اللہ کی زمین پر اس کا کلمہ بلند ہو اور اس کا دین غالب آئے۔ انسان اللہ کا بندہ بن جائے اور باطل سے نجات پائے۔ یہ بہت ہی مقدس کام ہے، اس میں اگر اخلاص نہیں ہے تو ہوسکتا ہے کہ اس سے انسان کے نفس کی تسکین ہوجائے اور دنیا میں اس کی تعریف ہونے لگے، لیکن اللہ کے ہاں اس کے اجر کی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی۔

---

[1] غرائب القرآن ورغائب الفرقان (علیٰ ہامش ابن جریر): ۴/ ۳۲-۳۱

✿

مآخذ

کتاب میں قرآن مجید کی آیات کے نیچے سورتوں کے نام اور آیات کے نمبر دے دیے گئے ہیں۔ دوسرے مآخذ کے حوالے حواشی میں ہیں۔ وہاں ان کے مصنفین، مطابع اور سنینِ طباعت کی تفصیل نہیں دی گئی ہے۔ یہاں اس کی تفصیل دی جا رہی ہے، تا کہ مراجعت میں آسانی ہو۔ البتہ حدیث کی جن کتابوں کے حوالے کتب و ابواب کی صراحت کے ساتھ دیے گئے ہیں ان کے مطابع کے ذکر کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

۱۔ قرآن مجید ـــــ منزل من اللہ

	مصنف	کتاب	موضوع	مطبع وسنہ طباعت
	الف			
۲۔	ابن الاثیر: مجد الدین ابو السعادات المبارک ابن محمد بن محمد الجزری	النھایۃ فی غریب الحدیث و الاثر	لغات حدیث	دار احیاء التراث العربی بیروت، لبنان
۳۔	ابن بدران: عبد القادر احمد بن مصطفیٰ الدمشقی	المدخل الی مذہب الامام احمد بن حنبل	اصول فقہ	ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ مصر
۴۔	ابن تیمیہ: تقی الدین ابو العباس احمد بن تیمیۃ الحرانی	مجموعہ فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ	فتاویٰ	مطبعۃ کردستان العلمیۃ، مصر، ۱۳۲۶ھ
۵۔	"	شرح العقیدہ الاصفہانیۃ	عقائد	فتاویٰ کی پانچویں جلد میں شامل ہے۔
۶۔	"	الوصیۃ الکبریٰ		مجموعۃ الرسائل الکبریٰ الجزء الاول میں شامل ہے، مطبوعۃ المطبعۃ العامرۃ، مصر، ۱۳۲۳ھ

نمبر	مصنف	کتاب	موضوع	ناشر
۷-	ابن تیمیہ: تقی الدین ابوالعباس احمد بن تیمیہ الحرانی	الحسبۃ فی الاسلام	سیاست	دار الکتاب العربی، بیروت
۸-	"	رسالۃ العبودیۃ	کلام	المکتب الاسلامی للطباعۃ والنشر بیروت، لبنان
۹-	ابن جریر: ابوجعفر محمد بن جریر الطبری	جامع البیان فی تفسیر القرآن	تفسیر	المطبعۃ المیمنیۃ مصر، ۱۳۲۱ھ
۱۰-	ابن حجر: شہاب الدین ابوالفضل احمد بن علی ابن حجر العسقلانی	فتح الباری	شرح حدیث	المطبعۃ الخیریۃ، مصر، ۱۳۲۹ھ
۱۱-	"	تہذیب التہذیب	اسماء الرجال	دائرۃ المعارف العثمانیۃ، حیدر آباد ۱۳۲۵ھ
۱۲-	"	لسان المیزان	اسماء الرجال	دائرۃ المعارف العثمانیۃ، حیدر آباد، ۱۳۲۹ھ
۱۳-	ابن حجر: احمد بن حجر الہیتمی	فتح المبین لشرح الاربعین	شرح حدیث	المطبعۃ العامرۃ، مصر، ۱۳۲۰ھ
۱۴-	"	الزواجر عن اقتراف الکبائر	تصوف	دار الکتب العلمیۃ، بیروت لبنان
۱۵-	ابن حزم: ابومحمد علی بن احمد	الفصل فی الملل والاہواء والنحل (الجزء الرابع)	مذاہب و فرق	دار الکتب العلمیۃ، بیروت لبنان، ۱۹۹۶ء
۱۶-	ابن خلدون: عبدالرحمٰن بن محمد بن خلدون الحضرمی	مقدمۃ ابن خلدون	تاریخ	مؤسسۃ الکتب الثقافیۃ بیروت، لبنان، ۱۹۹۷ء
۱۷-	ابن رجب: ابوالفرج عبدالرحمٰن بن رجب الحنبلی	کشف الکربۃ فی وصف حال اہل الغربۃ	شرح حدیث	المطبعۃ المحمودیۃ، مصر
۱۸-	ابن عابدین: محمد امین الشہیر بابن عابدین	رد المحتار علی الدر المختار	فقہ	المطبعۃ العثمانیۃ مصر، ۱۳۲۷ھ
۱۹-	ابن العربی: القاضی محمد بن عبداللہ المعروف بابن العربی المالکی	احکام القرآن	احکام القرآن	مطبعۃ السعادۃ، مصر، ۱۳۳۱ھ
۲۰-	ابن القیم: شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن ابی بکر المعروف بابن قیم الجوزیۃ	اعلام الموقعین عن رب العالمین	فقہ	دار الکتب العلمیۃ، بیروت لبنان، ۱۹۹۶ء

نمبر	مصنف	کتاب	موضوع	مطبع
۲۱-	"	مدارج السالکین بین منازل ایاک نعبد وایاک نستعین	تصوف	مطبعۃ المنار، مصر، ۱۳۳۲ھ
۲۲-	"	الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ	سیاست	مطبعۃ الآداب، مصر، ۱۳۱۷ھ
۲۳-	ابن کثیر: عماد الدین اسماعیل بن کثیر القرشی الدمشقی	تفسیر القرآن العظیم	تفسیر	دار الحدیث القاہرہ ۲۰۰۲ء
۲۴-	ابن ماجہ: ابوعبداللہ محمد بن یزید بن عبداللہ بن ماجہ القزوینی	سنن ابن ماجہ	حدیث	
۲۵-	ابن الملک: عزالدین عبد اللطیف بن عبدالعزیز المعروف بابن الملک	مبارق الازہار فی شرح مشارق الانوار	شرح حدیث	مطبعہ احمد کامل آفندی، مصر، ۱۳۲۹ھ
۲۶-	ابن نجیم: زین الدین الشہیر بابن نجیم	البحر الرائق شرح کنز الدقائق	فقہ	دار الکتب العربیۃ الکبریٰ، مصر، ۱۳۳۴ھ
۲۷-	ابن الہمام: کمال الدین محمد بن عبدالواحد المعروف بابن الہمام الحنفی	فتح القدیر	فقہ	المطبعۃ الکبری الامیریۃ مصر، ۱۳۱۵ھ
۲۸-	احمد بن حنبل	المسند	حدیث	المطبعۃ المیمنیۃ، مصر، ۱۳۱۳ھ
۲۹-	آلوسی: شہاب الدین السید محمود الآلوسی البغدادی	روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی	تفسیر	دار الکتب العلمیۃ بیروت، لبنان ۱۹۹۴ء
۳۰-	آمدی: سیف الدین ابوالحسن علی بن ابی علی بن محمد الآمدی	الاِحکام فی اصول الاَحکام	اصولِ فقہ	مطبعۃ المعارف، مصر، ۱۳۳۲ھ
۳۱-	امیر الصنعانی: محمد بن اسمٰعیل بن صلاح الامیر الکحلانی ثم الصنعانی	سبل السلام شرح بلوغ المرام	شرح حدیث	دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان
۳۲-	ابوحیان: اثیر الدین ابوحیان محمد بن یوسف بن علی الاندلسی	البحر المحیط	تفسیر	مطبعۃ السعادۃ، مصر، ۱۳۲۸ھ

نمبر	مصنف	کتاب	موضوع	کیفیت
۳۳-	ابوداؤد: سلیمان بن اشعث السجستانی	سنن ابی داؤد	حدیث	
۳۴-	ابوالسعود	ارشاد العقل السلیم الیٰ مزایا الکتاب الکریم	تفسیر	تفسیر کبیر رازی، طبع المطبعۃ العامرۃ مصر ۱۳۰۸ھ کے حاشیہ پر چھپی ہے۔

ب

نمبر	مصنف	کتاب	موضوع	کیفیت
۳۵-	بابرتی: اکمل الدین محمد بن محمود البابرتی	العنایۃ (شرح الہدایہ)	فقہ	۲۷ کے حاشیہ پر چھپی ہے
۳۶-	بخاری: محمد بن اسمٰعیل البخاری	صحیح البخاری	حدیث	
۳۷-	بغوی: محمد حسین بن مسعود الفراء البغوی	معالم التنزیل	تفسیر	خازن کے حاشیہ پر چھپی ہے۔ دیکھئے نمبر ۴۴
۳۸-	بیضاوی: القاضی ناصر الدین عبد اللہ البیضاوی	انوار التنزیل و اسرار التاویل	تفسیر	دار الکتب العلمیۃ، بیروت ۱۹۸۸ء

ت

نمبر	مصنف	کتاب	موضوع	کیفیت
۳۹-	ترمذی: ابوعیسیٰ الترمذی	جامع الترمذی	حدیث	
۴۰-	تفتازانی: سعد الدین عمر التفتازانی	شرح المقاصد	عقائد	عالم الکتب، بیروت
۴۱-	جصاص: ابوبکر احمد بن علی الرازی الجصاص الحنفی	احکام القرآن	احکام القرآن	دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، ۱۹۹۴ء

ح

نمبر	مصنف	کتاب	موضوع	کیفیت
۴۲-	حاکم: ابوعبد اللہ محمد بن عبد اللہ المعروف بالحاکم النیسابوری	المستدرک علی الصحیحین فی الحدیث	حدیث	دائرۃ المعارف العثمانیۃ حیدر آباد، دکن، ۱۳۳۴ھ
۴۳-	حقی آفندی: ابو الفداء اسمٰعیل المقلب بالحقی آفندی	روح البیان	تفسیر	دار الطباعۃ العامرۃ، استنبول، ۱۲۸۵ھ

خ

نمبر	مصنف	کتاب	موضوع	ناشر
۴۴-	خازن: علاء الدین علی ابن محمد بن ابراہیم البغدادی المعروف الخازن	لباب التاویل فی معانی التنزیل (المعروف بالتفسیر الخازن)	تفسیر	دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان
۴۵-	خطابی: ابوسلیمان احمد بن محمد الخطابی	معالم السنن	شرح حدیث	المطبعۃ العلمیۃ حلب، ۱۳۵۱ھ
۴۶-	خطیب التبریزی: ولی الدین محمد بن عبد اللہ الخطیب التبریزی	مشکوٰۃ المصابیح	حدیث	دار الفکر، بیروت لبنان، ۱۹۹۱ء

د

نمبر	مصنف	کتاب	موضوع	ناشر
۴۷-	دارمی: ابومحمد عبد اللہ الدارمی	سنن الدارمی	حدیث	

ر

نمبر	مصنف	کتاب	موضوع	ناشر
۴۸-	رازی: فخر الدین محمد الرازی	مفاتیح الغیب (التفسیر الکبیر)	تفسیر	دار الکتب العلمیۃ، بیروت لبنان، ۱۹۹۰ء
۴۹-	راغب: ابو القاسم الحسین بن محمد بن الفضل الراغب الاصفہانی	المفردات فی غریب القرآن	لغات القرآن	دار المعرفۃ، بیروت لبنان، ۱۹۹۸ء
۵۰-	رشید رضا: السید محمد رشید رضا	تفسیر القرآن الحکیم (تفسیر المنار)	تفسیر	دار المنار مصر، ۱۳۶۵ھ

ز

نمبر	مصنف	کتاب	موضوع	ناشر
۵۱-	زمخشری: ابو القاسم جار اللہ محمود بن عمر الزمخشری	الکشاف عن حقائق التنزیل	تفسیر	دار الکتب العلمیۃ بیروت، لبنان، ۱۹۹۵ء

س

نمبر	مصنف	کتاب	موضوع	ناشر
۵۲-	سیوطی: جلال الدین السیوطی	تفسیر الجلالین	تفسیر	حاشیہ الصاوی کے حاشیہ پر چھپی ہے۔ دیکھئے ۶۰

ش

نمبر	مصنف	کتاب	موضوع	مطبع
۵۳-	شاطبی: ابو اسحٰق ابراہیم بن موسیٰ الشاطبی	الموافقات فی اصول الشریعۃ	اصول فقہ	المطبعۃ الرحمانیہ مصر سے شیخ عبداللہ دراز کی شرح و تعلیق کے ساتھ چھپی ہے۔
۵۴-	شاہ ولی اللہ: الشیخ احمد المعروف بشاہ ولی اللہ دہلوی	حجۃ اللہ البالغہ	حکمتِ دین	یونین پرنٹنگ پریس دہلی
۵۵-	"	ازالۃ الخفاء عن تاریخ الخلفاء	تاریخ	مطبع صدیقی بریلی، ۱۲۸۶ھ
۵۶-	شربینی: محمد الشربینی الخطیب	السراج المنیر فی الاعانۃ علی معرفۃ بعض معانی کلام ربنا الحکیم الخبیر	تفسیر	مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ
۵۷-	شوکانی: محمد بن علی بن محمد الشوکانی	فتح القدیر الجامع بین فنی الروایۃ والدرایۃ من علم التفسیر	تفسیر	دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان ۱۹۹۴ء
۵۸-	"	ارشاد الفحول الی تحقیق الحق من علم الاصول	اصولِ فقہ	مطبعۃ السعادۃ مصر، ۱۳۲۷ھ
۵۹-	"	الدواء العاجل فی دفع العدو الصائل	امر بالمعروف ونہی عن المنکر	مجموعۃ الرسائل المنیریۃ جزء ثانی میں شامل ہے۔ مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ مصر، ۱۳۴۳ھ

ص

نمبر	مصنف	کتاب	موضوع	مطبع
۶۰-	صاوی: الشیخ احمد الصاوی	حاشیہ الصاوی علی تفسیر الجلالین	تفسیر	المطبعۃ الازہریۃ مصر، ۱۳۴۷ھ
۶۱-	صدیق حسن خاں: ابو الطیب صدیق بن حسن القنوجی	فتح البیان فی مقاصد القرآن	تفسیر	المطبعۃ الکبریٰ، مصر، ۱۳۰۱ھ

ط

نمبر	مصنف	کتاب	فن	مطبع
۶۲-	طوری: محمد بن حسین بن علی الطوری	تکملہ البحر الرائق شرح کنز الدقائق	فقہ	دار الکتب العربیۃ الکبریٰ، ۱۳۳۴ھ

ع

نمبر	مصنف	کتاب	فن	مطبع
۶۳-	عبد الحق محدث دہلویؒ	اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ المصابیح (فارسی)	شرح حدیث	مطبع تیج کمار، لکھنؤ، ۱۹۶۴ء
۶۴-	عبد الحق: محمد عبد الحق المہاجر الہندی المکی	الاکلیل علیٰ مدارک التنزیل	تفسیر	اکلیل المطابع بہرائچ
۶۵-	عبد العلی: عبد العلی محمد بن نظام الدین الانصاری	فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت	اصولِ فقہ	المستصفیٰ من علم الاصول کے ساتھ المطبعۃ الامیریۃ مصر سے چھپی ہے۔ ۱۳۲۲ھ
۶۶-	عبد القادر عودہ	التشریع الجنائی الاسلامی مقارنا بالقانون الوضعی	فقہ	مطبعۃ دار نشر الثقافۃ، اسکندریۃ، مصر، ۱۳۶۸ھ
۶۷-	علاء الدین: محمد علاء الدین الحنفی	الدر المختار فی شرح تنویر الابصار	فقہ	۱۸ کے حاشیہ پر چھپی ہے

غ

نمبر	مصنف	کتاب	فن	مطبع
۶۸-	غزالی: ابو حامد محمد بن محمد بن محمد الغزالی	احیاء علوم الدین	تصوف	دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان

ق

نمبر	مصنف	کتاب	فن	مطبع
۶۹-	قاضی زادہ: المولیٰ شمس الدین احمد المعروف بقاضی زادہ	نتائج الافکار فی کشف الرموز والاسرار (تکملہ فتح القدیر)	فقہ	المطبعۃ الکبریٰ الامیریۃ، مصر
۷۰-	قرطبی: ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن ابی بکر الانصاری الاندلسی القرطبی	الجامع لاحکام القرآن	تفسیر	دار الکتب العلمیۃ بیروت، لبنان ۱۹۸۸ء

نمبر	مصنف	کتاب	موضوع	ناشر / کیفیت
۷۱-	قمی نیسا پوری: نظام الدین الحسن بن محمد بن حسین القمی النیسا پوری	غرائب القرآن و رغائب الفرقان	تفسیر	نمبر۹ کے حاشیہ پر چھپی ہے

ک

نمبر	مصنف	کتاب	موضوع	ناشر / کیفیت
۷۲-	کاشانی: علاء الدین ابو بکر بن مسعود الکاشانی	بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع	فقہ	دار الفکر للطباعۃ والنشر والتوزیع، بیروت لبنان، ۱۹۹۶ء

م

نمبر	مصنف	کتاب	موضوع	ناشر / کیفیت
۷۳-	ماوردی: ابو الحسن علی بن محمد بن حبیب البصری البغدادی الماوردی	الاحکام السلطانیۃ والولایات الدینیۃ	سیاست	المکتبۃ المحمودیۃ مصر
۷۴-	محمد اشرف عظیم آبادی	عون المعبود علی سنن ابی داؤد	شرح حدیث	مطبع انصاری، دہلی
۷۵-	محلی: جلال الدین المحلی	تفسیر الجلالین	تفسیر	نمبر۶۰ کے حاشیہ پر چھپی ہے
۷۶-	"	شرح جمع الجوامع	اصول فقہ	حاشیہ بنانی اور علامہ شربینی کی تقریر کے ساتھ المطبعۃ الازہریۃ، مصر سے چھپی ہے، ۱۳۳۱ھ
۷۷-	مراغی: احمد مصطفیٰ المراغی	تفسیر المراغی	تفسیر	قاہرہ، ۱۹۴۶ھ
۷۸-	مرغینانی: برہان الدین علی بن ابی بکر المرغینانی	الہدایۃ (شرح بدایۃ المبتدی)	فقہ	نمبر۲۷ کے ساتھ چھپی ہے
۷۹-	مسلم: ابو الحسین مسلم بن الحجاج	صحیح مسلم	حدیث	
۸۰-	ملا جیون: الشیخ احمد المدعو بملا جیون	التفسیرات الاحمدیۃ فی بیان الآیات التشریعیۃ	احکام القرآن	جید برقی پریس، دہلی، ۱۳۴۹ھ
۸۱-	ملا علی: علی بن سلطان محمد القاری الحنفی	المبین المعین لفہم الاربعین	شرح حدیث	المطبعۃ الجمالیۃ، مصر، ۱۳۲۸ھ

۸۲- ملاعلی: علی بن سلطان محمد القاری الحنفی — مرقاۃ المصابیح شرح مشکوۃ المصابیح — شرح حدیث — دار الفکر بیروت، ۱۴۱۴ھ

۸۳- مناوی: عبد الرؤف المناوی — التیسیر بشرح الجامع الصغیر — شرح حدیث — دار الطباعۃ العامرۃ مصر، ۱۲۸۶

۸۴- منذری: عبد العظیم بن عبد القوی المنذری — الترغیب والترہیب من الحدیث الشریف — حدیث — دار الکتب العلمیۃ بیروت لبنان، ۱۹۹۶ء

ن

۸۵- نسائی: ابوعبد الرحمٰن احمد بن شعیب بن علی النسائی — المجتبیٰ المعروف بسنن النسائی — حدیث

۸۶- نسفی: حافظ الدین ابوالبرکات النسفی — مدارک التنزیل وحقائق التاویل — تفسیر

۸۷- " — کنز الدقائق — فقہ — نمبر ۲۶ کے حاشیہ پر چھپی ہے

۸۸- نووی: محی الدین ابوزکریا یحییٰ النووی — شرح صحیح مسلم — شرح حدیث — دار الکتب العلمیۃ بیروت لبنان، ۱۹۹۵ء